علامہ اقبال کا
خطبہ الٰہ آباد ۱۹۳۰ء

(مقدمہ، حواشی، تعلیقات، دستاویزات)

ڈاکٹر ندیم شفیق ملک

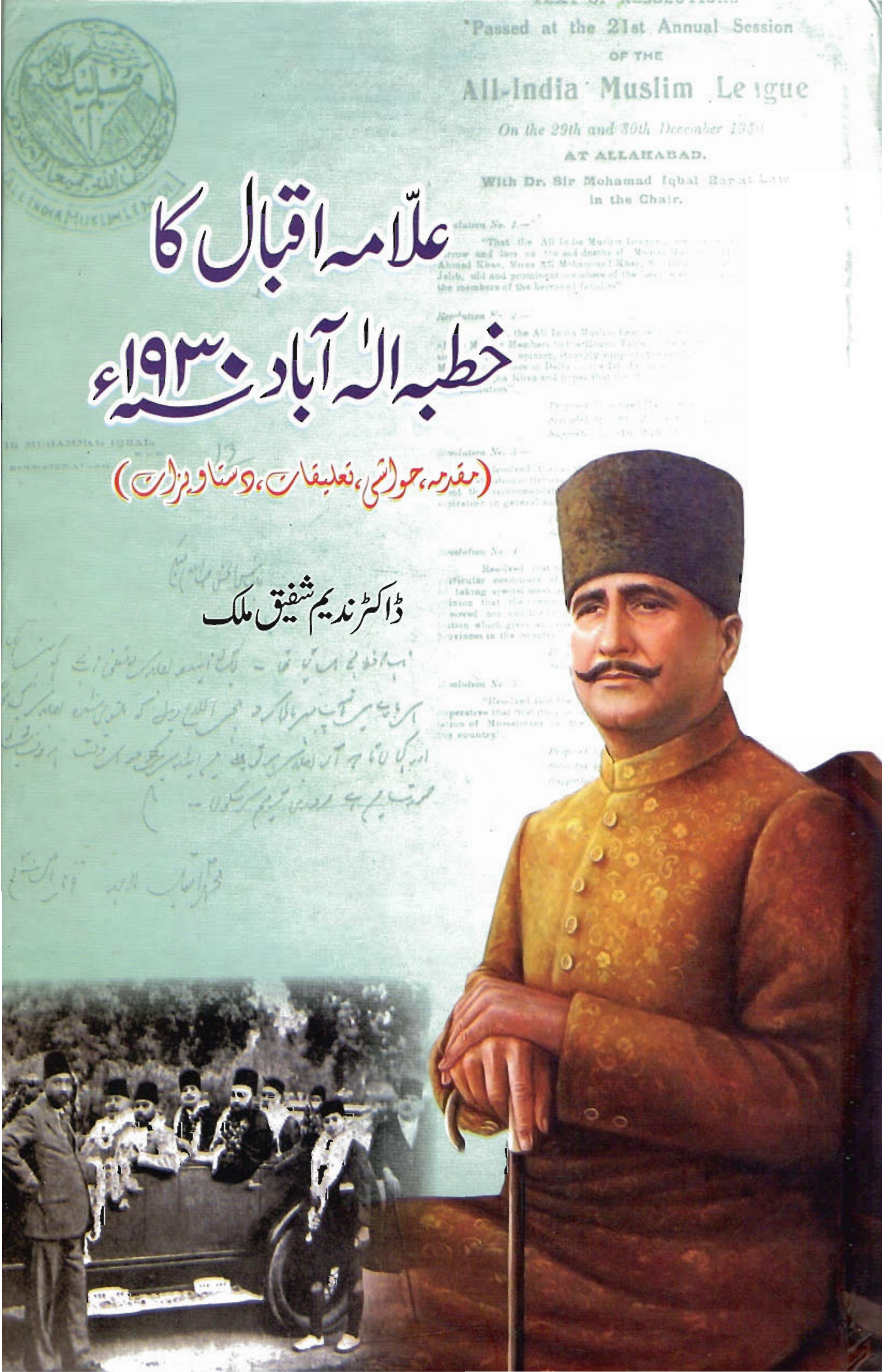

علامہ اقبال

کا

خطبہ الٰہ آباد ۱۹۳۰ء

(مقدمہ، حواشی، تعلیقات، دستاویزات)

ڈاکٹر ندیم شفیق ملک

اقبال اکادمی پاکستان

جملہ حقوق محفوظ

ناشر
محمد سہیل عمر
ڈائریکٹر، اقبال اکادمی پاکستان
(حکومت پاکستان)
چھٹی منزل، ایوانِ اقبال، لاہور
Tel: [+92-42] 36314-510, 9920-3573
Fax: [+92-42] 3631-4496
Email: info@iap.gov.pk
Website: www.allamaiqbal.com

ISBN: 978-969-416-484-7

طبع اوّل	:	۲۰۱۳ء
تعداد	:	ایک ہزار
قیمت	:	۴۰۰ روپے
ٹائٹل ڈیزائن	:	اعجاز سلیم
مطبع	:	بی پی ایچ پرنٹرز، لاہور

محل فروخت: ۱۱۶ میکلوڈ روڈ، لاہور فون نمبر: ۳۷۳۵۷۲۱۴

انتساب

اپنے محترم والدین کریمین کے نام

فہرست

پیش لفظ	۱
مقدمہ	۴
متن خطبہ الٰہ آباد (اردو ترجمہ)	۹۳
دستاویزات	
(الف) الٰہ آباد اجلاس سے متعلق علامہ اقبال کی خط و کتابت	۱۵۱
(ب) خطبہ الٰہ آباد کا انگریزی متن معہ عکس اولین طباعت	۱۷۶
(ج) آل انڈیا مسلم لیگ کے اکیسویں اجلاس میں منظور ہونے والی قراردادیں بمعہ عکس و اردو ترجمہ	۲۲۹
کتابیات	۲۳۹
اشاریہ	۲۶۱

پیش لفظ

تمام تعریفیں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے لیے ہیں جو علیم وخبیر اور تمام علوم کا سرچشمہ ہے اور اَن گنت درود وسلام ہوں اس کے آخری پیغمبر حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر، جو قاسم العلوم ہیں اور جن کی بدولت تمام تر موجودہ علمی ترقی کی بِنا پڑی۔

زیرِنظر تصنیف میرے مقالے "خطبہ الٰہ آباد ۱۹۳۰: مقدمہ، حواشی وتعلیقات" کی نظرِ ثانی شکل ہے جس پر مجھے علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی نے ۱۹۹۷ء میں ایم فل اقبالیات کی ڈگری عطا کی۔ علامہ اقبال کی نثری تخلیقات میں خطبہ الٰہ آباد نے سب سے زیادہ شہرت حاصل کی جو انھوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کے اکیسویں سالانہ اجلاس منعقدہ الٰہ آباد ۲۹-۳۰ر دسمبر، ۱۹۳۰ء میں بطور صدر جلسہ دیا۔ اس خطبے میں اہم عصری سیاسی مسائل پر سیر حاصل تبصرہ کے علاوہ برصغیر پاک وہند کے مسلمانوں کے لیے علیحدہ وطن کے قیام کی پیشن گوئی کی گئی تھی۔ اس کتاب میں آرکایوز آف فریڈم موومینٹ میں موجود آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ ۱۹۳۰ء سے متعلق دستاویزات سے استفادہ کیا گیا ہے اور خطبہ الٰہ آباد کے پس منظر میں بروئے کار عوامل کو پہلی مرتبہ منظرِ عام پر لایا گیا ہے۔

کتاب کا آغاز ایک جامع مقدمے سے ہوتا ہے جس میں خطبہ الٰہ آباد کا سیاسی پس منظر، آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ الٰہ آباد کی پس پردہ کہانی، الٰہ آباد میں علامہ اقبال کے استقبال، قیام اور سالانہ اجلاس کے اہم واقعات تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ خطبہ الٰہ آباد کا ترجمہ، اس پر مفصل حواشی وتعلیقات، خطبہ کا اصل انگریزی متن معہ عکسِ اولین اشاعت، اور اردو انگریزی کتابیات بھی شامل ہیں۔ اس کے علاہ خطبہ الٰہ آباد کے حوالے سے علامہ اقبال کی خط وکتابت مع عکسی نقول واُردو ترجمہ اور الٰہ آباد اجلاس کے اختتام پر منظور کی جانے

والی قراردادوں کے متن معہ عکسی نقول وترجمہ شامل ہیں۔ یہ تمام مواد پہلی دفعہ منظر عام پر آیا ہے اور اس کو سینکڑوں کتب، جرائد، اخبارات اور قومی ادارہ برائے تحفظ دستاویزات، اسلام آباد میں محفوظ آل انڈیا مسلم لیگ کے ریکارڈ کے حوالوں سے مستند بنایا گیا ہے۔

اس کتاب کی تکمیل پر میرا دل جہاں اللہ رب العٰلمین کے حضور سجدہ ریز ہے، وہاں مجھ پر کئی محسنین کا شکریہ بھی واجب ہے جنھوں نے اس ضمن میں میری دامے، درمے، سخنے مدد کی۔ سب سے بڑھ کر میں شعبہ اقبالیات، علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، اسلام آباد کے اپنے محترم اساتذہ ڈاکٹر محمد ریاض مرحوم اور ڈاکٹر رحیم بخش شاہین مرحوم کا ممنون ہوں جنھوں نے ہمیشہ میری سرپرستی کی اور مجھے اپنی تمام تر شفقتوں سے نوازا۔ خوش قسمتی سے مجھے نگران مقالہ ڈاکٹر محمد صدیق خان شبلی جیسی علم پرور شخصیت ملی جنھوں نے ہر قدم پر میری رہنمائی کی اور جب بھی میں ان کے دولت کدہ پر حاضر ہوا تو وہ ہمیشہ خندہ پیشانی سے پیش آئے۔ درحقیقت اگر اس مقالے میں کوئی قابل داد پہلو ہے تو اس کا تمام تر سہرا انھی فضلاء کے سر بندھتا ہے۔

دورانِ تحقیق مقالے کے مختلف اجزاء کئی ماہرین اقبالیات نے بکمال مہربانی ملاحظہ فرمائے اور اپنی گرانقدر آراء سے مجھے نوازا۔ اس ضمن میں، میں خصوصیت سے ڈاکٹر وحید قریشی مرحوم، ڈاکٹر صابر کلوروی مرحوم، ڈاکٹر وحید عشرت مرحوم، ڈاکٹر خالد مسعود، ڈاکٹر رضوان احمد مرحوم اور ڈاکٹر گوہر نوشاہی کا شکر گزار ہوں۔ میرے محترم شرکاء کورس برائے ایم فل اقبالیات جناب حمید محسن اور جناب بختیار احمد نے ضروری مواد ارسال کیا جس کے لیے میں ان کا احسان مند ہوں۔ میرے عزیز دوست ڈاکٹر مجیب احمد نے مسودہ ملاحظہ کیا اور مجھے اپنے قیمتی مشوروں سے نوازا، جس کے لیے میں ان کا ممنون ہوں۔

یہ کتاب پہلے علامہ اقبال کا خطبہ الٰہ آباد ۱۹۳۰ء ایک مطالعہ کے عنوان سے فیروز سنز لاہور نے ۱۹۹۷ء میں شائع کی۔ اب اسے مزید تصحیحات اور دستاویزات کے اضافے کے بعد جناب محمد سہیل عمر کی علم پروری کے باعث اقبال اکادمی پاکستان سے شائع کیا جا رہا ہے جس کے لیے میں ان کا مشکور ہوں۔ مَیں جناب محمد نعمان چشتی کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے خطبہ الٰہ آباد کا عکس اولین اشاعت فراہم کیا۔ میں اپنے عزیز دوست جناب زبیر ناصر کا بھی

انتہائی ممنون ہوں جنھوں نے اس مقالے کی نہایت احسن انداز میں ٹائپ کاری کی۔ بعدازاں جناب میر محمد مبین نے حتمی تصحیحات میں میرا ہاتھ بٹا کر مجھے مشکور کیا۔

آخر میں، مَیں اپنے والدین کریمین جناب حاجی ملک محمد رفیق صاحب اور جنابہ صفیہ رفیق مرحومہ و مغفورہ کا احسانات کا بھی اعتراف کرتا ہوں جنھوں نے مجھے تحصیل علم کی راہ پر لگایا اور ہمیشہ میری علمی کاوشوں کو سراہا۔ آج تک جو کچھ بھی میں حاصل کر سکا ہوں وہ انھی نفوسِ قدسیہ کی دعاؤں کی بدولت ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو بہترین جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین۔

مزید براں میں اپنی اہلیہ نادیہ ندیم، بیٹے محمد انسِ مصطفیٰ اور دیگر اہل خانہ کا تہہ دل سے احسان مند ہوں جنھوں نے دورانِ تحقیق مجھے ہر ممکن سہولت بہم پہنچائی اور ان کے خوش دلانہ تعاون کے بغیر اس تصنیف کی تکمیل ممکن نہ ہوتی۔

ڈاکٹر ندیم شفیق ملک
۱۳/ دسہرہ گراؤنڈ
راولپنڈی
nsmqq@hotmail.com

مقدمہ

I

برصغیر پاک و ہند میں اسلام کا ورود مسعود ان عرب تجار کے ذریعے ہوا جو صدیوں سے جنوبی ہند میں مصروف تجارت تھے۔[1] ۷۱۲ء میں محمد بن قاسم (۶۹۵ء-۷۱۵ء) کی فتح سندھ سے ملتان تک کا علاقہ اموی خلافت کے زیر نگیں ہو گیا۔ جلد ہی عربوں کی راست بازی اور حسن عمل نے اہل خطہ کو ان کا گرویدہ کر لیا، چنانچہ سندھ کے باسیوں نے جوق در جوق اسلام قبول کر کے سندھ کو باب الاسلام میں بدل دیا۔[2]

۱- عربوں کے اہل ہند سے قدیم روابط اور ایک دوسرے کی معاشرت و ثقافت پر اثرات کے لئے دیکھئے، سید سلیمان ندوی، عرب و ہند کے تعلقات، اِلٰہ آباد، ۱۹۲۳ء۔

۲- سندھ میں اسلامی حکومت کے قیام کے بعد مسعودی، ابن حوقل اور بشاری مقدسی جیسے اہل علم نے سندھ کی سیاحت کی اور ان سب نے سندھی نومسلموں کی دین سے گہری وابستگی اور علوم اسلامیہ سے شیفتگی کا خصوصی ذکر کیا ہے۔ دیکھئے، سید ابو ظفر ندوی، تاریخ سندھ، اعظم گڑھ، ۱۹۴۷ء، ص ۲۰۷ اور ۲۲۰-۲۲۲۔

مسلمانوں کی آمد سے پہلے سندھ کے حالات کے لئے دیکھئے:

H.T. Lambrick, *Sind Before the Muslim Conquest*, Hyderabad, 1973.

ورودِ اسلام سے ماقبل ہندوستان کے عمومی سماجی و ثقافتی جائزہ کے لئے دیکھئے:

A.L. Basham, *The Wonder That Was India: A Survey of the Culture of the Indian Sub-Continent Before the Coming of Muslims*, London, 1956.

قدیم ہندوستان کے مذاہب اور ہندومت کے اختصاصی مطالعے کے لئے دیکھئے:

Louis Renon, *Religions of Ancient India*, London, 1953; A.C. Boquet, *Hinduism*, London, 1941; K.M. Sen, *Hinduism*, London, 1959, and R.C. Zeehner, *Hinduism*, Oxford, 1962.

بدقسمتی سے اُموی خلافت میں عدم استحکام کی بدولت دمشق و بغداد کے حکمران برصغیر میں اپنی فتوحات کا سلسلہ جاری نہ رکھ سکے اور مرکزی خطوں میں اسلام کا حیات آفریں پیغام تین صدیوں بعد ترکوں اور افغانوں کی سیاسی کامیابیوں کے دوش بدوش پھیلا جس میں سب سے نمایاں کردار صوفیا کرام اور مشائخ عظام نے ادا کیا۔

سلطان محمود غزنوی (۹۷۱ء-۱۰۳۰ء) کے پے در پے حملوں نے ہمیشہ کے لئے ہندو اقتدار کی بنیادیں ہلا دیں۔ ایک طرف اُس کی فوجوں نے قنوج، کالنجر اور گجرات تک اپنی کامیابیوں کے جھنڈے گاڑے تو دوسری طرف ۱۰۲۲ء میں پنجاب باقاعدہ طور پر سلطنت غزنی کا حصہ بن گیا جس سے مسلمان صوفیا اور مبلغین کو نہایت سازگار ماحول میسر آ گیا۔[۳] ان کی مخلصانہ کاوشوں کو مزید جلا اس وقت ملی جب ۱۲۰۶ء میں قطب الدین ایبک (ف-۱۲۱۰ء) شمالی ہندوستان کو فتح کر کے دہلی میں خودمختار سلطان کی حیثیت سے تخت نشین ہوا اور ہندوستان میں اسلام کے بھرپور سیاسی وسماجی غلبے کا آغاز ہو گیا۔ جلد ہی سلطان شمس الدین التمش (ف-۱۲۳۶ء) اور سلطان غیاث الدین بلبن (ف-۱۲۸۶ء) جیسے مدبر حکمرانوں نے اپنے حسن انتظام سے رعایا کے دل موہ لئے۔ یہ تابندہ روایت ترکوں کے بعد خلجی، تغلق، سید، لودھی اور سوری حکمرانوں کے دور میں بھی جاری و ساری رہی اور مسلمانوں کی انتظامی اور عسکری صلاحیتوں کا شہرہ چہار دانگ عالم میں پھیل گیا۔[۴]

۳- سلطان محمود غزنوی کی حیات و خدمات اور ہندوستان پر اس کے حملوں کے اثرات کے مطالعے کے لئے دیکھئے:
Muhammad Nazim, *Life and Times of Sultan Mahmood of Ghazna*, Cambridge, 1930.

۴- سلطنت دہلی کے قیام و استحکام اور اس کے انتظامی، سیاسی، مذہبی اور تاریخی شعبوں کے مفصل جائزے کے لئے دیکھئے، خلیق احمد نظامی، سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، دہلی، ۱۹۵۸ء۔ اور۔:
Syed Moinul Haq, *A Short History of the Sultanate of Delhi*, Karachi, 1956; V.D. Mahajan, *The Sultanate of Delhi*, Delhi, 1963; M. Kabir, *A Short History of Pakistan: Muslim Rule Under the Sultans*, Karachi, 1967; I.H. Qureshi, *The Administration of the Sultanate of Delhi*, Karachi, 1958; Muhammad Aziz Ahmad, *Political and Historical Institutions of the Early Turkish Empire of Delhi*, Lahore, 1949; and S.M. Jaffar, *Some Cultural Aspects of Muslim Rule in India*, Delhi, 1963;

فتح و کامرانی کا یہ سفر مغلوں کے دورِ حکومت میں نئی بلندیوں کو جا پہنچا اور انھوں نے بھی ہندوستان میں ہر شعبہ حیات مثلاً تعمیرات، فنونِ لطیفہ، ادب، مذہبی عقائد، ثقافت و تمدن وغیرہ پر اپنے انمٹ نقوش چھوڑے۔ اس کے علاوہ انھوں نے ہندوستان میں ایک نئے انتظامی ڈھانچے کی بنیاد رکھی جو کسی نہ کسی صورت میں آج تک مروج ہے۔[5] درحقیقت مغلیہ دورِ حکومت ہندوستان میں مسلمانوں کے حقیقی عروج کا زمانہ تھا۔[6]

۱۷۰۷ء میں اورنگزیب عالم گیر (۱۶۱۸ء۔۱۷۰۷ء) کی وفات کے بعد تختِ دہلی پر کوئی ایسا ذی وقار شخص متمکن نہ ہو سکا جو اپنے آباء کے اوصاف کا حامل ہوتا۔ چنانچہ ایک طرف جانشینی کے دعوے داروں میں میدان کارزار گرم ہوا تو دوسری طرف غیر مسلم قوتوں نے بھی سر اُٹھانا شروع کر دیا۔ دکن میں مرہٹوں نے زور پکڑا اور شمالی ہندوستان کو نشانہ ستم بنانے لگے۔[7]

۵- مغلیہ دور کے انتظامی ڈھانچے کے خصوصی مطالعہ کے لئے دیکھئے:

Jadunath Sarkar, *Mughal Administration*, Calcutta, 1935; I.H. Qureshi, *The Administration of the Mughul Empire*, Karachi, 1967; S.A.Q. Hussaini, *Administration under the Mughuls*, New York, 1965; and R.P. Tripathi, *Some Aspects of Muslim Administration*, Allahabad, 1959.

۶- ہندوستان میں مغلیہ سیادت کے قیام کے لئے دیکھئے:

V.D. Mahajan, *The Mughul Rule in India*, Delhi, 1963.

عہدِ مغلیہ کی ثقافتی و سماجی تاریخ کے لئے دیکھئے:

Tara Chand, *Society and State in the Mughul Period*, Lahore, 1979, and Muhammad Yasin, *A Social History of Muslim India, 1605-1748*, Allahabad, 1958.

مغل حکمرانوں کے مذہبی رجحانات کے لئے دیکھئے:

Ram Sharma, *The Religious Policy of Mughul Emperors*, Bombay, 1938.

۷- مرہٹہ قوم کے عروج و سیاسی پس منظر کے لئے دیکھئے:

M.G. Ranade, *The Rise of the Marhata Power*, Bombay, *1900;* G.S.Singh, *Marhata Geopolitics and the Indian Nation*, Bombay, 1966; G.S. Sardesai, *A New History of the Marhatas*, 3 Vols, Bombay, 1958, R.C. Majumdar, ed., *The Marhata Supremacy*, Bombay, 1977; and Yusuf Hussain, *The First Nizam: The Life and Times of Nizam-ul-Mulk Asaf Jah I*, Bombay, 1963.

جبکہ پنجاب میں سکھوں نے قیامت صغریٰ برپا کردی۔[۸] رہی سہی کسر دہلی پر نادر شاہ درانی (۱۶۸۸ء۔۱۷۴۷ء) اور احمد شاہ ابدالی (۱۷۲۲ء۔۱۷۷۲ء) کے حملوں نے پوری کردی اور مغل سلطنت کی کمزوری روز روشن کی طرح عیاں ہوگئی۔[۹] اس دور ابتلاء میں انگریز جو ہندوستان میں تاجر بن کر وارد ہوئے تھے، آہستہ آہستہ مقامی حکمرانوں کے باہمی تنازعات میں دخل اندازی کے ذریعے اثر ورسوخ اور سیاسی اقتدار حاصل کرنے لگے۔ جنگ پلاسی (۱۷۵۷ء) کے بعد وہ بنگال کی سیاست میں اس حد تک دخیل ہوگئے کہ ۱۷۷۳ء میں انھوں نے نواب بنگال کو معزول کر کے باقاعدہ حکومت کرنی شروع کردی۔[۱۰] ۱۷۹۹ء میں انھوں نے میسور پر قبضہ کیا اور ۱۸۱۷ء میں ان کی

۸- سکھ مت کی ابتداء، سکھوں کا بطور فوجی قوت کے عروج، مغلوں سے ٹکراؤ اور مسلمانوں سے تعلقات کے لئے دیکھئے، کنھیا لال ہندی، تاریخ پنجاب، لاہور، ۱۹۵۸؛ ابوالامان امرتسری، سکھ مسلم تاریخ (حقیقت کے آئینہ میں)، لاہور، ۱۹۴۸، اور عباداللہ گیانی، سکھ عہد اسلامی میں، لاہور، ۱۹۲۴ء۔ نیز دیکھئے:

Hari Ram Gupta, *History of the Sikhs,* New Delhi, 1978, 8 Vols; Gurdev Singh Deol, *Banda Bahadur,* Jullandar, 1972; Ganda Singh, *A Life of Banda Singh Bahadur,* Amritsar, 1935; A.E. Barstow, *Sikhs,* Delhi, 1940; J.D. Cunningham, *A History of the Sikhs,* London, 1918; and Muhammad Akbar, *The Punjab Under the Mughuls,* Lahore, 1948.

۹- مغلیہ سلطنت کی داستان زوال کے لئے دیکھئے:

Sh. Abdur Rashid, *History of the Muslims of the Indo-Pakistan Sub-Continent, 1707-1806*, Lahore, 1978; Percival Spear, *Twilight of the Mughals: Studies in the late Mughul Delhi,* Karachi, 1973; R.P. Tripathi, *Rise and Fall of the Mughul Empire,* Allahabad, 1960; Satish Chardra, *Parties and Politics at the Mughul Court: 1707-1740,* Aligarh, 1959, pp. 22-60; and A.L. Srivastava, *The Mughul Empire (1526-1803),* Delhi, 1959, pp. 439-42.

۱۰- تفصیلات کے لئے ملاحظہ کیجئے:

Brigen K. Gupta, *Sirajuddaullah and East India Company, 1756-57: Background to the Foundation of British Power in India*, Leyden, 1966; Michael Edwards, *The Battle of Plassy and the Conquest of Bengal*, New York, 1963;------, *The Founding of An Empire,* London, 1969; K.M. Mohsin, "East India Company's Relations With the Nawabs of Bengal", *The Dacca University Studies*, Vol.15 (June, 1967), pp. 143-64; Tapanmohan Chatterji, *The Road to Plassey,* Bombay, 1960, pp. 126-45; Ram Gopal,

سازشوں کی بدولت مرہٹوں کی آزاد حکومتیں اپنا وجود کھو بیٹھیں۔ ۱۸۴۳ء میں سندھ ان کے زیر نگیں ہوا اور ۱۸۴۹ء میں انھوں نے سکھوں کو شکست دے کر پنجاب کا الحاق کر لیا۔ اس طرح ہندوستان کے مقامی حکمران رفتہ رفتہ اپنی نا اہلی اور باہمی اتحاد کے فقدان کی بنا پر انگریزوں کے ہاتھوں شکست پر شکست کھاتے چلے گئے۔[11]

انگریزوں کے غلبہ ہندوستان سے سب سے زیادہ نقصان مسلمانوں کو اُٹھانا پڑا کیونکہ مغل دور حکومت میں حکمرانی کے ساتھ ساتھ فوج، ملکی انتظامیہ اور علمی شعبوں کی اعلیٰ ملازمتوں کا غالب

How the British Occuped Bengal, Bombay, 1963; D.C. Verma, *Plassey to Buxur:* A Military Study, New Delhi, 1976; K.K. Datta, "Siraj-ud-Daula and the English Before 1756", *Indian Historical Quarterly,* Vol. XXII, No. 1, March 1946, pp.155-6; and Irish Macfarlane, *The Black Hole or the Making of a Legend,* London, 1975.

انگریزوں کے قبضہ بنگال کے مسلمانان بنگال پر اثرات کے لئے دیکھئے:

M. Mohsin Ali, "Impact of East India Company's Rule upon the Muslims of Bengal", *The Dacca University Studies,* Part A, 15 (June, 1967), pp. 33-58.

۱۱- تفصیلات کے لئے دیکھئے:

Ramsay Muir, ed., *The Making of British India, 1756-1858,* Lahore, 1969; Alfred Layel, *The Rise and Expansion of the British Dominion in India,* London, 1913; Penderal Moon, *The British Conquest and the Dominion of India,* London, 1989; Pratual Chandra Gupta, *Baji Rao II and the East India Company, 1796-1818,* New Delhi, 1964;------, *The Last Peshawa and the English Commissioners, 1818-1851,* Calcutta, 1944; C.H. Philips, *The East India Company, 1784-1834,* Bombay, 1961; Holden Furber, *John Company at Work,* New York, 1948; Lucy S. Sutherland, *The East India Company in 18th Century Politics,* London, 1952; and Ramkrishna Mukherjee, *The Rise and Fall of the East India Company,* Berlin, 1955.

پیہم شکست اور نا اتفاقی کے اس دور میں ایک واحد روشن مثال ٹیپو سلطان کی سامنے آتی ہے، جس نے شہادت حاصل کرنا تو پسند کیا مگر آخری سانس تک انگریزوں کے ساتھ سربکف رہا۔ تفصیلات کے لئے دیکھئے:

Denys Forrest, *Tiger of Mysore, Bombay,* 1970; Mohibul Hasan, *History of Tipu Sultan,* Calcutta, 1971; B. Sheikh Ali, *Tipu Sultan,* New Delhi, 1972; Praxy Ferrandas, *Storm Over Seringapatam,* Bombay, 1969; and Fazal Ahmad, *Sultan Tipu,* Lahore, 1958.

ترین حصہ مسلمان ہوا کرتے تھے۔[۱۲] مگر برطانوی اقتدار کے عروج کے ساتھ ہی مسلمانوں نے اپنے آپ کو، جو چھ صدیوں سے ریاستی اُمور میں فیصلہ کن حیثیت رکھتے تھے، یکا یک پہلے درجہ سے تیسرے درجہ میں موجود پایا۔[۱۳] مثلاً صوبہ بنگال کے پہلے انگریز گورنر لارڈ رابرٹ کلایو (۱۷۲۵ء۔۱۷۷۴ء) نے ایک سرکاری اعلان کے ذریعے یہ لازم قرار دیا کہ کسی مسلمان کو چپڑاسی یا جونیئر کلرک سے بڑا عہدہ نہ دیا جائے۔[۱۴] مسلمانوں کو سب سے بڑا دھچکا اس وقت پہنچا جب لارڈ ولیم بینٹنک (۱۸۳۹ء۔۱۷۷۴ء) کے دورِ حکومت میں فارسی کی بجائے انگریزی کو سرکاری زبان قرار دے دیا گیا اور نتیجتاً کسی بھی مسلمان کے لئے کسی ذمہ دار عہدے پر فائز ہونا تقریباً ناممکن ہو گیا۔[۱۵]

۱۲- بحوالہ:

Richard Symonds, *The Making of Pakistan*, London, 1949, P 25-26

۱۳- بحوالہ:

Ian Stephans, *The Pakistanis,* Glasgow, 1968, p.62.

۱۴- بحوالہ:

M.A.H. Isphani, *Quaid-i-Azam Jinnah:* As I Knew Him, Karachi, 1976, p.11.

صوبہ بنگال کے پہلے انگریز گورنر لارڈ کلایو نے انگریزی استعمار کی بنیادیں استوار کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ مزید تفصیلات کے لئے دیکھئے:

T.G.P. Spear, *Master of Bengal: Clive and His India,* London, 1975; H.H. *Dodwell, Dupleix and Clive,* London, 1938; A. Mervyn Daries, *Clive of Plassey: A Biography,* London, 1939; Norman Partington, *Master of Bengal,* London, 1974; Mark Bence-Jones, *Clive of India,* London, 1974; and Nirad Chaudhuri, *Clive of India,* London, 1975.

۱۵- بحوالہ:

K.B. Sayeed, *Pakistan: The Formative Phase,* Karachi, 1960, p.11.

لارڈ ولیم بینٹنک کی حیات و خیالات کے لئے دیکھئے:

John Rosselli, *Lord William Bentinck: The Making of a Liberal Imperialist, 1774-1839,* Delhi, 1974; and C.H. Philips, ed., *The Correspondence of Lord William Cavendish Bentinck,* Governor *General of India, 1828-35,* Oxford, 1977, 2 Vols.

اسی طرح فارسی بھی بطور عدالتی زبان ترک کر دی گئی اور عدالتوں میں مسلم فقہاء کی آسامیوں کو ختم کر دیا گیا۔[۱۶] ان تمام اقدامات کی بنا پر مسلمان سیاسی، تہذیبی اور تمدنی طور پر ذلت و پستی کی اتھاہ گہرائیوں میں گرتے چلے گئے۔

تاہم برصغیر کے مسلمان اس غلامی کو ذہنی طور پر قبول کرنے کے لئے کبھی بھی تیار نہ ہوئے اور ان کے درمیان سامراج دشمنی پر مبنی کئی عسکری تحاریک جنم لیتی رہیں۔[۱۷] حتیٰ کہ ۱۸۵۷ء میں برطانوی اقتدار کے خلاف ایک عظیم تحریکِ آزادی نے جنم لیا جس سے دہلی، کانپور، لکھنؤ اور اس کے اطراف میں جنگ کے شعلے بھڑک اُٹھے۔[۱۸]

۱۶- بحوالہ:

Vincent Smith, *The Oxford History of India,* Oxford, 1958, p. 588 and W.H. Lees, *Indian Musalmans*, London, 1871, pp. 15-21.

۱۷- تفصیلات کے لئے دیکھئے:

Ahmad Muin-ud-Din Khan, *Muslim Struggle for Freedom in Bengal, 1757-1947*, Dacca, 1960, ------, *History of the Faridi Movement in Bengal, 1808-1906,* Karachi, 1965, Q. Ahmad, *The Wahhabi Movement in India,* Patna, 1966, and Abdul Gafoor Siddiqi, *Tito Meer Saheed,* Karachi, n.d.

عبداللہ ملک، بنگالی مسلمانوں کی صد سالہ جدوجہد آزادی، ۱۷۵۷ء تا ۱۸۵۷ء، لاہور، ۱۹۶۷ء؛ غلام رسول مہر، جماعت مجاہدین، لاہور، ۱۹۵۵ اور -----، سرگزشت مجاہدین، لاہور، ۱۹۵۶ء۔

Michael Adas, "Twentieth Century Approaches to the Indian Mutiny of 1857-58", *Journal of Asian History,* Vol. 3, No. 1, 1971, pp. 1-19.

۱۸- تفصیلات کے لئے دیکھئے:

Michael Edwardes, *Battles of the Indian Mutiny,* London, 1963, -----, *Red Year-The Indian Rebellion of 1857*, London, 1973; Surendranath Sen, *Eighteen Fifty Seven,* New Delhi, 1957, Evelyn Wood, *The Revolt in Hindustan in 1857-59,* London, 1908; J.A.B. Palmer, *The Mutiny Outbreak at Meerut in 1857,* Cambridge, 1966; Pakistan Publications, *Struggle for Freedom, 1857,* Karachi, 1957; Richard Collier, *The Great Indian Mutiny,* New York, 1964; R.C. Majumdar, *The Sepoy Mutiny and the Revolt of 1857,* Calcutta, 1957;

وسائل کی کمی، نظم وضبط اور باہمی رابطہ کے فقدان اور ناتجربہ کار قیادت کی بدولت یہ جنگ آزادی ناکام تو ہوگئی مگر انگریزوں کو یہ احساس دلاگئی کہ مسلمان کبھی بھی دلی طور پر ان کے ہم نوا نھیں ہو سکتے۔ چنانچہ اس تاثر اور جہاد آزادی میں ان کے مرکزی کردار کی پاداش میں انگریزوں نے مسلمانوں کے خلاف انتقامی کارروائیاں شروع کر دیں[١٩] اور رفتہ رفتہ ان کے سیاسی، سماجی، معاشرتی، اور مذہبی اداروں کو تباہ کر کے رکھ دیا گیا۔[٢٠] مایوس اور شکستہ دل مسلمانوں نے اپنے خول میں بند ہونے میں ہی عافیت جانی اور سیاسی وسماجی میدان کو ہندوؤں کے لئے کھلا چھوڑ دیا جنھوں نے تعلیمی مقتدر حلقوں میں داخل ہونے کے ہر موقع سے فائدہ اُٹھایا۔[٢١]

S.B. Chaudhuri, *Theories of the Indian Mutiny (1857-59): A Study of the Views of Eminent Historians on the Subject,* Calcutta, 1965, Christopher Hibbert, *The Great Mutiny in India,1857,* London, 1980; H. Chaltopadhyaya, *The Sepoy Mutiny, 1857: A Social Study and Analysis,* Calcutta, 1957; P.C. Joshi, ed., *Rebellion 1857: A Symposium,* New Delhi, 1957; A.T. Embree, *1857 in India, Boston, 1963;* V.D. Savarkar, *The Indian War of Independence (National Rising of 1857),* Bombay, 1960; G.D. Khosla, *The Last Moghul,* Delhi, 1969; Michael Adas, "Twentieth Century Approaches to the Indians Mutiny of 1857-58", *Journal of Asian History,* Vol. 5, No. 1, 1971, pp. 1-19 and Valeire Fitzgerald, *Zemindar,* London, 1981.

نیز دیکھئے، غلام رسول مہر، ١٨٥٧ - پاک و ہند کی پہلی جنگ آزادی، لاہور، ١٩٥٧ء۔

١٩- جنگ آزادی میں مسلمانوں کے مرکزی کردار کی جھلک کے لئے دیکھئے:

غلام رسول مہر، ١٨٥٧ء کے مجاہد، لاہور، ١٩٦٩ء اور

Syed Lutfullah, Azimullah Khan Yusufzai: *The Man Behind the War of Independence, 1857*, Karachi, 1970.

٢٠- مسلمانوں پر انگریزوں کے ظلم وستم کی تفصیلات کے لئے دیکھئے:

Nazir Ahmad Chaudhry, *The Great Rising of 1857 and the Suppression of Muslims*, Lahore, 1970.

٢١- بحوالہ :

Lawrence Ziring, *Pakistan: The Enigma of Political Development*, Kent, 1980, pp. 21-22.

مسلم تاریخ کے اس تاریک دور میں سر سید احمد خان (۱۸۱۷ء۔۱۸۹۸ء) کی ذات مینارہ نور بن کر سامنے آئی اور ان کی ولولہ انگیز قیادت اور متحرک شخصیت نے ہندی مسلمانوں کو دوبارہ اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے میں مرکزی کردار ادا کیا۔ انھوں نے اپنے مضامین، تقاریر، جلسوں، رسالوں، ترجموں اور مختلف تعلیمی، سماجی اور رفاہی اداروں کے قیام سے مسلمانوں کو اس بات پر قائل کر لیا کہ وہ اپنا قدامت پسند طرز فکر بدلیں اور نئے حالات و واقعات سے ذہنی مطابقت پیدا کریں۔[۲۲] سر سید کا سب سے عظیم کارنمایاں ہندی مسلمانوں کو مغربی تعلیم کے حصول کے لئے آمادہ کرنا تھا جو اس سے گریزاں تھے کہ ان کے خیال میں یہ ان کے دین کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا کرے گی اور اسلامی تعلیم سے ان کی وابستگی کو کم کر دے گی۔[۲۳] درحقیقت انگریزوں کا متعارف

۲۲- سر سید احمد خان کی حیات، نظریات اور خدمات کے لئے دیکھئے:
الطاف حسین حالی، حیات جاوید، لاہور ۱۹۵۱؛ شاہد حسین رزاقی، سر سید اور اصلاح معاشرہ، لاہور، ۱۹۶۳ء، اور نور الرحمان، حیات سر سید، علی گڑھ، ۱۹۵۰ء۔ نیز دیکھئے۔

G.F.I. Graham, *The Life and Work of Sayyid Ahmad Khan,C.S.I.*, London, 1909; J.S.M. Baljon, *The Reforms and Religious Ideas of Sir Sayyid Ahmad Khan*, Leiden, 1949; S. Moinul Haq, "Syed Ahmad Khan", in *A History of Freedom Movement*, Pt. II, Karachi, 1961, pp. 451-78; Shan Muhammad, *Sir Syed Ahmad Khan: A Political Biography*, Meerut, 1969, -----, *Writings and Speeches of Sir Syed Ahmad Khan,* Bombay; K.A. Nizami, *Sayyid Ahmad Khan*, New Delhi, 1974; and Prem Narian, 'Political Views of Syed Ahmad Khan: Evolution and Impact', *Journal of Indian History,* Vol. LIII, No. 1, April, 1975, pp. 105-53.

۲۳- بحوالہ:

Waheed-uz-Zaman, *Towards Pakistan,* Lahore, 1985, p. 1.

مگر اس سے ہرگز یہ مراد نہیں کہ ہندی مسلمان تعلیم حاصل کرنے ہی میں کوئی دلچسپی نہ رکھتے تھے بلکہ انگریزوں کی آمد سے قبل مسلمانوں کا ایک اپنا جامع تعلیمی نظام تھا جس میں مکتب کسی اجرت کے بغیر طلبہ کو لکھنا پڑھنا سکھاتے تھے اور ان کو عربی فارسی اور اُردو کلاسیک سے اس حد تک روشناس کرا دیتے کہ بہت سے طلبہ اعلیٰ تعلیمی اداروں میں جانے کی کوئی ضرورت ہی محسوس نہ کرتے۔ بحوالہ:

I.H. Qureshi, *Education in Pakistan: An Inquiry into Objectives and Achievements*, Karachi, 1975, p.8.

انگریزوں کے غلبے سے فوراً پہلے کے مسلم تعلیمی تناظر کے لئے دیکھئے:

Muhammad Hameed-ud-Din Khan, *History of Muslim Education, 1751 to 1854,* Karachi, 1973.

کردہ تعلیمی نظام مخصوص مشنری پس منظر رکھتا تھا جس کی بنیاد عیسائی مبلغین نے رکھی تھی [۲۴] اور اس کا مرکزی مقصد، جیسا کہ لارڈ تھامس میکالے (۱۸۰۰ء۔۱۸۵۹ء) نے اپنی مشہور زمانہ تعلیمی یادداشتوں میں تحریر کیا، ایک ایسا طبقہ پیدا کرنا تھا جو رنگ و خون کے لحاظ سے تو ہندوستانی ہو مگر ذوق و شوق، اخلاقیات اور سوچ کے اعتبار سے انگریزی طرزِ فکر رکھے۔[۲۵] مسلمانوں کی تعلیمی پیش رفت کے سلسلے میں سب سے بڑی کامیابی ۱۸۷۵ء میں ایم اے او کالج علی گڑھ کا قیام تھا جو مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ جدید علوم کی تعلیم بھی دیتا تھا۔ اس کالج کے قیام سے علی گڑھ

۲۴۔ عیسائی مبلغین کی ہندوستان میں آمد اور ان کی تعلیمی سرگرمیوں کے لئے دیکھئے:

E.D. Potts, *British Baptist Missionaries in India, 1793-1837: The History of Serampore and Its Missions,* Cambridge, 1967; and Stephen Neil, *Colonialism and Christian Missions,* New York, 1966.

۲۵۔ بحوالہ:

John Clive and Thomas Pinney, ed., *Thomas Barbington Macaulay:Selected Writings*, Chicago, 1979, pp. 237-51.

ہندوستان میں مغربی نظام تعلیم رائج کرنے کی فکری بنیادیں لارڈ میکالے نے فراہم کیں۔ اس لئے اس کی شخصیت کا اختصاصی مطالعہ برصغیر کے تعلیمی مسائل کی تفہیم کے لئے از حد ضروری ہے۔ دیکھئے:

G.O. Trevelyan, *The Life and Letters of Lord Macaulay*, London, 1909; John Clive, *Thomas Babington Macaulay: The Shaping of the Historian,* London, 1973; G.M. Young, ed., *Speeches of Lord Macaulay with His Minute on Indian Education*, Oxford, 1935; and Salauddin Ahmad, *Social Policy and Social Change in Bengal, 1818-1835,* London, 1965.

مغربی نظام تعلیم کے انہی مخصوص سامراجی مقاصد کی بنا پر ہندی مسلمان اس سے الگ ہی رہے۔ ۱۸۷۸ء سے پچیس سال پہلے تک برطانوی ہند کے کالج اور یونیورسٹیوں سے ۳۱۷۳ بیچلرز آف آرٹس اور ۳۲۶ ماسٹرز آف آرٹس فارغ التحصیل ہوئے جس میں بالترتیب صرف ۳۰ اور ۵ مسلمان تھے۔ بحوالہ:

P. Hardy, *The Muslims of British India*, Cambridge, 1972, p.23.

برطانوی دورِ حکومت میں تعلیمی نظام کے عمومی جائزے کے لئے دیکھئے:

S. Nurullah and J.P. Naik, *A History of Education in India During the British Period*, Bombay, 1951.

مسلمانوں کی سماجی، ثقافتی اور تعلیمی ترقی کا مرکز بن گیا۔ اس نے نہ صرف اپنے جیسے کئی اوراداروں کوجنم دیا بلکہ مسلمان قیادت کی ایک نئی نسل تیار کی جو بیسویں صدی میں خوداعتمادی، اُمید، اتحاداور مذہبی وثقافتی تفاخر سے داخل ہوئی۔ [۲۶]

مسلمان ابھی مغربی تعلیم حاصل کرنے پر بہ اکراہ راضی ہو رہے تھے کہ اسی اثناء میں ہندوؤں نے سیاسی، تعلیمی ومعاشرتی میدانوں میں زبردست ترقی کی۔ انھوں نے خوشدلی سے انگریزی سیکھی، مغربی تمدن اختیار کیا اوراپنے آپ کو ہندوستان کے نئے حکمرانوں کے لئے اسی طرح ناگزیر بنالیا جیسا کہ وہ ان سے پہلے آنے والے فاتحین کے لئے بن گئے تھے۔ [۲۷] ہندوستان کے سیاسی اُفق پر ایک نیادوراس وقت طلوع ہوا جب ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس کا قیام عمل میں لایا گیااور ہندوؤں نے جوق درجوق اس میں شمولیت اختیار کرنی شروع کردی۔ [۲۸]

۲۶- تفصیلات کے لئے دیکھئے:

S.K. Bhatnagar, *History of the MAO College*, Aligarh, 1971; M.S. Jain, *The Aligarh Movement: Its Origin and Development, 1858-1906,* Agra, 1965; H.K. Sherwani, *The Aligarh Movement: Sir Syed Memorial Lectures*, 1969, Aligarh, 1969; K.K. Aziz, *The Making of Pakistan*, London, 1967, pp. 18-22 & 124-5; Shan Muhammad, ed., *The Aligarh Movement: Basic Documents, 1869-1898*, 3 Vols., Meerut, 1978; and David Lelyved, *Aligarh's First Generation*, Princeton, 1977.

۲۷- بحوالہ:

L.F. Rushbrook Williams, *The State of Pakistan*, London, 1962, p.16.

۲۸- انڈین نیشنل کانگریس پرابتداہی سے ہندوؤں کا غلبہ ہوگیا تھااور تقسیم ہندتک یہ ہندواکثریت کے مفادات کی ترجمانی کرتی رہی۔ کانگریس کی تشکیل وفروغ اور ہندی سیاست پراثرات کے لئے دیکھئے:

Annie Besant, *How India Fought For Freedom: The Story of National Congress From Official Records*, Madras, 1950; Pittabhi Sitaramayya, *History of the Indian National Congress*, Two Vols.,

جلد ہی کانگریسی رہنماؤں نے انگریزوں پر زور دینا شروع کر دیا کہ انگلستان کی طرح ہندوستان میں بھی انتخابی اور نیابتی ادارے قائم کیے جائیں اور اعلیٰ سرکاری ملازمتوں بالخصوص انڈین سول سروس (آئی سی ایس) میں ہندوستانی عنصر کو بڑھایا جائے۔[۲۹]

سرسید احمد خان وہ پہلے ممتاز مسلمان رہنما تھے جنھوں نے کانگریس کی تشکیل اور اس کے عزائم کی بانگ دہل مخالفت کی[۳۰] اور اس بات پر زور دیا کہ کانگریس کے مقاصد تاریخ سے

Delhi, 1969; C.F. Andrews and Girja Mukerji, *The Rise and rowth of the Congress in India*, London, 1938; Prabodh, Satyapal and Chandra, *60 Years of Congress: India Lost, India Regained*, Lahore, 1946; Chakrabarty and Bhattacharyya, *Congress in Evolution,* Part I & II, Calcutta, 1935; F.M. De Mello, *The Indian National Congress*, London, 1938; Anil Seal, *The Emergence of Indian Nationalism*, London, 1974; S.R. Mehrotra, 'The Organisation of the Indian National Congress, 1885-1920' and 'The Objectives and Methods of the Indian National Congress, 1885-1920' in *Towards India's Freedom and Partition*, New Delhi, 1979, pp. 67-90 and 91-114, -----, *The Emergence of Indian National Congress,* Delhi, 1974; Bimanbehari Majmdar and Bhahat Prasad Mazumdar, *Congress and Congressmen in the pre-Gandian Era, 1885-1917*, Calcutta, 1967; P.D. Kanshik, *The Congress Ideology and Programme, 1920-1947,* New Delhi, 1964; and B.R. Tomlinson, *The Indian National Congress and the Raj, 1929-1942*, London, 1976.

۲۹- تفصیلات کے لئے دیکھئے:

John R. Maclance, *Indian Nationalism and the Early Congress, Princeton*, 1977.

۳۰- سید طفیل احمد منگلوری، مسلمانوں کا روشن مستقبل، دہلی، ۱۹۴۵ء، ص ۲۸۶۔

ناواقفیت اور عصر حاضر کی حقیقتوں سے نا آشنائی کا نتیجہ ہیں۔[۳۱] ان کا یقین کامل تھا کہ کانگریس اگر حکومت خود اختیاری حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی تو پھر ہندوستانی مسلمانوں کو ہمیشہ کے لئے ہندو اکثریت کے سامنے ایک ثانوی حیثیت میں رہنا پڑے گا۔[۳۲] ظاہر ہے کہ ہندوستانی مسلمان برطانوی اقتدار کو اس کے جارحانہ ماضی کی وجہ سے تو ناپسند کرتے تھے مگر ان میں ایسی کوئی خواہش موجود نہ تھی کہ وہ فرنگی حکومت کو ہندو راج سے بدل ڈالیں۔[۳۳] اسی طرح اعلیٰ سرکاری ملازمتوں بالخصوص انڈین سول سروس میں ہندوستانی عنصر کے اضافے کے کانگریسی مطالبے سے بھی ہندی مسلمانوں کو کوئی دلچسپی نہ تھی کیونکہ وہ جانتے تھے کہ کانگریسی کوششوں کا بنیادی مقصد صرف ہندوؤں کے لئے زیادہ سے زیادہ اختیار اور ذمہ داری کی ملازمتوں کا حصول ہے۔[۳۴] وہ اس امر سے بھی بخوبی آگاہ تھے کہ ابھی وہ مغربی تعلیمی اعتبار سے پس ماندہ ہیں اور ہندوؤں سے امتحانات

۳۱- سرسید کی متعلقہ تقاریر و تحریروں کے اقتباسات کے لئے دیکھئے:

G. Allana, ed., *Pakistan Movement: Historic Documents*, Lahore, 1977, pp. 1-3.

۳۲- بحوالہ:

Donald N. Wilber, *Pakistan: Yesterday and Today*, New York, 1964, pp. 89-90.

۳۳- بحوالہ:

Wayne Ayres Wilcox, *Pakistan: The Consolidation of a Nation*, New York, 1963, p.20.

۳۴- بحوالہ:

Jamil-ud-Din Ahmad, *Muslim Political Movement: Early Phase*, Karachi, 1963, pp. 11-12.

انگریزی تعلیم حاصل کرتے ہی ہندو اشرافیہ کے تعلیم یافتہ افراد نے تحریک شروع کردی کہ اعلیٰ ملازمتوں میں ہندوستانیوں کا حصہ بڑھایا جائے۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ ہندو افسران کی تعداد میں اضافہ ہوجائے۔ مسلمان اس وقت ان کا مقابلہ کرنے کی سکت نہ رکھتے تھے حتیٰ کہ ایک ممتاز برطانوی اہل کار نے ۱۸۷۱ء میں تحریر کیا کہ وہ نسل جو ایک صدی پہلے حکومت پر اجارہ داری رکھتی تھی اب اس کی نمائندگی عام انتظامیہ کے ۱/۲۳ حصے سے بھی کم ہوکر رہ گئی ہے۔ دیکھئے:

W.W. Hunter, *The Indian Musalmans*, Calcutta, 1945, p. 145.

کے ذریعے علم شناسی میں کوئی مقابلہ نہیں کر سکتے۔[۳۵] چنانچہ انیسویں صدی کے نصف آخر میں ہندی مسلمانوں نے عافیت اسی میں جانی کہ وہ سیاسی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ نہ لیں اور اپنی تمام توانائیاں حصول تعلیم پر صرف کر دیں۔[۳۶]

۳۵- بحوالہ :

L.S.S. O'Malley, *Indian Civil Service, 1601-1930*, London, 1931, p.221

دراصل مقابلے کا امتحان انگریز ماہرین تعلیم کی زیر نگرانی برطانوی جامعات کے فارغ التحصیل طلبہ کو مدنظر رکھ کر ترتیب دیا جاتا تھا تاکہ اُمیدوار کی مغربی تہذیبی روایتوں کے بارے میں معلومات کو جانچا جا سکے۔ بحوالہ:

Charles H. Kenneday, *Bureaucracy in Pakistan*, Karachi, 1978, p. 113.

مزید برآں ہندی مسلمان اس وقت اس بارے میں شاید سب سے کم علم رکھتے تھے اور سب سے بڑھ کر جو امر مانع تھا وہ یہ تھا کہ اس وقت مقابلے کا امتحان صرف انگلستان میں منعقد ہوتا تھا۔ بحوالہ:

Henry Frank Goodnow, *The Civil Service of Pakistan: Bureaucracy in a New Nation*, Karachi, 1969, p. 33.

ظاہر ہے کہ انیسویں صدی میں شاید ہی کوئی ہندی مسلمان خاندان اپنے آپ کو اس بات پر آمادہ کر سکتا تھا کہ اپنے لخت جگر کو کامیابی کی ایک موہوم اُمید کے ساتھ ایک یکسر اجنبی اور ناپسندیدہ معاشرے میں بھیج دے۔ مگر جیسے ہی مسلمانوں میں تعلیمی شعور بڑھا تو انھوں نے اپنے دیگر ہم وطنوں کے ہمراہ آئی سی ایس میں ہندوستانی عنصر میں اضافہ کی مکمل تائید وجد وجہد شروع کر دی۔ تفصیلات کے لئے دیکھئے:

Nadeem Shafiq Malik, "Indianization of the ICS and Muslim Representation in Public Services", *Journal of the Research Society of Pakistan*, Vol. XXXI, No. 2 & 3 (April/July, 1994), pp.22-43 and 33-50 respectively.

۳۶- انیسویں صدی کے نصف آخر کی مسلم سیاست کے مطالعہ کے لئے دیکھئے:

Muhammad Yusaf Abbasi, *Muslim Politics and Leadership in South Asia, 1876-92*, Islamabad, 1981.

اس دور کی عمومی سیاست ورجحانات کے لئے دیکھئے:

Hirlal Singh, *Problems and Policies of British India, 1815-1898*, Bombay , 1963.

ہندو اکثریت کے پیہم اصرار پر برطانوی حکومت نے ۱۸۸۲ء میں لوکل سیلف گورنمنٹ ایکٹ نافذ کر دیا جس کے تحت ہندوستان میں میونسپل اور ضلع کونسلیں قائم ہوئیں جن کے انتخابات مخلوط ہونے کی بنا پر مسلمان نمائندے عموماً ناکام رہے اور یہی صورتحال ۱۸۹۲ء میں نافذ شدہ قانون مجالس ہند کے تحت ۱۸۹۳ء میں ہونے والے انتخابات میں پیش آئی جس میں مسلمان اُمیدوار پھر سخت ناکامی سے دوچار ہوئے کیونکہ متمول ہندو اکثریت نے ان کو منتخب کرنے میں قطعی کوئی دلچسپی ظاہر نہ کی۔[۳۷] اس صورتحال نے مسلمان زعماء کو اپنی قوم کے سیاسی مستقبل اور ملی بقاء کے لئے سنجیدگی سے سوچنے پر مجبور کر دیا کیونکہ ہندوستان میں مغربی طرز جمہوریت اور مخلوط انتخابات کے برقرار رہنے کے نتیجے میں مسلمانوں کا ہندو اکثریت کے ہاتھوں کچلا جانا یقینی تھا۔

ہندو اکثریت کے جارحانہ عزائم جلد ہی اُردو ہندی تنازعہ کی شکل میں عیاں ہو گئے۔ بنارس کے ہندو اکابرین کی طرف سے ۱۸۸۲ء میں شروع کی جانے والی تحریک کہ 'عدالتی نظام میں اُردو زبان کی جگہ دیوناگری رسم الخط میں لکھی جانے والی ہندی بھاشا رائج کی جائے'، نے جلد ہی مذہبی رنگ اختیار کر لیا اور ہندو رہنماؤں نے ہندی کو ایک ایسی زبان کے طور پر پیش کرنا شروع کر دیا جو مسلم دور اقتدار کی یاد دلانے والے تمام عربی و فارسی الفاظ سے خالی اور اس دیوناگری رسم الخط میں لکھی جاتی ہے جو برہمن استعمال کرتے تھے اور جس میں مقدس زبان سنسکرت تحریر کی جاتی تھی۔[۳۷/الف] نواب محسن الملک (۱۹۰۷ء۔۱۸۳۷ء) جو سرسید کے بعد مسلمانوں کی سیاسی قیادت کے فرائض انجام دے رہے تھے، نے اُردو ڈیفنس ایسوسی ایشن قائم کر کے مسلمانوں کے ملی ورثہ کی حفاظت کی جدوجہد شروع کر دی مگر اس ضمن میں پیش آنے والے تلخ تجربات نے مسلمان قیادت کو مضبوط اور وسیع تر بنیادوں پر ایک ملک گیر سیاسی تنظیم قائم کرنے کی اشد ضرورت کا پوری طرح احساس دلایا۔[۳۸]

۳۷- ۱۸۵۷ء سے لے کر ۱۸۹۲ء تک ہونے والے آئینی ارتقا اور اس کے ہندوستانی سیاست پر اثرات کے لئے دیکھئے:
I.H. Qureshi, *The Struggle for Pakistan*, Karachi, 1974, pp. 21-23.

۳۷/الف- بحوالہ:
Francis Robinson, *Separation Among Indian Muslims: The Politics of the United Provinces, 1860-1923, London,* 1974, p. 70.

۳۸- اُردو ہندی تنازعہ کی ابتداء، فروغ اور اس کے ہندو مسلم تعلقات پر اثرات کے لئے دیکھئے:
فرمان فتح پوری، اُردو ہندی، تنازعہ، اسلام آباد، ۱۹۷۷ء- اور
P. Paul Bress, *Language, Religion and Politics in North India*, Cambridge, 1974; and Gupta Jyotyinda Das, *Language Conflict and National Development*: *Group Politics and National Language Policy in India*, Berkeley, 1970.

جلد ہی تقسیم بنگال کی صورت میں برصغیر کی سیاسی تاریخ کا وہ اہم واقعہ رونما ہو گیا جس نے ہندو مسلم قوموں کی راہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جدا کر دیں۔ متحدہ بنگال برطانوی ہند کے بڑے صوبوں میں سے ایک تھا جس کا رقبہ ایک لاکھ نواسی ہزار مربع میل اور آبادی سات کروڑ اسی لاکھ نفوس پر مشتمل تھی۔[39] اس وسعت کی بنا پر اس کی انتظامی بدامنی کو دور کرنے کے لئے برطانوی حکومت نے ۱۹۰۵ء میں صوبہ بنگال کو مناسب رقبوں کے حامل دو صوبوں میں تقسیم کر دیا جس سے مغربی بنگال میں ہندوؤں کی اکثریت رہی اور مشرقی بنگال و آسام ایک نئے مسلم اکثریتی صوبہ کی حیثیت میں سامنے آئے۔[40] بنگالی مسلمانوں نے اس تبدیلی کا گرم جوشی سے خیر مقدم کیا کیونکہ یہ انھیں ہندو راج کے جبر و استبداد سے فرار کا موقع فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ ان پر تعمیر و ترقی کے دروازے بھی وا کرتی تھی۔[41] سب سے بڑھ کر یہ بات کہ ایک ایسا صوبہ تشکیل پا گیا جس میں اگر مخلوط انتخابات بھی ہوں تو مسلم حکومت کا وجود میں آنا یقینی تھا۔[42] اس کے برعکس بنگالی ہندوؤں نے تقسیم بنگال کو اپنے اثر و رسوخ کو تباہ کرنے کی سوچی سمجھی سازش قرار دیا تاکہ ہندوؤں کی اس قومی تحریک کو سبوتاژ کیا جا سکے جس کا وہ خود کو رہنما گردانتے تھے۔[43] چنانچہ ان کی قیادت میں پر

۳۹- سید حسن ریاض، 'پاکستان ناگزیر تھا'، کراچی ۱۹۸۲ء، ص ۴۸

۴۰- بحوالہ:

Muhammad Salim Ahmad, *The All-India Muslim League From the Late Ninteenth Century to 1919*, Bahawalpur, 1988, pp. 72-73; J.M. Broomfield, "The Partition of Bengal: A Problem in British Administration, 1830-1912" *in Indian History Congress Proceedings*, Aligarh, 1960, Calcutta, 1961, 2 Parts II, pp. 13-24; and P.C. Chakravarty, "Genesis of the Partition of Bengal, 1905", in *Indian History Congress Proceedings*, Trivandrum, 1958, Bombay, 1959, pp. 549-53.

۴۱- بحوالہ: Mohsin Ali, *The Bengali Muslims*, Karachi, 1971, p. 7.

۴۲- بحوالہ: Sharifuddin Pirzada, *Evolution of Pakistan*, Karachi, p.73

۴۳- بحوالہ: Percival Griffiths, *Modern India, London*, 1962, p. 71.

۱۹۰۵ تک ہندوستان میں قومیت کا احساس اپنی جڑیں پکڑ چکا تھا جس کی آبیاری میں بنگالی ہندوؤں نے کلیدی کردار ادا کیا تھا۔ تفصیلات کے لئے دیکھئے:

Mukerjee, Haridas and Uma; *The Growth of Nationalism in India, 1857-1905*, Calcutta, 1957; and J.H. Broomfield, *Elite Conflict in a Plural Society: Twentieth Century Bengal*, Berkeley, 1968.

تشدد کاروائیوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا جس کے بنیادی عناصر انگریزی مال کے بائیکاٹ، مساجد کے آگے باجہ بجانے، ذبیحہ گاؤ سے منع کرنے اور بندے ماترم کا ترانہ کھلے بندوں گانے پر مشتمل تھے۔[۴۴]

حیرت انگیز طور پر کانگریس جو ہندوستان کے تمام طبقات کی نمائندہ ہونے کی دعوے دار تھی، اس احتجاج میں پیش پیش تھی۔[۴۵]

کانگریس کے اس کھلے ہندوانہ کردار نے تمام تعلیم یافتہ مسلمانوں کو اس بات کا قائل کر دیا کہ وہ

۴۴- تفصیلات کے لئے دیکھئے:

Mukerjee, Haridas and Uma, *India's Fight for Freedom or the Swedeshi Movement, 1905-1906*, Calcutta, 1957; Ambalal Sakarlal Desai, "Economic Swadeshism - An Analysis", *Modern Review,* 1, 2, February, 1907, pp. 123-8; Tara Chad, *History of the Freedom Movement in India*, 4 Vols., New Delhi, 1961-72, III, pp. 339-41; Smit Sarkar, *The Swadeshi Movement in Bengal (1903-1908)*, Calcutta, 1973; Leonard A. Gordon, *Bengal: The Nationalist Movement, 1876-1940, Delhi*, 1974, pp. 77-100; and Bipin Chandra, *The Rise and Growth of Economic Nationalism in India*, New Delhi, 1966.

بندے ماترم ایک نہایت دل آزار بنگالی نظم تھی جو مسلم دشمنی کے جذبات سے معمور تھی۔ بندے ماترم کے انگریزی ترجمہ کے لئے دیکھئے:

Mubarak Mand, *On the Brink of War*, Lahore, 1947, pp. 100-101.

اس نظم کے ہندو سیاست پر اثرات کے لئے دیکھئے :

Mukerjee, Haridas and Uma, *"Bande Matram" and Indian Nationalism, 1906-1908*, Calcutta, 1957.

۴۵- بحوالہ:

M.H. Saiyid, *Muhammad Ali Jinnah: A Political Study,* Karachi, 1970, pp. 17-19.

صرف اسی صورت میں محفوظ رہ سکتے ہیں اگر وہ اپنی علیحدہ سیاسی قوت و قیادت پیدا کر لیں۔[۴۶] اس احساس کو مزید تقویت وزیرِ اُمور ہند جان مورلے کے ۲۰ جولائی ۱۹۰۶ء کے اس اعلان سے ملی کہ بہت جلد مجلس قانون ساز میں منتخب عنصر میں اضافہ کی تجاویز مرتب کی جائیں گی۔[۴۷]

چنانچہ سر سلطان محمد شاہ آغا خان سوم (۱۸۷۷ء۔۱۹۵۷ء) کی قیادت میں چونتیس ممتاز مسلمان رہنماؤں کا ایک وفد یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء کو شملہ میں وائسرائے لارڈ منٹو (۱۸۴۵ء۔۱۹۱۴ء) سے ملا اور ایک محضر نامے کی شکل میں مسلمانوں کی شکایتوں اور حق تلفیوں کا ذکر کرتے ہوئے متعدد مطالبات پیش کئے جس میں جداگانہ حق رائے دہندگی کا حصول سب سے نمایاں تھا۔ لارڈ منٹو نے جواباً وفد کو یقین دلایا کہ آئندہ آنے والے انتظامی ڈھانچے میں مسلمانوں کے سیاسی حقوق و مفادات کا تحفظ کیا جائے گا اور خصوصیت سے مسلمانوں کے حق جداگانہ رائے دہندگی کی حمایت کی۔[۴۸]

اِس اُمید افزاء پیش رفت کے بعد مسلم رہنماؤں کے درمیان ایک ملک گیر سیاسی جماعت کی تشکیل کا خیال جڑ پکڑتا گیا۔ انجام کار ۳۰ دسمبر ۱۹۰۶ء کو آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے ڈھاکہ میں منعقدہ اجلاس کے اختتام پر مسلمانانِ ہند کی پہلی بڑی ملک گیر سیاسی تنظیم آل انڈیا مسلم لیگ (۱۹۰۶ء۔۱۹۴۷ء) کا قیام عمل میں لایا گیا جس کے بنیادی مقاصد میں مسلمانانِ ہند کے

۴۶- بحوالہ:

Hector Bolitho, *Jinnah: Creator of Pakistan*, Lahore, 1964, p. 44.

۴۷- تفصیلات کے لئے دیکھئے:

Anil Chandra Banerjee, *Constitutional History of India*, 3 Vols., New Delhi, 1977-78, II, (1858-1919); and M.V. Pylee, *Constitutional History of India, 1600-1950*, Bombay, 1972.

۴۸- تفصیلات کے لئے دیکھئے:

Syed Razi Wasti, *Lord Minto and the Indian Nationalist Movements, 1905 to 1910*, Oxford, 1964, pp. 59-80.

سیاسی حقوق و مفادات کی حفاظت اور انھیں آگے بڑھانا شامل تھا۔[۴۹]

آل انڈیا مسلم لیگ کی شاخیں جلد ہی ہندوستان کے طول و عرض میں قائم ہوگئیں اور اس نے پوری تندہی سے مسلم مطالبات خصوصاً جداگانہ انتخابات کے انعقاد کو زور و شور سے آگے بڑھانا شروع کر دیا۔ یہ کوششیں بالآخر رنگ لائیں اور منٹو مارلے اصلاحات پر مبنی ۱۹۰۹ء کے ایکٹ میں اس مطالبے کو تسلیم کر لیا گیا اور آزادی تک مسلمان قانون ساز اداروں میں اپنے نمائندے خود منتخب کر کے بھیجتے رہے۔[۵۰]

۴۹- بحوالہ:

M.S. Toosy, *The Muslim League and Pakistan Movement*, Karachi, 1978, p. 14.

آل انڈیا مسلم لیگ روز اول سے ہی مسلمانوں کی نمائندہ جماعت بن کر ابھری اور تقسیم ہند تک ان کے مفادات کی کما حقہٗ حفاظت کرتی رہی اور تشکیل پاکستان کا سہرا بھی اس کے سر بندھا۔ اس کی تشکیل، ارتقا اور کارناموں کے لئے دیکھئے:

Mary L. Becker, "The All-India Muslim League 1906-1947", Unpublished Ph.D. Thesis, Rad Cliffe College, 1957; Lal Bahadur, *The Muslim League: Its History, Activities & Achievements*, Lahore, 1979; A.B. Rajput, *Muslim Leage:* Yesterday & Today, Lahore, 1948; and Muhammad Noman, *Muslim India*, *The Rise and Growth of the All-India Muslim League*, Allahabad, 1942.

ان حالات کے عمومی مطالعے کے لئے جو آل انڈیا مسلم لیگ کے قیام پر منتج ہوئے، دیکھئے:

Rafiq Zekaria, *Rise of Muslims in Indian Politics: An Analysis of Developments from 1885 to 1906,* Bombay, 1970.

۵۰- ہندوستان کی سیاسی تاریخ پر لارڈ منٹو اور جان مارلے کے لبرل خیالات نے گہرے اثرات مرتب کئے اور ان کی اصلاحات نے خصوصاً مسلم سیاست کو ایک علیحدہ تشخص عطا کیا۔ ان اہم شخصیتوں کی حیات و خدمات کے خصوصی مطالعے کے لئے دیکھئے:

Manmatha Nath Das, *India Under Morley and Minto: Politics Behind Revolution, Repression and Reforms,* London, 1964; Countess of Minto, *India: Minto and Morley, 1905-1910,* London,

انگریزوں کے لئے مسلمانان ہند کی سپاس گذاری جلد ہی شکوہ و شکایت میں بدل گئی اور نوبت یہاں تک جا پہنچی کہ وہ ہندوؤں کے مقابلے میں انھیں اپنا زیادہ بڑا مخالف گردانے لگے۔ ان احساسات کی ابتداء تنسیخ تقسیم بنگال کے واقعہ سے ہوئی جب ۱۹۱۱ء میں ہندوؤں کے سیاسی دباؤ کے پیش نظر تقسیم بنگال جیسی 'طے شدہ حقیقت' کو منسوخ کر دیا گیا۔[۵۱]

اس فیصلہ سے مسلمان سخت دل شکستہ، مایوس اور برہم ہوئے اور ان میں یہ خیال راسخ ہو گیا کہ حکومت کو تشدد، احتجاج اور بغاوت سے ہی جھکایا جا سکتا ہے۔[۵۲] اس اعلان کے فوراً بعد بین الاقوامی سطح پر بھی پے درپے چند ایسے واقعات رونما ہوئے جن کی بدولت برطانیہ مخالف جذبات کو مسلمانان ہند میں مزید پذیرائی ملی۔ ستمبر ۱۹۱۱ء میں اٹلی نے طرابلس العرب جو کہ اس وقت سلطنت

1934; Syed Sirdar Ali Khan, *The Life of Lord Morley*, London, 1923; J.N. Morgon, *Viscount John Morley*, London, 1924; Lord Minto, *Speeches, 1905-1910*, Calcutta, 1911; Viscount John Morley, *Indian Speeches, 1907-1909*, London, 1909 and, *Recollections,* Two Vols., London, 1924; Pardaman Singh, *Lord Minto and Indian Nationalism, 1905-10*, Allahabad, 1976.

منٹو مارلے اصلاحات کے لئے دیکھئے :

S.R. Mehrotra, "The Morley-Minto Reforms", in *Towards India's Freedom and Partition*, New Delhi, 1979, pp. 115-23.

۵۱- تقسیم بنگال، اس کی تنسیخ اور اس فیصلے کے اثرات کے متعلق ایک جامع عالمانہ جائزہ کے لئے دیکھئے:

Z.H. Zaidi, "The Partition of Bengal and Its Annulment: A Survey of the Schemes of Territorial Redistribution of Bengal, 1902-1911", Unpublished Ph.D.Thesis, University of London, 1964.

۵۲- تقسیم بنگال کی تنسیخ پر مسلم جذبات کے جائزے کے لئے دیکھئے:

A.I. Carthill, *The Lost Dominion*, London, 1924, pp. 225-27; R. Craddock, *The Dilemmain India*, London, 1929, p. 147; and M.F.O. Dwyer, *India As I Knew it*, London, 1925, p. 175.

عثمانیہ کا ایک حصہ تھا، پر حملہ کر دیا۔ اس واقعے سے ہندی مسلمانوں میں سخت جوش وجذبہ پیدا ہو گیا اور مجاہدین طرابلس کی امداد کے لئے چندے جمع ہونے لگے اور اٹلی کے مال کا بائیکاٹ کیا گیا۔ اس سارے قصے میں اٹلی کو برطانیہ کی خاموش تائید حاصل رہی جس سے مسلمانوں کو سخت رنج ہوا۔[۵۳]

ابھی جنگ طرابلس جاری تھی کہ بلقان کی چار عیسائی ریاستوں نے خلافت ترکیہ کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا جس پر بھی ہندی مسلمانوں نے شدید ردعمل کا اظہار کیا۔ ترکوں کی حمایت میں شاندار مظاہرے کئے گئے اور انھیں چندہ جمع کر کے بھیجا گیا۔ علاوہ ازیں مولانا محمد علی جوہر (۱۹۳۱ء۔۱۸۷۸ء) کی مساعی سے ڈاکٹر مختار احمد انصاری (۱۹۳۶ء۔۱۸۸۰ء) کی سرکردگی میں ایک طبی وفد بھی جنگ زدہ علاقوں میں گیا۔[۵۴] بلقان کے باغیوں کو بھی حکومت برطانیہ کی خفیہ پشت پناہی حاصل تھی جس سے مسلمانوں میں انگریز دشمن احساسات کو مزید جلا ملی۔ اسی زمانے ہی میں برطانیہ اور روس کی وہ خفیہ مفاہمت سامنے آئی جس کی رو سے دونوں نے ایران کو اپنے اپنے حلقہ ہائے اثر میں تقسیم کر لیا تھا۔[۵۵] یہ مغربی استعماریت کی ایک بدترین مثال تھی جس کی رو سے ایک خود مختار ملک کی اجازت وعلم کے بغیر اس کے حصے بخرے کر دیئے گئے۔ مسلمانان ہند کے ساتھ ایران

۵۳- سید حسن، ریاض، محولہ بالا، ص ۶۱۔

۵۴- بحوالہ:

Agha Khan, *The Memories of Agha Khan*, London, 1954, p. 128.

۵۵- بیسویں صدی کے پہلے عشرے میں یورپ و ایشیا میں جرمنی اور جاپان کی بڑھتی ہوئی فوجی قوت کے پیش نظر برطانیہ اور روس نے ایشیاء میں جاری بالادستی کی باہمی مسابقت ختم کرنے کا فیصلہ کیا اور ۱۹۰۹ء میں سینٹ پیٹر برگ میں ایک خفیہ معاہدے پر دستخط ہوئے جس کی روس سے افغانستان، تبت اور ایران کے بارے میں اہم فیصلے کئے گئے۔ اس معاہدے کی رو سے ایران کے شمالی صوبہ جات روسی دائرہ اثر میں دیئے گئے اور جنوب مشرقی حصہ انگلستان کے حصے میں آیا اور بقیہ رقبے میں دونوں طاقتوں کو اپنا اپنا اثر ورسوخ ایک ساتھ پھیلانے کی اجازت دے دی گئی۔ دیکھئے:

Lord Strang, *Britain in World Affairs: A Survey of the Fluctuations in British Power and Influence: Henry VIII to Elizabeth II*, London, 1961, pp. 258-59.

کے عمیق قلبی تعلق اور صدیوں پُرانے روابط کی بنا پر یہ امر ان کے لئے مزید غم و غصے کا باعث بنا۔[۵۶]

داخلی طور پر علی گڑھ یونیورسٹی کے قیام میں تاخیر بھی ہندی مسلمانوں اور انگریزوں میں مزید دوری کا باعث بنی۔ سرسید نے ایم اے او کالج کی بنیاد رکھتے ہوئے اُمید ظاہر کی تھی کہ یہ کالج جلد ہی ایک خودمختار یونیورسٹی میں تبدیل ہو جائے گا۔ مسلمانوں کا مطمع نظر یہ تھا کہ وہ پورے ملک میں اپنے تعلیمی اداروں کا اسی جامعہ کے ساتھ الحاق کریں اور مسلم طلبہ کو ایک خاص نظام تعلیم میں تربیت دیں۔ مگر برطانوی حکومت مسلمانوں کو ان کا یہ معمولی حق بھی دینے کے لئے تیار نہ تھی۔ پہلے ۲۰ لاکھ روپے جمع کرنے کی شرط عائد کر دی اور جب ۱۹۱۱ء تک مطلوبہ رقم جمع ہوگئی تو حکومت نے علی گڑھ یونیورسٹی کے ساتھ لفظ مسلم لگانے کی ممانعت کر دی اور اس کو الحاقی یونیورسٹی بنانے سے انکار کر دیا جس سے مسلم تعلیم یافتہ طبقہ، جو پہلے ہی انگریز سے کشیدہ خاطر تھا، مزید بھڑک اُٹھا۔[۵۷]

ان تمام عوامل کے پس منظر میں سانحہ کانپور نے مسلمانوں کے سیاسی سفر کو ایک نئے رخ پر ڈال دیا۔ یکم جولائی ۱۹۱۳ء کو کانپور کی سڑکوں کے ایک توسیعی منصوبے کے تحت مچھلی بازار میں واقع جامع مسجد کا ایک حصہ شہید کر دیا گیا جب مسلمانانِ کانپور کی درخواستوں اور التجاؤں کی کوئی پذیرائی نہ ہوئی اور انھوں نے اس حصے کو از خود دوبارہ تعمیر کرنے کی کوشش کی تو اس نہتے ہجوم پر جس میں بچے اور بوڑھے بھی شامل تھے، گولی چلا دی گئی جس سے ۲۳ افراد شہید اور بے شمار زخمی ہوئے اور باقی گرفتار کر لئے گئے اس جبر و استبداد کے مظاہرے نے مسلمان قوم کو آگ بگولا کر دیا اور ملک بھر میں احتجاجی مظاہروں کا ایک سلسلہ چل نکلا جس کے اثرات لندن تک محسوس کئے گئے۔ ہر

۵۶- ایران و ہند کے تاریخی روابط اور ثقافتی و روحانی تعلقات کے لئے دیکھئے:

Jaffar Qasmi, ed., *The Impact of Iran on Our Cultural and Spiritual Heritage*, Lahore, 1971; and A.M. Faiz Ahmad Choudhry, "Linguistic Affinity Between Iran and Pakistan", *The Dacca University Studies*, Vol 16, (June, 1968), pp. 1-16.

۵۷- مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے قیام کی تحریک اور برطانوی رویے کے بارے میں دیکھئے:

Abdul Hamid, *Muslim Separatism in India*, Lahore, 1971, pp. 93-96.

چند بعد میں سڑک کے اس حصے پر چھت ڈال کر متاثرہ حصہ کو دوبارہ تعمیر کر دیا گیا مگر اس سے مسلمانوں کے دل میں جو میل آ چکا تھا وہ نہ ڈھل سکا۔[۵۸] مسلم قوم کے بدلتے ہوئے رجحانات کی عکاسی ۱۹۱۳ء میں لکھنؤ میں ہونے والے آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں ہوئی جب لیگ کے مقاصد میں بنیادی تبدیلی لائی گئی اور نرے اظہار وفاداری کی بجائے حکومت خود اختیاری کا حصول لیگ کا مطمح نظر ٹھہرا۔[۵۹]

۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم اول کا آغاز ہو گیا اور ترکی نے جرمنی کی حمایت میں اتحادیوں، جن کی سربراہی برطانیہ کر رہا تھا، کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔[۶۰] اس فیصلے سے مسلمانان ہند ایک نئی آزمائش سے دوچار ہو گئے۔ ان کے قلبی جذبات تو ترکی کی حمایت میں موجزن تھے مگر حکومتی جبر کی وجہ سے وہ کوئی عملی اقدام کرنے سے قاصر تھے مگر پھر بھی کئی زبانیں خاموش نہ رہ سکیں اور بہت سے مسلم قائدین کو نتیجتاً جیل کی ہوا کھانی پڑی جن میں علی برادران، مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی (۱۸۷۳ء-۱۹۳۸ء) سب سے نمایاں تھے جو پانچ سال تک پابند سلاسل رہے۔[۶۱]

۵۸- دیکھئے: حسن ریاض، محولہ بالا، صفحات ۶۳-۱۶۴۔

۵۹- تفصیلات کے لئے دیکھئے:

Syed Sharifuddin Pirzada, ed., *Foundation of Pakistan: All India Muslim League Documents, 1906-1947*, Vol. I, Karachi, 1970, pp.

۶۰- جنگ عظیم اول کی شروعات، پھیلاؤ اور اثرات کے لئے دیکھئے:

C.R.M.F. Crutwell, *A History of the Great War, 1914-18*, London, 1934.

۶۱- علی برادران یعنی مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی جوہر ہندوستان کی تاریخ حریت میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں، جنھوں نے تحریک خلافت اور اس کے بعد مسلمانوں کے سیاسی مفادات کے تحفظ کے لئے گراں قدر خدمات انجام دیں۔ علی برادران کی صحافتی و سیاسی خدمات کے ایک اجمالی جائزہ کے لئے ملاحظہ ہو:

رئیس احمد جعفری، مرتبہ، علی برادران، لاہور، ۱۹۶۳ء محمد سرور، مرتبہ، مضامین محمد علی جوہر، لاہور، ۱۹۳۸ء، ــــــ، محمد علی، لاہور، ۱۹۶۲ء۔

Afzal Iqbal, *Life and Times of Muhammad Ali: An Analysis of the Hopes, Fears and Aspirations of Muslim India, From 1878 to 1931*, Delhi, 1978, ------, ed., *My Life-A Fragment: An Autobiographical Sketch of Maulana Muhammad Ali*, Lahore, 1942, ------, *Selected Writings and Speeches of Maulana Muhammad Ali*, 2 Vols., Lahore, 1944; Syed Rais Ahmad Jafri,

دورانِ جنگ کانگریس اور مسلم لیگ میں باہمی تعاون کی راہ ہموار ہوتی چلی گئی۔ ۱۹۱۶ء کے دوران دونوں جماعتوں کی مقرر کردہ کمیٹیوں نے باہم مشورہ کے ذریعے ایک سکیم تیار کی جس کو دسمبر ۱۹۱۶ء میں دونوں جماعتوں نے لکھنؤ میں منعقدہ الگ الگ اجتماعات میں منظور کر لیا اور اسے میثاق لکھنؤ کا نام دیا گیا۔[۶۲] میثاق لکھنؤ کے ذریعے کانگریس نے پہلی اور آخری دفعہ مسلمانوں کے نمائندہ جماعت کے طور پر تسلیم کر لیا گیا۔ اقلیتوں کو مؤثر نمائندگی دینے کے لئے ہر صوبہ میں انھیں جداگانہ انتخاب کے حق کو مان لیا اور اس طرح ان کی الگ قومیت اور مسلم لیگ کو مسلمانوں کی ان کی آبادی سے قدرے زیادہ نمائندگی دی گئی۔ مرکزی مجلس قانون ساز میں مسلمانوں کو ۳/۱ نشستیں دینے کا فیصلہ ہوا اور یہ بنیادی اُصول طے پا گیا کہ اگر کسی مسودہ قانون کو کسی قوم کے نمائندگان کا ۴/۳

---

ed., *Selections From Maulana Muhammad Ali's Comdrade*, Lahore, 1965; Shan Muhammad, *Freedom Movement in India: The Role of Ali Brothers,* New Delhi, 1979; Mushirul Hasan, *Muhammad Ali: Ideology and Politics,* New Delhi, 1980, ------, ed., *Muhammad Ali in Indian Politics: Selected Writings,* Delhi, 1982; Allah Buksh Yusufi, *Life of Maulana Muhammad Ali Jauhar*, Karachi, 1970; and G.A. Natesan, ed., *Eminent Musalmans*, Madras, 1926, pp. 508-64.

۶۲- میثاق لکھنو کے پس منظر کے لئے دیکھئے:

I.H. Qureshi, *The Struggle For Pakistan, op. cit.*, pp. 44-47; J.C. Ker, *Political Trouble in India, 1907-1917*, Calcutta, 1917; Syed Sharifuddin Pirzada, *Foundations of Pakistan*, Vol. I, 1906-1924, Dacca, 1969, pp. 324-97; Choudhry Khaliquzzaman, *Pathway to Pakistan*, Lahore, 1961, pp. 32-41; M. Noman, *Muslim India,* Allahabad, 1942, pp. 138-69; Jamil-ud-Din Ahmad, *Muslim Political Movement: Parliamentary Phase*, Karachi, 1963, pp. 72-80.

حصہ مسترد کر دے تو اسے منظور نہیں کیا جائے گا۔[۶۳] ان سفارشات کی اکثریت کو بعد میں قانون حکومت ہند ۱۹۱۹ء میں شامل کر لیا گیا مگر اس میثاق کی اصل اہمیت یہ ہے کہ اس نے وقتی طور پر ہندو مسلم اتحاد کی ایسی پرامن فضا کو جنم دیا جس میں انگریزوں کے خلاف متحدہ تحاریک چلانا ممکن ہو گیا۔

ہندو مسلم اتحاد کا سب سے پہلا مظاہرہ رولٹ ایکٹ کی منظوری کے خلاف چلنے والی ملک گیر تحریک میں ہوا۔ ۲۳ / مارچ ۱۹۱۹ء کو حکومت ہند نے حکومت مخالف سرگرمیوں کو کچلنے کے لئے رولٹ ایکٹ نامی ایک انتہائی ظالمانہ قانون نافذ کیا جس کا جنگ عظیم اول ختم ہونے کے بعد کوئی اخلاقی جواز نہ تھا۔ اس کی رو سے کسی ملزم پر جرم ثابت کرنا حکومت کی ذمہ داری نہ تھی بلکہ اگر وہ اپنی صفائی نہ دے سکے تو خود بخود مستوجب سزا ٹھہرتا تھا۔ اسے نہ صرف کوئی وکیل کرنے کی سہولت سے محروم رکھا جاتا تھا بلکہ اس ایکٹ کے تحت سنائی جانے والی سزا کے خلاف کوئی اپیل بھی دائر نہیں کی جا سکتی تھی۔[۶۴] اس

۶۳- میثاق لکھنو کے مکمل متن کے لئے دیکھئے:

M.H. Saiyid, *op.cit.*, pp. 644-56.

میثاق لکھنو میں تسلیم شدہ سفارشات کی اکثریت کو بعد میں قانون حکومت ہند ۱۹۱۹ء میں شامل کر لیا گیا۔ تفصیلات کے لئے دیکھئے:

Anil Chandra Banerjee, *Constitutional History of India*, 3 Vols., New Delhi, 1978, II, 1858-1919. M.V. Pylee, *Constitutional History of India, 1600-1950,* Bombay, 1972; P.G. Robb, *The Government of India and Reforms Policies Towards Politics and the Constitution,* Oxford, 1976; and Algernon Rumbold, *Watershed in India, 1914-1922*, London, 1979.

۶۴- رولٹ ایکٹ کے نفاذ کے پس منظر کے لئے دیکھئے:

Shafique Ali Khan, *Two Nation Theory: As a Concept, Strategy and Ideology*, Hyderabad, 1973, pp. 537-547, *(Rowlatt) Sedition Committee Report*, Calcutta, 1973; and R. Kumar, ed., *Essays on Gandhian Politics: The Rowlatt Satya Graha of 1919,* Oxford, 1971.

اندھے قانون کے خلاف ہندوستان بھر میں احتجاجی لہر دوڑ گئی اور ہر طرف ہڑتالوں، جلسے اور جلوسوں کا زور ہو گیا۔ اسی ضمن میں جب ۱۳؍اپریل ۱۹۱۹ء کو جلیانوالہ باغ امرتسر میں ایک احتجاجی جلسہ منعقد کرنے کی کوشش کی گئی تو اس پر گولی چلا دی گئی جس سے سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ۳۷۹ آدمی ہلاک اور ۱۲۰۰ زخمی ہوئے۔[۶۵] اس سانحے سے ملک بھر میں نفرت کی ایک لہر دوڑ گئی اور عوامی غیض و غضب کا جوالا مکھی پھوٹنے کے لئے کسی بہانے کی تلاش میں تھا جو تحریک خلافت کی شکل میں سامنے آ گیا۔

جنگ عظیم اول کے خاتمے کے بعد ہندی مسلمانوں کو ترکی کی سالمیت اور خلافت اسلامیہ کی حفاظت کے بارے میں گہری تشویش لاحق ہو گئی۔ اس مسئلہ سے اپنی وابستگی ظاہر کرنے کے لئے انھوں نے ۲۷؍اکتوبر ۱۹۱۹ء کو ملک بھر میں 'یومِ خلافت' منایا اور ہندو مسلم رہنماؤں پر مشتمل ایک وفد ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی قیادت میں وائسرائے لارڈ فریڈرک چمسفورڈ (۱۸۶۸ء۔۱۹۳۳ء) سے ملا اور اسے اپنے جذبات سے آگاہ کیا۔ وائسرائے کے مشورے پر بعد ازاں ایک وفد مولانا محمد علی جوہر کی قیادت میں یورپ بھیجا گیا جو کئی ہفتے وہاں مقیم رہا اور بشمول برطانوی وزیر اعظم، کئی

۶۵- سانحہ جلیانوالہ باغ کے بارے میں دیکھئے، سید نور احمد، مارشل لاء سے مارشل لاء تک، (اپریل ۱۹۱۹ء تا اکتوبر ۱۹۵۸ء)، لاہور، ۱۹۶۶ء، ص ۲۲-۲۱۔

V.N. Datta, *Jalianwala Bagh,* Ludhiana, 1968; Arthur Swinson, *Six Minutes to Sunset: the Story of General Dyere & the Amritsar Affairs,* London, 1964; Raja Ram, *The Jallianwala Bagh Massacre: A Premeditated Plan,* Chandigarh, 1969; Rupert Furneaux, *Massacre at Amritsar,* London, 1963; Alfred Draper, *Amritsar: The Massacre That Ended the Raj,* London, 1979; *Report of the Commissioners Appointed by the Punjab Sub-Committee of the Indian National Congress,* Reprint, Delhi, 1976; Sir Michael O'Dwyer, *India as I Knew It, 1885-1925,* London, 1925; and Ian Colvin, *The Life of General Dyer,* London, 1929.

مقتدر سیاسی رہنماؤں سے ملا اور انھیں مسئلہ خلافت کے بارے میں مسلم ہندوستان کے محسوسات سے آگاہ کیا مگر کہیں بھی ان کی شنوائی نہ ہوئی۔[٦٦]

یہ وفد ابھی انگلستان ہی میں تھا کہ معاہدہ سیورے کے ذریعے ترکی کو وسیع رقبے سے محروم کر دیا گیا اور خلیفۃ المسلمین کی حیثیت ایک کٹھ پتلی کی سی رہ گئی۔ ہندوستانی مسلمان اس صورت حال کو آسانی سے برداشت کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ چنانچہ یورپ سے واپسی پر خلافتی رہنما ہندوستان کے طول وعرض میں پھیل گئے اور ہر گوشہ مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، مولانا ظفر علی خان (۱۸۷۳ء۔۱۹۵۶ء)، مولانا حسرت موہانی (۱۸۷۸ء۔۱۹۵۱ء) اور ابوالکلام آزاد (۱۸۸۸ء۔۱۹۵۸ء) کے نغمہ حریت سے گونجنے لگا۔

اس نازک موقعہ پر ہندوستانی سیاست کے افق پر موہن داس کرم چند گاندھی (۱۹۴۸ء۔۱۸۶۹ء) کی طلسماتی شخصیت وارد ہوئی جس نے تحریک خلافت کے آغاز سے ہی بھانپ لیا کہ مسلم قلوب کو جیتنے اور ہندوستانیوں میں غیر ملکی قبضہ کے خلاف لڑنے کے لئے اتحاد کو فروغ دینے کا ایسا موقعہ آئندہ سو سال میں بھی نہیں آ سکتا۔[٦٧] گاندھی نے مسلمانوں کے موقف کی حمایت میں برطانوی حکومت کے عطا کردہ تمام تمغے بطور احتجاج واپس کر کے ان کے دل جیت لئے[٦٨] اور ہندوؤں کو بھی اس بات کا قائل کر لیا کہ دونوں قومیں آزادی ہند اور بحالی خلافت کے دوگانہ مقاصد کے حصول کے لئے مشترکہ جدوجہد کریں۔ چنانچہ یہ اس کی ذاتی کوششوں کا ہی نتیجہ تھا کہ کانگریس کے کلکتہ سیشن منعقدہ ۱۹۲۰ء نے تحریک خلافت کی حمایت میں عدم تشدد پر مبنی سول

٦٦- وفد خلافت کے دورہ یورپ کے بارے میں دیکھئے:

Shafique Ali Khan, *op.cit.*, pp. 550-59.

٦٧- بحوالہ:

R.C. Majumdar, *History of the Freedom Movement of India*, Vol. III, Calcutta, 1963, p. 60.

٦٨- دیکھئے: وائے سرائے کے نام گاندھی کا مورخہ ۳۱ اگست ۱۹۲۰ء کا خط مندرجہ

Durlab Singh, *Famous Letters and Ulitmatuisms to the British Government*, Lahore, 1945, pp. 12-14.

نافرمانی کی تحریک اپنالی۔[۶۹]

ان اقدامات کی بنا پر گاندھی دونوں قوموں میں ازحد مقبول ہو گیا اور اسے خلافت کمیٹی کی قیادت بھی سونپ دی گئی۔[۷۰]

۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۲ء تک مسلم سیاست کا مرکزی نقطہ تحریک خلافت ہی رہی اور چشم فلک نے ہندو مسلم اتحاد کا بے مثل اور واحد نظارہ دیکھا۔ تحریک کے دوران ملک گیر ہڑتالیں، جلسے اور جلوس

۶۹۔ بحوالہ :

Norman D. Palmer, "India" in *George Mcturnan Kahin*, ed., *Major Governments of Asia*, Ithaca, 1967, p.287.

اس دور میں کانگریس کی بحیثیت جماعت کارکردگی اور سیاسی رجحانات کے لئے دیکھئے:

Gopal Krishna, "The Development of the Indian National Congress as a Mass Organization, 1918-1923" in Thomas R. Metcalfed, *Modern India*, London, 1971, pp. 257-72.

حیرت انگیز طور پر جنگ عظیم اول کے دوران جب لڑائی اپنے عروج پر تھی گاندھی نے ایک بالکل متضاد کردار کا مظاہرہ کیا تھا۔ جنگ کے آغاز پر وہ اس خیال کے موید تھے کہ کانگریس کو وہ تمام قراردادیں واپس لے لینی چاہئیں جو "ہوم رول" یا ذمہ دار حکومت کا مطالبہ کرتی ہوں اور اس نازک موڑ پر بھارت کو اپنے تمام تندرست بیٹے برطانوی ایما پر قربان کر دینے چاہئیں۔ بحوالہ:

Indu Lal Yajnik, *Gandhi as I Knew Him*, Delhi, 1943, pp. 49-50.

بلکہ اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر وہ ۱۹۱۷ء کے سال کے اختتام تک برطانوی حکومت کو فوجی بھرتیوں میں اس قدر مدد پہنچا چکے تھے کہ ان کی 'قابل تعریف خدمات' کے پیش نظر انھیں قیصر ہند میڈل سے بھی نوازا گیا۔ بحوالہ:

S.K. Majumdar, *Jinnah and Gandhi*, Lahore, 1976, p.28.

۷۰۔ گاندھی کے تحریک خلافت میں ادا شدہ کردار اور سیاسی جدوجہد کے لئے دیکھئے :

Judith M. Brown, *Gandhi's Rise to Power: Indian Politics, 1915-22*, Cambridge, 1974; Mahadev H. Desai, *Day to Day with Gandhi: Secretary's Diary, Nov. 1917 to March 1919*, Rajghat, 1968; and Kanji Dwarkadas, *Gandhiji Through My Diary Leaves, 1915-1948*, Bomboy, 1950.

روزمرہ کا معمول بن گئے۔ برطانوی حکومت کے عطا کردہ خطابات اور تمغوں کو واپس کر دیا گیا۔ بہت سے وکلاء نے عدالتوں کے مقاطعے کی اپیل کے نتیجے میں پریکٹس چھوڑ دی۔ اسی طرح تعلیمی اداروں کو سرکاری گرانٹ وصول نہ کرنے اور نوجوانوں کو فوج میں بھرتی نہ ہونے پر ابھارا گیا اور انگریزی مصنوعات کا بائیکاٹ کیا گیا۔ ۱۹۲۱ء کے آواخر میں خلافت کمیٹی نے اپنے رضا کاروں کو کھلم کھلا قانون توڑنے اور سول نافرمانی کرنے کی ہدایت جاری کر دی جس کے سبب کم از کم تیس ہزار رضا کاروں نے گرفتاری دے دی۔[۱۷]

۱۷- تحریک خلافت کے مفصل جائزے کے لئے دیکھئے:

M. Naeem Qureshi, "The Khilafat Movement in India, 1919-1924", Unpublished Ph.D. Thesis, University of London 1973; and "The Ideology of the Khilafat Movement: Some Observations", unpublished research article, Nehru Memorial Museum and Library, New Delhi.

تحریک سے متعلقہ دستاویزی ماخذ کے لئے ملاحظہ کیجئے:

Khurshid Ahmad Aziz, *The Indian Khilafat Movement, 1915-1943: Documentary Record,* Karachi, 1972.

تحریک خلافت کے بارے میں ہندو زاویہ نگاہ کے لئے دیکھئے:

Sukhbir Choudhary, *Indian Peoples Fight for National Liberation: Non-Cooperation, Khilafat and Revivalist Movements*, New Delhi, 1972, pp. 213-286.

تحریک خلافت کی حمایت میں چلائی گئی تحریک عدم تعاون (۲۲-۱۹۲۰ء) کے بارے میں معلومات کے لیے دیکھئے:

B.M. Taunk, *Non-Cooperation Movement in Indian Politics 1919-1924, A Historical Study*, Delhi, 1978.

تحریک خلافت کے بارے میں برطانوی نقطہ نظر کے لئے دیکھئے:

B.C. Bamferd, *Histories of the Non-Cooperation and Khilafat Movements*, Delhi, 1925.

تحریک خلافت کے بارے میں خود ترکوں کے زاویہ نگاہ کے لئے ملاحظہ کریں، میم کمال اوکے، تحریک خلافت، مترجم، نثار احمد اسرار، کراچی، ۱۹۱۹ء۔

تحریک خلافت کے دوران بعض علماء نے فتویٰ جاری کیا کہ اگر مسلمان برطانوی حکومت سے لڑنے کی سکت نہیں رکھتے تو انھیں ہندوستان سے ہجرت کر جانی چاہیے۔ اس غیر دانش مندانہ فیصلہ کے باعث افغانستان کی طرف ہجرت کی ایک وسیع مہم شروع ہوئی جس میں کم وبیش اٹھارہ ہزار مسلمان اپنی جائیدادیں اونے پونے بیچ کر افغانستان روانہ ہو گئے۔[۷۲] تاہم افغانستان اس وقت خود سخت معاشی بدحالی کا شکار تھا اور مہاجرین کے اس عظیم بوجھ کو برداشت کرنے سے قاصر تھا۔ چنانچہ مہاجرین کی اکثریت کو سخت صعوبتیں اُٹھا کر واپس لوٹنا پڑا اور باقی ماندہ افراد یا تو راستے میں دم توڑ گئے یا شمالی افغانستان، ترکی اور روس میں منتشر ہو گئے۔[۷۳]

تحریک خلافت اپنے عروج پر تھی کہ ۵ فروری ۱۹۲۲ء کو ایک کانگریسی جلوس نے ضلع فرخ آباد، یو پی، کے ایک گاؤں چوراچوری میں ایک تھانے پر حملہ کر کے اسے آگ لگا دی جس سے بائیس اہل کار زندہ جل مرے۔ گاندھی جو مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی سیاسی قوت سے خائف ہو چکا تھا، نے موقع غنیمت جانا اور مسلم زعماء سے مشورہ کیے بغیر تحریک خلافت ملتوی کرنے کا اعلان کر دیا۔ مسلمانان ہند اس غیر متوقع فیصلے سے سخت مشتعل ہوئے اور انھوں نے یہ سمجھا کہ جب

۷۲- بحوالہ:

Aziz Ahmad, *Studies in Islamic Culture in the Indian Environment*, Oxford, 1964, p. 65.

۷۳- بحوالہ:

M. Naeem Qureshi, "The Indian Khilafat Movement, 1918-1924", *Journal of Asian History*, Vol. XII, No. 2 (Spring, 1978), p. 159.

تحریک ہجرت کی تفصیلات کے لئے دیکھئے:

M. Naeem Qureshi, "The Ulema of British India and the Hijrat of 1920", *Modern Asian Studies,* Vol. 13, Part-I (February, 1979), pp. 41-59; I.H. Qureshi, *Ulema in Politics*, Karachi, 1974, pp. 264-267.

سید دربار علی شاہ، مرتبہ، ہجرت افغانستان، لاہور ۱۹۷۷ اور راجہ رشید محمود، تحریک ہجرت (۱۹۲۰ء) ایک تاریخ ایک جائزہ، لاہور، ۱۹۸۶ء۔

مقصد حاصل ہونے والا تھا عین اس وقت گاندھی نے ان سے غداری کی اور ان کو برطانوی حکومت کے غیض و غضب کا نشانہ بننے کے لئے اکیلا چھوڑ دیا۔[۷۴] ابھی مسلمان اس صدمہ جانکاہ سے سنبھل نہ پائے تھے کہ خود ترکی کی قومی اسمبلی نے مارچ ۱۹۲۳ء میں خلافت کے ادارے کو ہی ختم کر ڈالا اور ترکی کو ایک جمہوریہ قرار دے دیا۔[۷۵] خلافت کے مسئلہ پر اتنی جاندار تحریک چلانے اور ان گنت مصائب برداشت کرنے کے بعد خود ترکوں کے ہاتھوں اس ادارے کے خاتمے پر مسلمان انتہائی یاس و پژمردگی کا شکار ہو گئے اور آئندہ آنے والے کئی سالوں تک ان میں کسی تحریک کو

۷۴۔

Donald N. Wilber, *Pakistan: Yesterday and Today*, NewYork, 1964, p. 95.

گاندھی کے سیاسی نظریات و خدمات اور شخصی جائزے کے لئے دیکھئے:

Panderel Moon, *Gandhi and Modern India*, New York, 1962; G.M. Dhawan, *The Political Philosophy of Mahatama Gandhi*, Bombay, n.d.; C.F. Andrews, *Mahatama Ghandi's Ideas including Selections from his Writings*, London, 1930; G.D. Brila, *In the Shadow of Mahatama, Bomboy*, 1953; B.R. Nanda, *Mahatama Gandhi*, London, 1948; Peyarelal, *Mahatama Gandhi: The Last Phase*, Two Vols., Ahmadabad, 1958-60; M.K. *Gandhi, An Autobiography or the Story of My Experiments with Truth,* 2 Vols., Ahmadabad, 1927-9; J.B. Kripalaw, *Gandhi: His Life and Thought, New Delhi,* 1970; D.G. Tendulkar, *Mahatama*, 8 Vols., Bomboy, 1960-3; Ved Mehta, *Gandhi and His Apostles*, New York, 1978; Erik H. Erikson, *Gandhi's Truth: On the Origin of Militant Non Violence,* New York, 1969; Dharanjay Keer, *Mahatma Gandhi: Political Saint and Unarmed Prophet*, Bomboy, 1973.

۷۵۔ بحوالہ:

Bernard Lewis, *The Emergence of Modern Turkey*, London, 1961, pp. 285-95.

پروان چڑھانا ناممکن ہو گیا۔[۷۶]

تحریک خلافت کے اچانک خاتمہ سے جن بدگمانیوں نے جنم لیا تھا ان سے ہندو مسلم اتحاد پارہ پارہ ہو کر رہ گیا اور ہر آنے والا دن نت نئے ہنگاموں کا پیش خیمہ بن گیا اور ہندو اکثریت کے تعصب اور تنگ نظری کے بے شمار مظاہرے دیکھنے میں آئے۔ خصوصاً ہندو مہا سبھا نے، جو بنیادی طور پر ۱۹۲۱ء میں ہندوؤں کی سماجی فلاح و بہبود کے لئے قائم کی گئی تھی، یکا یک ایک جارحیت پسند ہندو تنظیم کا روپ دھار لیا اور اپنے صدر وی۔ ڈی۔ ساورکر (۱۸۸۳ء۔۱۹۶۶ء) کی قیادت میں مسلم کش اقدامات پر کمر بستہ ہو گئی۔[۷۷] 'شدھی' کی تحریک، جس کا مطمح نظر برصغیر کے غیر ہندوؤں

۷۶- اس وقت کے مسلم سیاست کے ایک اجمالی جائزے کے لئے متعلقہ ابواب دیکھیں:

Syed Razi Wasti, *The Political Triangle In India, 1858-1924,* Lahore, 1976.

۷۷- ہندو مہاسبھا کی تشکیل اور مقبولیت کے عوامل کے لئے دیکھئے:

Donald E. Smith, *India as a Secular State*, Princeton, 1963, pp. 455-64; Indra Prakasha, *Hindu Mahasabha: Its Contribution in India's Politics,* New Delhi, 1966; Bruce E. Cleghorn, "Religion and Politics: The Leadership of the All India Hindu Mahasabha", in B.N. Pandey, ed., *Leadership in South Asia*, New Delhi, 1977, pp. 395-425; and N.C. Chatterjee, *The Message of the Mahasabha Collection of Speeches and Addresses*, Calcutta, 1944.

ہندو مہا سبھا کے صدر ساورکر کے سیاسی رجحانات کے لئے ملاحظہ ہو:

A.S. Bhide, ed., *Vee Savarkar's Whirlwind Propoganda*, Bomboy, 1941; and V. D. Savarkar, *Hindu Rashra Dharma: A Collection of Presidential Speeches Delivered from the Hindu Mahasabha Platform*, Bomboy, 1949.

ہندو مہا سبھا کی دیکھا دیکھی دوسری مسلم کش تنظیمیں بھی وجود میں آ گئیں، جس میں راشٹریہ سیوک سنگھ (آر ایس ایس) سب سے نمایاں تھی۔ مزید تفصیلات کے لئے دیکھئے:

N.A.J. Curran, *Militant Hinduism in Indian Politics: A Story of the R.S.S.*, New York, 1951.

کو ہندو بنانا تھا، مہاسبھا کے سیاسی پروگرام کا طرہ امتیاز بن گئی اور جلد ہی 'سنگھٹن' کی تحریک بھی وجود میں آئی جس کے تحت ایسے مراکز قائم کئے جاتے تھے جہاں ہندو نوجوانوں کو لاٹھیوں اور خنجروں کا استعمال سکھا کر مسلمانوں پر حملے کے لئے ابھارا جاتا تھا۔[۷۸]

ان پُرتشدد کارروائیوں کے علاوہ مسلمانوں پر ہندوؤں کا سماجی دباؤ بھی بڑھتا گیا۔ ان کے بارے میں بے سروپا حکایات اور روایات پھیلائی جانے لگیں جن میں ان کو غیر ملکی، حملہ آور، ڈاکو، اغوا کنندہ اور جرائم پیشہ ظاہر کیا جاتا۔ ان کی تاریخ کو مسخ انداز میں پیش کیا جاتا اور ان کی تاریخی یادگاروں کو ہندو دور کی تعمیرات قرار دیا جاتا۔ اس کے علاوہ ان کے معاشی و معاشرتی مقاطعے کی مہم بھی اپنے عروج پر تھی۔ ان تمام عوامل کی بناء پر ہندو مسلم فسادات زور پکڑ گئے جس میں فساد ملتان (۱۹۲۲ء) اور فساد کوہاٹ (۱۹۲۴ء) کو عالم گیر شہرت ملی۔[۷۹] ۱۹۲۴ء کے عام انتخابات میں ہندو مہاسبھا کی نمایاں کامیابی نے ہندو جاتی کا یہ فیصلہ عیاں کر دیا کہ وہ متحدہ قومیت کا پرچار کرنے کے باوجود دل سے ہندو قوم کے غلبے اور رام راج کے قیام کی خواہاں ہے۔ اس پُرفتن دور میں مسلمانانِ ہند اپنی کوئی متحدہ سیاسی حکمت عملی تشکیل نہ دے سکے اور لے دے کر پنجاب میں سر میاں فضل حسین (۱۸۷۷ء۔۱۹۳۶ء) نے ذاتی طور پر مسلمانوں کی معاشی و تعلیمی ترقی کی طرف کچھ توجہ دی مگر سیاسی میدان میں ان کی قائم کردہ یونینسٹ پارٹی، مسلم قومیت کی بجائے ہندو مسلم جاگیرداروں

۷۸۔ 'شدھی' اور 'سنگھٹن' کے تفصیلی مطالعے اور مسلمانوں کے بارے میں ان کے رویوں کے بارے میں دیکھئے:

I.H. Qureshi, *The Muslim Community of the Indo-Pakistan Subcontinent,* The Hague, 1962, pp. 280-84; V.D. Savarkar, *Hindu Sanghaten*, Bomboy, 1940; and N.V. Damle, ed., *Hindu Sanghaten: Its Ideology and Immediate Programme*, Bombay, 1940.

۷۹۔ ہندو مسلم فسادات کے اسباب و سیاسی نتائج کے بارے میں دیکھئے:

Ratish Mohan Agarwala, *The Hindu-Muslim Riots: Their Causes and Cures*, Lucknow, 1943.

کے اقتصادی مفادات کی ہی وکالت کرتی رہی۔[۸۰]

ہندوستان کی سیاسی صورتحال میں ایک نئی تبدیلی اس وقت آئی جب ہندو مہا سبھا نے جداگانہ انتخاب کے خلاف اپنی مہم تیز کر دی اور ۱۹۲۷ء میں ایک ہندو ممبر نے ایوان بالا میں اس طریقہ انتخاب کے خلاف ایک باقاعدہ قرارداد بھی پیش کر دی۔ اس پر کانگریسی زعماء نے قائداعظم محمد علی جناح (۱۸۸۶ء۔۱۹۴۸ء)، جو اس وقت مسلمانان ہند کی قیادت سنبھال چکے تھے، سے رابطہ کر کے پیش کش کی کہ اگر مسلمان جداگانہ انتخابات کو ترک کر دیں تو کانگریس ان کے تمام دیگر مطالبات تسلیم کر لے گی۔ قائداعظم نے اس پیش کش پر کئی مسلم رہنماؤں سے صلاح مشورہ کیا اور مخلوط انتخابات کو چند شرائط پر ترک کرنے پر آمادگی ظاہر کی۔ یہ شرائط تجاویز دہلی کے نام سے ۱۹۲۷ء میں شائع ہوئیں جن میں سندھ کو بمبئی سے علیحدہ کرنا، صوبہ سرحد اور بلوچستان کو دوسرے صوبوں کے مساوی آئینی درجہ دینا، پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کو ان کی آبادی کے تناسب سے نمائندگی دینا اور مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کے لئے ۳/۱ نشستوں کا حصول شامل تھا۔[۸۱] مسلم

۸۰- میاں فضل حسین کی حیات و خدمات کے لئے دیکھئے:

Nur Ahmad, *Mian Fazal-i-Hussain: A Review of His Life and Work*, Lahore, 1936; and Azim Hussain, *Fazal-i-Husain: A Political Biography,* Bombay, 1946.

۸۱- تفصیلات کے لئے دیکھئے:

Abdul Hamid, *op.cit.*, pp. 193-195.

قائداعظم کی حیات و خدمات کی تفصیلات کے لئے دیکھئے:

M.H. Saiyid, *The Sound of Fury: A Political Study of Muhammad Ali Jinnah*, New Delhi, 1981; M.M. Saleem Qureshi, *Jinnah and the Making of Nation*, Karachi, 1960; Hector Bolitho, *Jinnah: Creator of Pakistan,* London, 1954; Ahmad Hasan Dani, ed., *World Schoars on Quaid-i-Azam Muhammad Ali Jinnah*, Islamabad, 1979; Jamil-ud-Din Ahmad, ed., *Speeches and Writings of Mr. Jinnah*, 2 Vols., 1960-64; S.S. Prizada, *Quaid-i-Azam Jinnah's Correspondence*, Karachi, 1966; and Khalid Bin Sayed, 'The Personality of Jinnah and His Political Strategy' in C.H. Philips and M.D. Wainwright, eds., *The Partition of India: Policies and Perspectives, 1935-1947*, London, 1970, pp. 276-94.

رہنماؤں کی یہ عظیم فراخ دلانہ پیش کش بھی ہندوؤں کے دلوں کو موم نہ کر سکی۔ کانگریس نے ابتداءً ان تجاویز کا خیر مقدم کیا اور چھ مہینے ان کے مختلف پہلوؤں پر بحث کرتے گزار دیئے مگر انجام کار ان کو تسلیم کرنے سے صاف مکر گئی۔ دوسری طرف تجاویز دہلی کی حمایت اور مخالفت میں خود مسلم لیگ، دو دھڑوں میں منقسم ہو گئی۔ ایک دھڑا، جس کی سربراہی قائد اعظم کر رہے تھے، تجاویز دہلی کا حامی تھا اور کانگریس کے ساتھ تعاون کرنا چاہتا تھا جب کہ دوسرا گروہ جس کی قیادت سر میاں محمد شفیع (۱۸۶۹ء۔۱۹۳۲ء) کر رہے تھے ہندوؤں کو ناقابل اعتماد گردانتا تھا اور اکثریت کے ظلم و ستم سے بچنے کے لئے جداگانہ انتخاب کو ناگزیر سمجھتا تھا۔[۸۲]

ابھی یہ اختلافات طے نہ ہوئے تھے کہ نومبر ۱۹۲۷ء میں برطانوی حکومت نے سر جان البروگ سائمن (۱۸۷۳ء۔۱۹۵۴ء) کی قیادت میں ایک آئینی کمیشن قائم کر دیا جس کو آئینی اصلاحات کے سلسلے میں ہندو مسلم اختلافات کو ختم کرنے کے لئے ٹھوس تجاویز پیش کرنے کا فریضہ سونپا گیا۔ نہ صرف یہ کہ اس کمیشن میں کوئی ہندوستانی شامل نہ کیا گیا بلکہ عذر گناہ بدتر از گناہ کے مصداق لارڈ فریڈرک برکن ہیڈ (۱۸۷۲ء۔۱۹۳۰ء)، وزیر اُمور ہند نے برملا اعلان کر دیا کہ ہندوستانی اس قابل نہیں کہ ایک متفقہ دستوری فارمولا پیش کر سکیں۔[۸۳] ہندوستانی قوم پرست رہنما اس بیان پر سخت سیخ پا ہوئے اور کانگریس اور دوسری قوم پرست جماعتوں بشمول مسلم لیگ کا وہ حصہ جس کی قیادت قائد اعظم کر رہے تھے، نے مل کر سائمن کمیشن کی تمام کاروائیوں کا بائیکاٹ کر دیا۔[۸۴]

بہر حال مسلم رہنماؤں کے ایک با اثر گروہ، جس کی رہنمائی میاں محمد شفیع کر رہے تھے، نے سائمن کمیشن سے تعاون کا فیصلہ کیا کیونکہ ان کی رائے میں اگر اس موقع پر کمیشن کے سامنے مسلم

۸۲- اس دور کے سیاسی حالات کے ایک ہم عصر مطالعے کے لئے دیکھئے:

J. Coatman, *India in 1926-27*, Calcutta, 1928.

۸۳- بحوالہ:

Syed Shamsul Hasan, "______*Plain Mr. Jinnah*, Karachi, 1976, p. 33.

۸۴- بحوالہ:

S. Abdul Lateef, *The Great Leader*, Lahore, 1946, p. 114.

موقف مناسب طریق سے پیش نہ کیا گیا تو مسلم مفادات کو شدید نقصان پہنچنے کے علاوہ وہ جداگانہ انتخابات سے بھی محروم ہو سکتے ہیں۔[۸۵]

اس نازک مرحلے پر کانگریس نے موقع غنیمت جانتے ہوئے تمام پارٹیوں کی ایک کانفرنس طلب کی تاکہ مستقبل کے آئینی ڈھانچے کا تصفیہ کرنے کے لئے متفقہ دستوری تجاویز پیش کی جاسکیں۔ مگر یہ کانفرنس دو مہینوں میں پچیس اجلاس منعقد کرنے کے باوجود کوئی ٹھوس لائحہ عمل تیار کرنے میں ناکام رہی جس پر گاندھی کی تجویز پر موتی لال نہرو (۱۸۶۱ء۔۱۹۳۱ء) کی قیادت میں ان مسائل پر غور کرنے کے لئے ایک کمیٹی قائم کی گئی جس نے تین ماہ کے اندر اپنی سفارشات نہرو رپورٹ، (۱۹۲۸ء) کے نام سے پیش کر دیں۔[۸۶] نہرو رپورٹ کی مرکزی

۸۵۔ بحوالہ:

Jahn Ara Shahnawaz, *Father And Daughter: A Political Autobiography*, Lahore, 1971, p. 85.

سائمن کمیشن نے تمام تر مخالفتوں کے باوجود اپنا کام جاری رکھا مگر اس کے ارکان کسی ٹھوس حل کی تلاش میں ناکام رہے اور اس کی مرتب کردہ رپورٹ کو تمام بااثر ہندوستانی سیاسی جماعتوں نے مسترد کر دیا۔ رپورٹ کے متن کے لئے دیکھئے:

Report of the Indian Statutory Commission (The Simon Commission), 1930, 2 Vols., I-*Survey*, II-*Recommendations*, London, 1930.

مزید تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو:

S.R. Bakshi, *Simon Commission and Indian Nationalism*, New Delhi, 1977,______, 'Simon Commission-A Case Study of Its Appointment', *Journal of Indian History*, Trivandrum, Vol. 50, No. 2, 1972, pp. 561-72; C.F. Andrews, *India and the Simon Report,* London, 1930.

۸۶۔ نہرو رپورٹ کے مکمل متن اور متعلقہ تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو:

All Parties Conference, Report of the Committee Appointed by the Conference to Determine the Principles for the Constitution of India, Allahabad, 1928,_______, *Supplementary Report of the Committee*, Allahabad, 1928; The Committee Appointed by the All-Parties Conference 1928, *The Nehru Report: An Anti-Separatist Manifesto,* reprint, New Delhi, 1975; Mushirul Hasan, 'Communalism in Indian Politics: A Study of the Nehru Report', *Indian Historical Review,* Vol. 4, No. 2, January 1978.

اساس مسلمانوں کے سیاسی تشخص کی نفی پر مبنی تھی اور اس کے ذریعے کانگریس ان مراعات سے بھی منحرف ہوگئی جن کو وہ پہلے میثاق لکھنؤ اور تجاویز دہلی کے ذریعے قبول کر چکی تھی۔ اس کا محور لسانی بنیادوں پر نئے صوبوں کی تشکیل کرنا تھا تا کہ مسلمان کسی بھی صوبے میں اکثریت کا دعویٰ نہ کر سکیں۔

ہر چند نہرو رپورٹ کے سیاق و سباق ہی سے عیاں تھا کہ ہندو اپنی اکثریت کے نشے میں کسی جائز اور معقول بات پر آمادہ نہ ہوں گے مگر قائد اعظم محمد علی جناح نے متفقہ ہندوستانی موقف پیش کرنے کے لئے نہرو رپورٹ میں کم از کم تین بنیادی ترامیم کرنے پر زور دیا تا کہ مسلمان بھی اس پر صاد کر سکیں۔ اول یہ کہ مرکزی مجلس قانون ساز میں مسلمانوں کے لئے ایک تہائی نشستیں مخصوص کر دی جائیں۔ دوم یہ کہ کم از کم دس سال تک پنجاب و بنگال کے مسلمانوں کو متناسب نمائندگی کی سہولت بہم پہنچائی جائے اور سوم یہ کہ باقی ماندہ اختیارات مرکز کی بجائے صوبوں کو دیئے جائیں۔ ہر چند یہ ترامیم انتہائی ناگزیر اور بے ضرر نوعیت کی تھیں مگر ان کو بھی رد کر دیا گیا۔ ان تجاویز کے مسترد کئے جانے پر ممتاز اچھوت رہنما بی۔آر۔امبیدکر (۱۸۹۱ء۔۱۹۵۶ء) کے بقول یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ ہندو مسلم اختلافات کی خلیج تو بہت وسیع نہ تھی تاہم اس کو پاٹنے کی کوئی خواہش موجود نہ تھی۔[۸۷]

379-404,______, 'All Parties Committee Report' and 'The Nehru Supplementary Report', *India Review*, Vol. XXX, No. 9, September 1928, pp. 625-7 and *ibid.*, Vol. XXX, No. 2, December 1928, p. 873; Tara Chand, *History of the Freedom Movement in India*, 4 Vols., New Delhi, 1961-72, Vol. IV, pp. 111-15; A.C. Banerjee, *Constitutional History of India*, 3 Vols., New Delhi, 1977-8, Vol. III, pp. 201-7; and S. Srinivas Iyengar, *Swaraj Constitution*, Madras, 1927.

رپورٹ کے مرتب موتی لال نہرو کے سیاسی خیالات سے آگہی کے لئے دیکھئے:

K.M. Pannikar and A. Parshad, *The Voice of Freedom: Selected Speeches of Pandat Motilal Nehru*, Bombay, 1961; B.R. Nanda, *The Nehrus: Motilal and Jawaharlal Nehru,* London, 1962; S.P. Chablani, ed., *Motilal Nehru: Essays and Reflections on His Life and Times,* New Delhi, 1961; and Ravider Kumar and D.N. Panigrahi ed., *Selected Works of Motilal Nehru*, Vol. I, New Delhi, 1982.

۸۷۔ بحوالہ :

B.R. Ambedker, *Pakistan or the Paritition of India*, Bombay, 1946, p. 304.

نہرو رپورٹ نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے سیاسی راستوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جدا کر دیا حتیٰ کہ وہ چند مسلم رہنما بھی جواب تک ہندو مسلم اتحاد پر یقین رکھتے تھے، دل شکستہ ہو کر بیٹھ رہے۔ ہندوؤں سے کسی بھی قابل عمل سمجھوتے کی تلاش میں قائداعظم محمد علی جناح نے ایک بار پھر مسلم مطالبات چودہ نکات (۱۹۲۹ء) کی صورت میں پیش کئے جو تمام اہم معاملات میں مسلم رائے عامہ کے ترجمان تھے مگر ہندو اکثریت نے مسلمان قوم کی یہ توقع، کہ وہ کسی باعزت تصفیہ کے ذریعے مستقبل کے وفاقی نظام حکومت میں باعزت زندگی بسر کر سکیں، بَر نہ آنے دی۔[۸۸]

ہندوستان میں ہندو مسلم اختلافات اپنے عروج پر تھے کہ برطانیہ میں لیبر پارٹی ۱۹۲۹ء میں منعقدہ انتخابات جیتنے کے بعد برسر اقتدار آ گئی۔ لیبر پارٹی ہمیشہ سے ہندوستانی سیاست میں گہری دلچسپی لیتی رہی تھی اور عموماً ہندو نقطہ نظر کی حمایت کرتی تھی۔ انتخابات جیتنے کے بعد اس نے تمام مؤثر ہندوستانی جماعتوں اور گروہوں کو دعوت دی کہ وہ لندن میں ایک گول میز کانفرنس میں شرکت کریں تا کہ خود وزیر اعظم برطانیہ جیمز ریمزے میکڈونلڈ (۱۸۶۶ء۔۱۹۳۷ء) ان کے درمیان اتفاق رائے کروانے کی کوشش کر سکیں۔[۸۹] یہ کانفرنس لندن میں ۱۲ نومبر ۱۹۳۰ء کو شروع ہوئی اور ۹ جنوری ۱۹۳۱ء تک اس کے اجلاس وقفہ وقفہ سے جاری رہے۔

۸۸- تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو، رئیس احمد جعفری، حیات محمد علی جناح، بمبئی، ۱۹۴۶ء، ص ۱۷۰-۱۷۵۔

چودہ نکات کے متن کے لئے دیکھئے:

Chaudhri Muhammad Ali, *The Emergence of Pakistan*, Lahore, 1983, pp. 22-23.

۸۹- بحوالہ:

K.K. Aziz, *The Making of Pakistan*, Lahore, 1986, p. 44.

گول میز کانفرنس منعقد کرانے کا سہرا اس وقت کے برطانوی وزیر اعظم جیمز ریمز میکڈونلڈ کے سر ہے جنھیں ہندوستانی سیاست سے گہری دلچسپی تھی، تفصیلات کے لئے دیکھئے:

Harold, Macmillian, *The Past Masters: Politics and Politicians, 1906-39,* London, 1975, pp. 79-95; and B. Shiva Rao, *India's Freedom Movement: Some Notable Figures,* Bomboy, 1972, pp. 98-106.

کانگریس نے گاندھی کی گرفتاری کی بنا پر اس کانفرنس میں شرکت نہیں کی مگر مہا سبھا ہندو ذہنیت کی کما حقہ نمائندگی کے لئے موجود تھی۔ مسلمانوں کے سرکردہ رہنما مثلاً سر آغا خان، سر شاہنواز، نواب حافظ احمد سعید چھتاری (۱۸۸۹ء۔۱۹۸۷ء)، مولانا محمد علی جوہر، میاں محمد شفیع اور قائداعظم محمد علی جناح اس کانفرنس میں شریک ہوئے اور مسلم مؤقف کو انتہائی صراحت سے پیش کیا۔[۹۰] مگر ۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء تک، جب علامہ محمد اقبال (۱۸۷۷ء۔۱۹۳۸ء) نے اپنا شہرہ آفاق خطبہ الٰہ آباد پیش کیا، اس وقت تک ہندوستان کے سیاسی مسائل کا کوئی جامع اور متفقہ حل تلاش نہیں کیا جا سکا تھا۔[۹۱]

۹۰- پہلی گول میز کانفرنس کی کارروائیوں کے متن کے لئے دیکھئے:

Indian Round Table Conference (First Session), London, 1931, Cmd. 3778, Reginald Coupland, *The Constitutional Problem in India*, 3 parts, Oxford, 1944, I, pp. 113-31; A.C. Banerjee, *Constitutional History of India*, 3 Vols., Delhi, 1977-78, III, pp. 98-112,______,*Indian Constitutional Documents*, 3 Vols., Calcutta, 1961, III, pp. 226-43, A.B. Keith, *A Constitutional History of India*, Oxford, 1936, pp. 294-318; and Gwyer and Appadorai, *Speeches and Documents on the Indian Constitution, 1921-47,* 2 Vols., Oxford, 1957, I, pp. 225-41.

نیز دیکھئے:

John Coatman, *Years of Destiny: India, 1926-1932*, London, 1932.

۹۱- خطبہ الٰہ آباد تک جاری ہونے والی اہم سیاسی و آئینی دستاویزات کے لئے دیکھئے:

Jamil-ud-Din Ahmad, *Historic Documents of the Muslim Freedom Movement*, Lahore, 1970; K.K. Aziz, *The Historical Background of Pakistan, 1857-1947, An Annotated Digest of Source Material*, Karachi, 1970; Christine Dobbin, *Basic Documents in the Development of Modern India and Pakistan, 1835-1947*, London, 1969; Rais Ahmad Jafri, comp., *Rare Documents*, Lahore, 1967;

and M. Gwyer and A. Appadori, *Speeches and Documents on the Indian Constitution, 1921-41*, Vol. I, London, 1957. C.U. Aitchison, comp., *A Collection of Treaties, Engagements and Sunuds Relating to India and the Neighbouring Countries*, Calcutta, 1929-31, 14 Vols.

زیر بحث دور میں کام کرنے والی اہم سیاسی جماعتوں، انتظامی و آئینی ارتقا اور سیاسی واقعات کے اجمالی جائزے کے لئے ملاحظہ ہو:

J.N. Farquhar, *Modern Religious Movements in India*, Delhi, 1967; B.B. Misra, *The Indian Political Parties: An Historical Analysis of Political Behaviour up to 1947,* Delhi, 1978; John Cumming, ed., *Political India, 1832-1932*, London, 1932; Arthur Berriedale Keith, *A Constitutional History of India, 1600-1937*, Allahabad, 1961; Bankey Bihari Misra, *The Administrative History of India, 1834-1947*, New Delhi, 1970; Mujumdar, *History of Indian Social and Political Ideas from Ram Mohan to Dayanand*, Calcutta, 1967; Manoranjan Jha, *Role of Central Legislature in the Freedom Struggle*, New Delhi, 1972; Biamanbehari Majumdar, *Indian Political Associations and Reform of Legislatures, 1818-1917*, Calcutta, 1967; A.C. Banerjee, *Constitutional History of India*, 3 Vols., Delhi, 1977-78; M.V. Pylee, *A Short Constitutional History of India*, Bomboy, 1967; Sri Ram Sharma, *A Constitutional History of India, 1765-1954*, Bomboy, 1954; and Lionel Curtis, *Dyarchy: Papers Relating to the Application of the Principle of Dyarchy to the Government of India,* Oxford, 1920.

زیر مطالعہ دور میں ہندی مسلمانوں کی سیاسی نشوونما، ان کے علیحدہ احساس قومیت کے فروغ اور برطانوی حکومت و اہل دانش کے ان کے بارے میں رویوں کے مطالعے کے لئے دیکھئے:

Ram Gopal, *Indian Muslims: A Political History, 1858-1947,* Bombay, 1964; Mushir-ul-Haq, *Muslim Politics in Modern India, 1857-1947*, Meerut, 1970; Hafeez Malik, *Muslim Nationalism in*

India and Pakistan, Lahore, 1979; Lini S. May, *The Evolution of Indo-Muslim Thought After 1857*, Lahore, 1970; Khawaja Jamil Ahmad, *Britain and Muslims: A Historical Review,* Karachi, 1971; K.K. Aziz, *Britain and Muslim India*, London, 1963; J.S. Greival, *Muslim Rule in India: The Assessment of British Historians,* London, 1970; Rafiq Zahria, *Rise of Muslims in Indian Politics: An Analysis of Developments from 1885 to 1906,* Bomboy, 1970; Aziz Ahmad, *Islamic Modernism in India and Pakistan, 1857-1965*, London, 1967; S.M. Ikram, *Modern Muslim India and the Birth of Pakistan (1858-1951)*, Lahore, 1965; and Moin Shakir, *Khilafat to Partition: A Survey of Major Political Trends Among Indian Muslims During 1919-1947,* New Delhi, 1970.

II

بیسویں صدی کی تیسری دھائی میں آل انڈیا مسلم لیگ اپنی تاریخ کے نازک ترین دور سے گذر رہی تھی۔ مرکزی خلافت کمیٹی اور آل پارٹیز مسلم کانفرنس کے قیام نے پہلے ہی اس سے مسلمانان ہند کی واحد نمائندہ سیاسی تنظیم ہونے کا اعزاز چھین لیا تھا اور اس کی سیاسی ساکھ کو مزید نقصان اس وقت پہنچا، جب ۱۹۲۷ء میں تجاویز دہلی کی حمایت اور سائمن کمیشن سے تعاون کے سوال پر یہ کلکتہ لیگ اور لاہور لیگ نامی دو حصوں میں بٹ کر رہ گئی۔ ہر چند یہ دونوں دھڑے مارچ ۱۹۳۰ء میں پھر سے متحد ہو گئے مگر سیاسی افق پر مسلم لیگ کی سرگرمیاں محدود سے محدود تر ہوتی چلی گئیں۔ ۱۹۲۹ء میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس ہی منعقد نہ ہو سکا اور ۱۹۳۰ء میں سال بھر اس کی کونسل کے صرف چار عمومی اور ایک ہنگامی اجلاس منعقد ہوئے۔[۹۲]

مسلم لیگ کے اجلاسوں میں ممبران کی شرکت دن بدن کم سے کم ہوتی چلی جا رہی تھی۔ اگرچہ ملک بھر میں دو ہزار سے زائد مسلم لیگ کے ممبر موجود تھے مگر کسی بھی اجلاس کے موقع پر پچھتر اراکین کا جمع ہو جانا بھی غنیمت سمجھا جاتا تھا اور لیگ کے رہنما اس تگ و دو میں تھے کہ کسی طرح دہلی سے پچھتر نئے ممبر بنائے جائیں تاکہ کورم کی کمی کے مسئلے پر قابو پایا

۹۲- آرکائیوز آف فریڈم موومنٹ (اے ایم ایف) جلد نمبر ۱۵۴ ص ۷۵- خوش قسمتی سے آل انڈیا مسلم لیگ برصغیر پاک و ہند کی وہ واحد سیاسی جماعت ہے جس کی دستاویزات، مطبوعات اور دفتری مسلیں سب سے زیادہ مکمل اور احسن طریق سے محفوظ ہیں۔ اس عظیم الشان ذخیرے میں مسلم لیگ کے سالانہ اجتماعات، سنٹرل اور ورکنگ کمیٹیوں اور مسلم لیگ کونسل کے اجلاسوں کی رودادیں، صدارتی خطبات، سالانہ جائزے، مختلف موقعوں پر جاری ہونے والے قواعد و ضوابط، دساتیر اور منشور، مرکزی دفتر اور ہندوستان کے مختلف حصوں میں قائم شدہ لیگ کی شاخوں کے مابین ہونے والی خط و کتابت وغیرہ کو علیحدہ علیحدہ موضوعات کے تحت پانچ سو سے زیادہ جلدوں میں محفوظ کر لیا گیا ہے۔ مزید برآں تین ہزار کے قریب طبع شدہ مواد کی بھی درجہ بندی کی گئی ہے۔ یہ بیش بہا ذخیرہ آرکائیوز آف فریڈم موومنٹ کے نام سے قائم شدہ جامعہ کراچی کے ایک خصوصی شعبہ میں محفوظ ہے اور اس کی نقول ملک کے نمایاں تحقیقی و علمی اداروں میں بھی موجود ہیں۔ اس مقالے میں قومی ادارہ برائے تحفظ دستاویزات، اسلام آباد میں موجود نقول سے استفادہ کیا گیا ہے۔

جا سکے۔[۹۳] جماعتی اُمور کے بارے میں مسلم لیگی حضرات کی عدم دلچسپی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ مسلم لیگ کے فرسودہ اور زائد المیعاد آئین میں تبدیلی کے لیے مسلم لیگ کونسل نے یکم مارچ ۱۹۳۰ء کو ایک کمیٹی قائم کی مگر سال بھر اس کا کوئی با مقصد اجلاس ہی نہ ہو سکا۔[۹۴] اسی طرح مسلم لیگ کے معتمد اعزازی، ڈاکٹر سیف الدین کچلو (۱۹۶۳ء۔۱۸۸۴ء) کی معیادِ عہدہ ۱۳؍دسمبر ۱۹۲۹ء کو ختم ہوگئی مگر کئی مہینوں تک ان کی جگہ کوئی دوسرا شخص منتخب نہ کیا جا سکا۔[۹۵] اس کے علاوہ مسلم لیگ کی مالی حالت بھی انتہائی دگرگوں تھی۔ مرکزی دفتر کے پاس نہ صرف کوئی فنڈ نہ تھا بلکہ الٹا وہ سینکڑوں روپے کا مقروض تھا۔ ۱۹۳۰ء میں پرزور درخواستوں اور کافی تگ و دو کے باوجود ممبران سے صرف ۸۸۷ روپے بطور چندہ جمع ہوئے اور مسلم لیگ کا کام قائداعظم کے فیاضانہ عطیات اور مسلم لیگ کے جوائنٹ سیکرٹری ایس ایم عبداللہ (۱۹۵۱ء۔۱۸۸۸ء) کے وقتاً فوقتاً دیئے جانے والے قرض حسنہ سے چلایا جاتا رہا۔[۹۶]

ان تمام وجوہات کی بنا پر لیگ کا سالانہ اجلاس منعقد کروانے میں اس امر کا خاص خیال رکھا جاتا تھا کہ مجوزہ مقام ایسا ہو جہاں تمام ممبران بہ سہولت پہنچ سکیں اور کورم باآسانی پورا ہو سکے۔ نیز مقامی احباب مہمانوں کے قیام و طعام اور سالانہ جلسے کے تمام تر اخراجات کے کفیل ہو سکیں۔

اس پُرآشوب دور میں آل انڈیا مسلم لیگ کو متحرک رکھنے اور سالانہ اجلاس منعقد کروانے میں جس ہستی نے سب سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا وہ مسلم لیگ کے آفس سیکرٹری سید شمس الحسن (۱۸۹۲ء-۱۹۸۱ء) تھے جنھوں نے مسلم لیگی راہنماؤں کی توجہ لیگ کے سالانہ اجلاس منعقد کروانے کی طرف مبذول کروائے رکھی اور پہلے لکھنؤ، پھر بنارس اور الٰہ آباد میں اس کے انعقاد کے عملی انتظامات کیے۔ چنانچہ اعزازی معتمد مسلم لیگ کی پیش کردہ سالانہ رپورٹ برائے ۱۹۳۰ء

۹۳- ایضاً، ص ۵۵-۵۶۔

۹۴- ایضاً، ص ۷۵-۷۶۔

۹۵- ایضاً، ص ۷۴۔

۹۶- ایضاً، ص ۷۶۔

میں اس حقیقت کا برملا اعتراف کیا گیا تھا کہ اگر شمس الحسن حوصلہ مندی اور استقلال کا مظاہرہ نہ کرتے تو مسلم لیگ کے دفاتر عرصہ دراز سے بند ہو چکے ہوتے۔[۹۷]

خوش قسمتی سے انھیں مولوی محمد یعقوب (۱۸۷۹ء-۱۹۴۲ء) جیسے پرخلوص مسلم لیگی رہنما کی سرپرستی حاصل ہوگئی تھی جو ۱۹۳۰ء میں مسلم لیگ کے اعزازی معتمد کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے تھے۔[۹۸] چنانچہ ان دونوں بزرگوں کی مشترکہ مساعی سے آل انڈیا مسلم لیگ اس قابل ہوسکی کہ تمام تر مشکلات کے باوجود اپنا سالانہ اجلاس منعقد کروا سکے۔

۹۷- ایضاً، ص ۷۷۔ سید شمس الحسن کے والد ڈاکٹر امیر حسن بریلی میں مقیم تھے جہاں وہ ۱۸۹۲ء میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے آگرہ سے میٹرک کیا اور کمرشل انسٹی ٹیوٹ سے ٹائپنگ اور شارٹ ہینڈ میں مہارت حاصل کی۔ ۱۹۱۴ء میں وہ سر وزیر حسن، معتمد مسلم لیگ کے ذاتی معاون کی حیثیت سے آل انڈیا مسلم لیگ کے دفتری عملہ میں شامل ہوئے۔ کچھ ہی عرصے کے بعد انھیں مرکزی دفتر میں آفس سیکرٹری مقرر کر دیا گیا اور تقسیم ہند تک وہ اسی عہدے پر فائز رہے۔ بعد میں وہ پاکستان مسلم لیگ کے مرکزی دفتر میں بھی کام کرتے رہے۔ تقسیم ہند کے موقع پر قائد اعظم نے اپنے ذاتی کاغذات شمس الحسن کے حوالے کر دیے جنھیں انھوں نے حالات کی دست برد سے محفوظ رکھا اور آج انھیں ذخیرہ شمس الحسن کے نام سے جانا جاتا ہے جس میں دس ہزار سے زائد دستاویزات شامل ہیں۔

مزید تفصیلات کے لیے دیکھئے خالد شمس الحسن، قائد اعظم کا ادھورا خواب، کراچی، ۱۹۹۱ء اور سید شمس الحسن، ...پلین مسٹر جناح، کراچی، ۱۹۷۶ء۔

۹۸- ڈاکٹر سیف الدین کچلو کی میعاد عہدہ ختم ہو جانے کے بعد کئی ماہ تک مسلم لیگ کا اعزازی معتمد منتخب کیا نہ جا سکا۔ فروری ۱۹۳۰ء میں قائد اعظم محمد علی جناح، جو اس وقت آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر تھے، نے مراد آباد سے مجلس قانون ساز کے رکن مولوی محمد یعقوب کو آئندہ انتخابات تک مسلم لیگ کے اعزازی معتمد کے فرائض انجام دینے پر مجبور کر دیا۔ بعد میں مسلم لیگ کونسل نے اپنے ایک اجلاس میں جو دہلی میں ۱۰ر فروری ۱۹۳۰ء کو منعقد ہوا، مولوی صاحب کی نامزدگی کی توثیق کر دی۔ (بحوالہ اے ایم ایف، جلد ۱۵۴، ص ۶۲-۶۳)۔

سر محمد یعقوب ۲۷ر اگست ۱۸۷۹ء کو مراد آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد محمد اسمٰعیل پیشہ وکالت سے وابستہ تھے اور مذہبی و علمی تحاریک خصوصاً ندوۃ العلماء سے گہری وابستگی رکھتے تھے۔ مولوی یعقوب، علی گڑھ کالج سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد مراد آباد ہی میں آبائی پیشہ سے منسلک ہو گئے اور ملکی اور شہری سیاست میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگے۔ ۱۹۰۸ء میں وہ آل انڈیا مسلم لیگ کے رکن بنے۔ بعد میں وہ میونسپل بورڈ مراد آباد کے غیر سرکاری صدر نشین منتخب ہوئے۔ ۱۹۱۳ء میں ان کی ملی خدمات کی بنا پر انھیں ایم او کالج علی گڑھ کا ٹرسٹی مقرر کیا گیا۔

۱۹۲۹ء میں چونکہ مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس نہ ہو سکا تھا اس لیے ۱۹۳۰ء کی ابتدا ہی سے اس کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ ۱۴ر مارچ ۱۹۳۰ء کو ہونے والے مسلم لیگ کونسل کے اجلاس میں ایک کمیٹی مقرر کی گئی جس کو لیگ کے سالانہ اجلاس کی مناسب تاریخ و مقام کے بارے میں سفارشات پیش کرنے کا کام سونپا گیا۔[99] دریں اثنا مسلمانان پونہ نے ایک جلسے میں منظور شدہ قرارداد کے ذریعے یہ پیشکش کی کہ مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس پونہ میں منعقد کیا جائے۔[100] ۱۸ جون ۱۹۳۰ء کو مولوی محمد یعقوب نے مسلم لیگ کونسل کے منتخب اراکین کے نام ایک مراسلہ بھیجا جس میں سائمن کمیشن کی سفارشات کی ممکنہ اشاعت کے پیش نظر مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کے انعقاد کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے اراکین سے ان کی آرا طلب کی گئیں تا کہ اس مسئلے کو مسلم لیگ کونسل کے جولائی ۱۹۳۰ء میں ہونے والے اجلاس میں طے کیا جا سکے۔[101] مولوی محمد یعقوب نے اس دقت کو بھی نمایاں کیا کہ عام حالات میں تو جولائی یا اگست کے مہینے ہی سالانہ اجلاس کے لیے موزوں رہتے مگر جولائی میں مرکزی قانون ساز اسمبلی کا اجلاس شملے میں طلب کیا گیا ہے جس کی وجہ سے جولائی میں سالانہ اجلاس کا انعقاد خارج از بحث ہے۔

۱۹۲۰ء میں وہ صوبائی قانون ساز کے رکن منتخب ہوئے اور بعد میں قانون ساز اسمبلی میں قائداعظم کی قائم کردہ آزاد پارٹی کے لیڈر چنے گئے۔ ۱۹۲۶ء میں یوپی مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس اور ۱۹۲۷ء میں کلکتہ میں منعقدہ آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کی صدارت کے فرائض انجام دیئے۔ ۱۹۲۹ء میں وہ آل انڈیا فلسطین کانفرنس بمبئی کے رکن منتخب ہوئے۔ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۵ء تک وہ آل انڈیا مسلم لیگ کے اعزازی معتمد کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے۔ ۱۹۳۸ء میں وہ کونسل آف سٹیٹ کے رکن مقرر ہوئے اور اپنے انتقال تک اسی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ انھوں نے ۲۳ر نومبر ۱۹۴۲ء کو وفات پائی۔ (بحوالہ عبدالرؤف عروج، رجال اقبال، کراچی، ۱۹۸۸ء ص ۳۴-۴۳۲)

۹۹- اے ایم ایف، جلد ۱۵۳، ص ۱۰۔

۱۰۰- دیکھیے: ممتاز مسلم لیگی رہنما ابراہیم ہارون جعفر کا خط مورخہ ۵ر اپریل ۱۹۳۰ء بنام سیکرٹری مسلم لیگ (بحوالہ: ایضاً ص ۵) اس دعوت کو مسلم لیگ کونسل کے اگلے اجلاس میں پیش کیا گیا مگر نامعلوم وجوہات کی بنا پر اسے قبول نہ کیا گیا۔

۱۰۱- ایضاً، ص ۱۰۔

دوسری طرف ستمبر میں ملک میں عام انتخابات ہو رہے ہیں جس کے باعث اگست میں کامیاب اجلاس منعقد کرنا نہایت مشکل ہو گیا ہے۔[۱۰۲]

اس مراسلے کے جواب میں لیگ کونسل کے اراکین نے مرکزی دفتر کو کیا تجاویز ارسال کیں، ان کی تفصیلات تو دستیاب نہیں مگر بنگال کے ممتاز مسلم رہنما سر عبدالحلیم عبدالحسین غزنوی (۱۹۵۳ء۔۱۸۷۶ء) نے ۲۸ر جون ۱۹۳۰ء کو مولوی محمد یعقوب کو مطلع کیا کہ چونکہ سائمن کمیشن کی تجاویز پہلے ہی چھپ چکی ہیں، اس لیے لیگ کا سالانہ اجلاس جلد از جلد منعقد کیا جانا چاہیئے تا کہ ان پر مفصل غور کیا جا سکے۔ اس ضمن میں انھوں نے تجویز پیش کی کہ لیگ کا سالانہ اجلاس قانون ساز اسمبلی کے اجلاس کے دوران ہی شملے میں منعقد کر لیا جائے۔[۱۰۳] اس بابت حتمی فیصلہ کرنے کے لیے مسلم لیگ کونسل کا اجلاس ۱۳ر جولائی ۱۹۳۰ء کو شملے میں ہوا جس میں تمام آراء و تجاویز پر غور کرنے کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ مسلم لیگ کا اکیسواں سالانہ اجلاس لکھنؤ میں ۱۶ اور ۱۷ راگست ۱۹۳۰ء کو منعقد کیا جائے۔[۱۰۴] اجلاس کی صدارت کے لیے طے پایا کہ بالترتیب علامہ محمد اقبال، سر سلطان احمد (۱۸۸۰ء۔۱۹۶۳ء)، مولوی ابوالقاسم فضل الحق (۱۸۷۳ء۔۱۹۶۲ء) اور صاحبزادہ سر عبدالقیوم (۱۸۶۳ء۔۱۹۳۷ء) کو دعوت دی جائے۔[۱۰۵]

ان فیصلوں کی روشنی میں قائداعظم جو اس مسلم لیگ کی صدارت کے فرائض انجام دے رہے تھے، نے علامہ اقبال کو لکھنؤ اجلاس کی صدارت قبول کرنے کے لیے اسی دن تار دے دیا مگر ۲۱ر جولائی ۱۹۳۰ء تک ان کی طرف سے کوئی جواب موصول نہ ہوا۔[۱۰۶] اس تاخیر پر اظہار تشویش کرتے ہوئے شمس الحسن نے مولوی محمد یعقوب کو ۲۱ر جولائی ۱۹۳۰ء کو تحریر کیا کہ اجلاس کے انعقاد کی تاریخیں بہت قریب آ رہی ہیں مگر ابھی تک علامہ اقبال کی طرف سے اس کی صدارت قبول کرنے کی اطلاع موصول نہیں ہوئی جس کے سبب ابھی تک دعوتی خطوط جاری نہیں ہو سکے جس

۱۰۲- ایضاً، ۴-۷۔

۱۰۳- ایضاً، ص ۱۱۔

۱۰۴- ایضاً، ص ۱۷۔

۱۰۵- ایضاً، ص ۱۶۔

۱۰۶- ایضاً۔

پر برما اور مدراس جیسے دور دراز کے علاقوں کے ممبران کو تنگئ وقت کی شکایت ہوگی۔[۱۰۷] انھوں نے اس امر کی بھی نشاندہی کی کہ انگریزی اور اُردو، دونوں زبانوں میں تین ہزار کے قریب دعوتی خطوط بھیجے جانے ہیں جن کو منزل مقصود تک پہنچنے میں بھی کافی وقت درکار ہوگا۔[۱۰۸] اسی نوعیت کا استفسار ایک اور لیگی کارکن اعجاز علی نے بھی مولوی محمد یعقوب کے نام اپنے ایک خط مورخہ ۲۰ر جولائی ۱۹۳۰ء میں کیا جس میں انھوں نے بتایا کہ انھوں نے آج سر ملک فیروز خان نون (۱۸۹۳-۱۹۷۰ء) سے بذریعہ فون معلوم کیا تھا کہ آیا علامہ اقبال نے لکھنؤ اجلاس کی صدارت کرنا منظور کر لی ہے، جس کے جواب میں فیروز خان نون نے اس بارے میں اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔ چنانچہ اس پر اعجاز علی نے مولوی محمد یعقوب سے پوچھا کہ آیا اس بارے میں قائداعظم نے ان کو کچھ اطلاع دی ہے۔[۱۰۹]

اسی طرح ۲۳ر جولائی ۱۹۳۰ء کی اشاعت میں روزنامہ انقلاب نے خبر دی کہ مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کی صدارت کے سلسلے میں علامہ اقبال سے خط و کتابت ہو رہی ہے مگر ابھی تک انھوں نے اس بارے میں کوئی حتمی فیصلہ نہیں کیا۔[۱۱۰]

علامہ اقبال کی طرف سے اجلاس لکھنؤ کی صدارت قبول کرنے کے بارے میں پہلی مستند اطلاع روزنامہ انقلاب کی ۲۶ر جولائی ۱۹۳۰ء کی اشاعت میں ملتی ہے جس میں کہا گیا تھا کہ علامہ نے وسط اگست میں لکھنؤ میں ہونے والے مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کی صدارت کرنے کی دعوت قبول کر لی ہے اور وہ آج کل صدارتی خطبہ لکھنے میں مصروف ہیں۔[۱۱۱] ۳۱ر جولائی ۱۹۳۰ء کو مولوی محمد یعقوب کا ایک کھلا خط تمام ممتاز اُردو اخبارات میں شائع ہوا جس میں علامہ اقبال کی

۱۰۷- ایضاً۔ ۱۰۸- ایضاً۔

۱۰۹- ایضاً، ص ۱۴-۱۵۔

۱۱۰- روزنامہ انقلاب (لاہور)، ۲۳ر جولائی ۱۹۳۰ء۔ روزنامہ انقلاب کے مدیران، مولانا غلام رسول مہر اور عبدالمجید سالک کو علامہ اقبال سے خاص تقرب حاصل تھا۔ وہ ان کے پاس اکثر حاضری دیا کرتے اور علامہ بھی اہم قومی معاملات کے بارے میں ان سے مشورہ کیا کرتے۔ اس قربت کی بنا پر علامہ کے بارے میں چھوٹی سے چھوٹی اطلاع بھی انقلاب میں خاص اہتمام سے شائع کی جاتی۔ اسی وجہ سے یہ روزنامہ اقبالیات کے اہم اور بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتا ہے۔

۱۱۱- انقلاب، ۲۶ر جولائی، ۱۹۳۰ء۔

جانب سے مسلم لیگ کے اجلاس لکھنؤ کی صدارت قبول کرنے کا باضابطہ اعلان کرتے ہوئے مسلمانوں سے درخواست کی گئی تھی کہ ہر گروہ اور خیال کے لوگ اس میں شریک ہوں اور ٹھنڈے دل سے حالات حاضرہ پر غور و خوض کرنے کے بعد اپنے متفقہ مطالبات کا اعلان مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے کریں۔[112]

لکھنؤ اجلاس کی مزید اہمیت واضح کرتے ہوئے مولوی محمد یعقوب نے کہا کہ ملک کے موجودہ نازک سیاسی حالات کی وجہ سے عموماً اور صوبہ سرحد کے مخدوش حالات کی وجہ سے خصوصاً جو اہم تبدیلیاں حکومت ہند کے دستور اساسی میں ہونے والی ہیں، نیز اس اختلاف رائے کی بدولت جو سائمن کمیشن رپورٹ اور مجوزہ گول میز کانفرنس کے متعلق پیدا ہو چکا ہے، لیگ کا یہ اجلاس اور زیادہ اہمیت کا حامل ہو گیا ہے۔[113]

آہستہ آہستہ لکھنؤ میں بھی سالانہ اجلاس کی تیاریوں نے زور پکڑنا شروع کر دیا۔ ۲۲ جولائی ۱۹۳۰ء کو لکھنؤ کے ممتاز لیگی رہنما احترام علی جو اجلاس کے انتظام و انصرام میں پیش پیش تھے، نے شمس الحسن کو اطلاع دی کہ مقام جلسہ کے بارے میں ۲۵ جولائی ۱۹۳۰ء کو صوبائی لیگ کونسل کے اجلاس میں غور کیا جائے گا اور حتمی فیصلہ ہوتے ہی مرکزی دفتر کو اطلاع دے دی جائے گی۔[114] ۲۵ جولائی ۱۹۳۰ء کو منشی احتشام علی کی طرف سے سیکرٹری مسلم لیگ کو تار کے ذریعے صوبائی لیگ کونسل کی طرف سے لکھنؤ میں سالانہ اجلاس منعقد کرنے کی رسمی منظوری کی اطلاع دی گئی۔[115] ۲۸ جولائی ۱۹۳۰ء کو احترام علی نے مزید اطلاع دی کہ استقبالیہ کمیٹی ۲۷ جولائی کو بن گئی ہے اور مرکزی دفتر کو ممبران لیگ کی فہرست بھیجنے کی درخواست کی تاکہ رسمی بلاوے کے ساتھ ساتھ خصوصی دعوتی خطوط لکھے جا سکیں۔[116]

۱۱۲- بحوالہ انقلاب، ۳۱ جولائی ۱۹۳۰ء۔

اس مراسلے کی اصل کاپی محررہ ۲۴ جولائی ۱۹۳۰ء کے لیے دیکھیے، اے ایم ایف، جلد ۱۵۳، ص ۲۰-۲۱۔

۱۱۳- ایضاً۔

۱۱۴- اے ایم ایف، جلد ۱۵۳، ص ۱۸۔

۱۱۵- ایضاً، ص ۱۹۔

۱۱۶- ایضاً، ص ۲۴۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علامہ اقبال کو ان تمام تیاریوں سے باخبر نہیں رکھا جا رہا تھا کیونکہ انھوں نے اپنے خط مورخہ یکم اگست ۱۹۳۰ء میں مولوی محمد یعقوب کو تحریر کیا کہ ''ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا کہ لکھنؤ میں آیا کوئی استقبالیہ کمیٹی بھی بن گئی یا نہیں۔ ہمیں ابھی تک اس بابت کوئی اطلاع نہیں دی گئی اور لوگ ہر طرح کے استفسارات کر رہے ہیں۔''[۱۱۷]

دریں اثنا ممتاز لیگی راہنماؤں نے مرکزی دفتر کو لکھنؤ اجلاس میں شرکت کی اطلاع دینی شروع کر دی۔ حکیم محمد شریف نے لاہور سے سیکرٹری مسلم لیگ کو اپنے خط محررہ ۲۸ رجولائی ۱۹۳۰ء کے ذریعے مطلع کیا کہ لاہور کے مندوبین علامہ اقبال کے ہمراہ ہی لکھنؤ پہنچیں گے۔[۱۱۸] حبیب الرحمٰن خان شیروانی (۱۸۶۷ء۔۱۹۵۰ء) نے اجلاس میں حاضری کی یقین دہانی کرواتے ہوئے اُمید ظاہر کی کہ اجلاس کے شرکا دوسرے مسلم سیاسی اجتماعات کی طرح نیم خام اور سراسر تجاویز پیش کرنے یا سیر کرنے کو ہی نصب العین نہ بنائیں گے بلکہ سیاسی راہنما ایسا لائحہ عمل پیش کریں گے جو موجودہ ہنگامہ خیز واقعات کے حسب حال ہوگا۔[۱۱۹] لکھنؤ کے محمد شوکت علی ایڈووکیٹ نے سیکرٹری مسلم لیگ کے نام اپنے خط مورخہ ۱۷ راگست ۱۹۳۰ء میں اس مر پر مسرت کا اظہار کیا کہ موجودہ بحران میں مسلم لیگ نے کچھ کر گزرنے کا بیڑا اُٹھایا ہے اور اپنی اور حکیم سید بشیر احمد کی خدمات پیش کرتے ہوئے یقین دلایا کہ وہ اجلاس کو کامیاب بنانے کے لیے ہر ذمہ داری بجالانے کے لیے تیار ہیں۔[۱۲۰]

خلیل قاضی نے تحریر کیا کہ میں اس جلسے کی اہمیت کو جانتا ہوں اور ضرورت کو سمجھتا ہوں، اس لئے حاضری کی کوشش کروں گا۔[۱۲۱] دیگر راہنماؤں میں سے ریاست دتیا کے دیوان سر عزیز الدین احمد قاضی (۱۸۶۱ء۔۱۹۴۰ء)، مولوی عبدالغنی آف مالدہ، محمد حسین جونپوری، طفیل احمد منگلوری (۱۸۶۸ء۔۱۹۴۶ء)، ایس ایم فضل الٰہی، سید اسد رضا آف پونہ وغیرہ نے علیحدہ علیحدہ خطوط کے ذریعے مرکزی دفتر کو لکھنؤ اجلاس میں شرکت کا یقین دلایا۔[۱۲۲]

۱۱۷- ایضاً، ص ۳۱۔

۱۱۸- ایضاً، ص ۲۵۔

۱۱۹- ایضاً، ص ۲۷-۲۸۔

۱۲۰- ایضاً، ص ۴۰۔

۱۲۱- ایضاً، ص ۳۶۔

۱۲۲- دیکھیے: ایضاً، ص ۲۶، ۲۹، ۳۰، ۳۲، ۳۶، ۴۶، ۴۷۔

۲/اگست ۱۹۳۰ء کو سالانہ اجلاس کی وجہ سے مسلم لیگ کا مرکزی دفتر بیس دنوں کے لیے لکھنؤ منتقل ہو گیا۔ شمس الحسن نے محکمہ ڈاک کو اس عارضی تبدیلی سے مطلع کرتے ہوئے استدعا کی کہ ۲۲/اگست تک موصول ہونے والے خطوط و منی آرڈر ۳۶۔ سرکلر روڈ لکھنؤ کے پتے پر ارسال کر دیئے جائیں۔[۱۲۳] لکھنؤ اجلاس کی تیاریوں کا ذکر کرتے ہوئے شمس الحسن نے مولوی محمد یعقوب کو ۴/اگست ۱۹۳۰ء کو تحریر کیا کہ ہندوستان بھر میں تمام ممبران کو دو ہزار کے قریب اُردو و انگریزی گشتی خطوط ارسال کر دیئے گئے ہیں جس میں انھیں لکھنؤ اجلاس میں شرکت کی دعوت دی گئی ہے۔ منشی اظہر علی ایڈووکیٹ کی سربراہی میں ایک استقبالیہ کمیٹی نے کام شروع کر دیا ہے اور گنگا پرشاد میموریل ہال کو سالانہ اجلاس کی جائے انعقاد کے طور پر چن لیا گیا ہے۔ نیز شہر میں تقسیم و چسپاں کرنے کے لیے ہینڈ بل اور پوسٹرز تیار کر لیے گیے ہیں۔ انھوں نے مزید مطلع کیا کہ مسلم لیگ کونسل کا اجلاس منشی احتشام علی کے گھر ۱۵/اگست ۱۹۳۰ء کو چار بجے شام کو ہوگا۔[۱۲۴]

۵/اگست ۱۹۳۰ء کی اشاعت میں مسلم لیگ کے لکھنؤ اجلاس کے حوالے سے روزنامہ انقلاب نے ایک اداریہ تحریر کیا جس میں اس امر کی تلقین کی گئی کہ وقت کی نزاکت، ملت کی پیچیدہ ضروریات اور اجلاس کی اہمیت کے پیش نظر، صدارت کے لیے علامہ اقبال جیسی موزوں ترین شخصیت کا انتخاب کیا گیا ہے اور اس یقین کا اظہار کیا کہ ان کے خطبہ کی روشنی میں مسلمانان ہند اپنے لیے بہترین لائحہ عمل تیار کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔[۱۲۵] ۶/اگست ۱۹۳۰ء کو مولوی محمد یعقوب نے ہندوستان بھر کے نمایاں اخبارات کے نام ایک اعلامیہ جاری کیا جس میں بتایا گیا تھا کہ لکھنؤ میں لیگ کے سالانہ اجلاس کی تیاریاں زوروں پر ہیں اور ممبران لیگ کو مشورہ دیا گیا تھا کہ وہ اپنی آمد کے متعلق مسلم لیگ کے دفتر واقع ۱۳۱۔ خیالی گنج، لکھنؤ کو ۱۴/اگست ۱۹۳۰ء تک مطلع کر دیں تاکہ ان کی حسب منشا رہائش کا بندوبست کیا جا سکے۔[۱۲۶]

۱۲۳- ایضاً، ص ۵۰۔ ۱۲۴- ایضاً، ص ۵۲۔ ۱۲۵- انقلاب ۵/اگست ۱۹۳۰ء۔

۱۲۶- اے ایم ایف، جلد ۱۵۳، ص ۵۴-۵۵۔

یہ اعلامیہ مندرجہ ذیل اخبارات کو جاری کیا گیا۔ سٹیٹس مین، مسلمان، جمہور (کلکتہ)، پانیر، لیڈر، سٹار (الہ آباد)، آئی ڈی ٹی، ہمت، حقیقت (لکھنؤ)، علی گڑھ میل (علی گڑھ)، ہندوستان ٹائمز، ملت، الامان، الجمعیت، جنرل نیوز (دہلی)، مسلم آؤٹ لک، ٹریبیون، سول اینڈ ملٹری گزٹ، انقلاب، زمیندار، سیاست (لاہور)، بمبئی کرانیکل اور خلافت (بمبئی)۔ اس کے علاوہ اس اعلامیہ کی کاپیاں علامہ اقبال اور قائد اعظم کی خدمت میں بھی روانہ کی گئیں۔

نیز اجلاس کی خصوصی اہمیت کے پیش نظر اور لیگ کے ممبران کی بھاری تعداد میں متوقع شرکت کے سبب، عام شرکاء کی خدمت میں استدعا کی گئی تھی کہ وزیٹرز کے لیے صرف چند نشستیں مخصوص کی گئیں ہیں جن کے ٹکٹ پندرہ، پانچ، اور دو روپے کے حساب سے دستیاب ہیں مگر جو صاحبان پہلے سے اپنی نشستیں مخصوص کروانا چاہتے ہیں، ان کو چاہیے کہ سیکرٹری مسلم لیگ کے نام درخواست جلد از جلد بھجوادیں۔[۱۲۷] مراسلے میں اس بات کی بھی وضاحت کردی گئی کہ اجلاس کی کاروائی میں حصہ لینے اور ووٹ دینے کا حق صرف ممبران لیگ کے لیے مخصوص ہوگا مگر لیگ کی ممبر شب ان تمام مسلمانوں کے لیے کھلی ہے جو اکیس سال کی عمر کے حامل ہیں یا گریجویٹ ہیں۔ چنانچہ جو اصحاب ممبر بننا چاہیں وہ ۱۵/اگست سے پہلے پانچ روپے داخلہ فیس اور چھ روپے سالانہ فیس ادا کر کے رکن بن سکتے ہیں۔[۱۲۸]

۶/اگست ۱۹۳۰ء کو مولوی محمد یعقوب کے نام اپنے ایک مکتوب میں شمس الحسن سالانہ اجلاس کی تیاریوں کی بابت مطلع کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''لکھنؤ میں تمام انتظامات مکمل ہو گئے ہیں۔ رات کو استقبالیہ کمیٹی کا اجلاس ہوا جس میں شہر کے تمام سربرآوردہ اصحاب شریک تھے۔ اس میں یہ طے پایا کہ مہمانوں کے طعام کے کل اخراجات استقبالیہ کمیٹی برداشت کرے گی۔ نیز کئی کوٹھیاں اور مکانات بھی مہمانوں کے قیام کے لیے حاصل کر لی گئیں ہیں۔''[۱۲۹]

آٹھ اور دس/اگست ۱۹۳۰ء کی اشاعتوں میں روزنامہ انقلاب نے اگست میں لکھنؤ میں ہونے والے آل پارٹیز مسلم کانفرنس اور مسلم لیگ کے جلسوں کی خبریں شائع کرتے ہوئے لکھا کہ ان اجتماعات سے مسلمانوں کے حقوق ومطالبات کا پُر زور اعادہ اور ان کے اتفاق واتحاد کا شاندار مظاہرہ کرنا مقصود ہے۔ چنانچہ ان دونوں جلسوں میں شریک ہونا ہر اس مسلمان کے لیے لازم ہے، جو لکھنؤ پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو۔[۱۳۰]

۱۲۷- ایضاً۔

۱۲۸- ایضاً۔

۱۲۹- ایضاً ص ۶۱۔

۱۳۰- انقلاب، ۸ اور ۱۰/اگست، ۱۹۳۰ء۔

ادھر لکھنؤ میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کی تیاریاں زور وشور سے جاری تھیں اور ادھر کانگریس اپنے گماشتوں کے ذریعے اس اجلاس کو ناکام بنانے کے لیے کوشاں ہو گئی۔ ان اطلاعات پر علامہ اقبال نے اظہار تشویش کرتے ہوئے مولوی محمد یعقوب کو یکم اگست ۱۹۳۰ء کو ایک خط تحریر کیا جس میں مسلم قوم پرستوں کے ذریعے کانگریسی رہنماؤں کی لکھنؤ اجلاس پر قبضہ کرنے کی سازشوں کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے زور دیا کہ جہاں تک ممکن ہو، لکھنؤ اجلاس پُر امن رکھا جائے اور اسے درہم برہم کرنے کے منصوبہ سازوں کی ممکنہ گڑ بڑ کے خلاف ہر ممکن احتیاط بروئے کار لائی جائے۔[۱۳۱] اس ضمن میں علامہ نے تجویز کیا کہ اگر ضرورت ہو تو اجلاس کا مقام تبدیل کر دیا جائے اور اگر مندرجہ بالا خدشے کا موہوم سا امکان بھی ہو تو لیگ کے سالانہ اجلاس کے لیے دہلی زیادہ موزوں جگہ رہے گی۔[۱۳۲]

اس کے علاوہ علامہ نے سالانہ اجلاس کی تاریخیں تبدیل کرنے کا بھی مشورہ دیتے ہوئے کہا کہ اگست کی بجائے اسے ستمبر کے اوائل یا درمیان میں بھی منعقد کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ موسم بھی اس وقت تک پہلے سے کچھ بہتر ہو جائے گا اور صوبہ پنجاب بھی پہلے سے زیادہ طاقتور وفد بھیجنے پر قادر ہو جائے گا۔[۱۳۳]

۴/ اگست ۱۹۳۰ء کو علامہ اقبال نے مولوی محمد یعقوب کو ایک اور خط لکھا جس میں انھوں نے تحریر کیا کہ سابقہ خط میں مذکورہ وجوہات کی بنا پر یہ مناسب ہوگا کہ سالانہ اجلاس اکتوبر تک، یعنی عام انتخابات کے مکمل ہونے تک ملتوی کر دیا جائے۔ جائے انعقاد کے بارے میں وضاحت کرتے ہوئے انھوں نے خیال ظاہر کیا کہ اگر دہلی مناسب جگہ نہ ہو تو یہ اجلاس لاہور میں بھی منعقد ہو سکتا ہے بشرطیکہ فیروز خان نون اور دوسرے حضرات اس معاملے میں دلچسپی لیں۔[۱۳۴] اس ممکنہ اعتراض کا جواب دیتے ہوئے کہ اکتوبر میں لیگ کا سالانہ اجلاس منعقد کرنے سے پہلی گول میز کانفرنس کے نامزد مسلم مندوبین اس میں شریک نہ ہو سکیں گے کیونکہ وہ اکتوبر کے پہلے ہفتہ میں

۱۳۱- اے ایم ایف، جلد ۱۵۳، ص ۳۱۔

۱۳۲- ایضاً۔ ۱۳۳- ایضاً۔

۱۳۴- سید مظفر حسین برنی مرتبہ، کلیات مکاتیب اقبال، جلد سوم، دہلی، ۱۹۹۳ء، ص ۸-۱۴۷۔ اے ایم ایف، جلد ۱۵۳، ص ۳۳۔

لندن کے لیے روانہ ہو رہے تھے، علامہ اقبال نے خیال ظاہر کیا کہ ان کی عدم شرکت سے کچھ فرق نہیں پڑے گا کیونکہ اجلاس کی قراردادیں انھیں بذریعہ تار بھی بھیجی جاسکتی ہیں اور امکان ظاہر کیا کہ شاید گول میز کانفرنس ایک ہفتہ سے زائد کے لیے ملتوی ہو جائے۔[۱۳۵] ظاہر ہے کہ لیگ کے دگرگوں مالی معاملات اور انتظامی مشکلات کے پیش نظر ان تجاویز پر عمل کرنا ناممکن تھا۔

۴راگست ۱۹۳۰ء ہی کو علامہ اقبال نے شمس الحسن کے نام ایک مراسلہ بھیجا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اپنے تمام تر ذہنی تحفظات کے باوجود علامہ لکھنؤ اجلاس میں شرکت کے لیے تیار تھے اور اسے کامیاب دیکھنے کے بھی متمنی تھے۔ اس خط میں علامہ نے شمس الحسن کو مشورہ دیا کہ پنجاب سے مدعو کیے جانے والے افراد کو مرکزی دفتر کی طرف سے علیحدہ علیحدہ تاکیدی خطوط لکھے جانے چاہئیں اور ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین (۱۸۸۷ء۔۱۹۵۵ء) سیکرٹری صوبائی مسلم لیگ لاہور کے نام بھی الگ تاکیدی خط ارسال کیا جائے تاکہ لاہور سے بہت سے حضرات شریک اجلاس ہوں۔ اور بیرونی شرکاء کے قیام و طعام کے انتظامات کے بارے میں بھی مفصل اطلاع شائع کی جائے۔[۱۳۶] اپنے اعزاز میں کسی قسم کی استقبالیہ تقریبات کی ممانعت کرتے ہوئے علامہ نے صراحتاً لکھا کہ ''مہربانی فرما کر ممبران استقبالیہ کمیٹی کی خدمت میں میری طرف سے عرض کیجیے کہ کسی قسم کے استقبال کی تیاری نہ کی جائے۔ میں اپنے پرانے دوست محمد وسیم بیرسٹر (۱۸۸۶ء۔۱۹۵۰ء) کے ہاں قیام کروں گا۔ چونکہ مجھے استقبال کا اندیشہ تھا، اس واسطے میں نے ان کو لکھا ہے کہ میرے لکھنؤ پہنچنے کے وقت سے کسی کو بھی آگاہ نہ کریں اور اسی شرط پر میں نے ان کے ہاں ٹھہرنا اور ان کا مہمان ہونا قبول کیا ہے۔''[۱۳۷] ان سطور سے عیاں ہے کہ علامہ اقبال مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کی صدارت کو ذاتی نام و نمود کی نمائش کا ذریعہ نہ سمجھتے تھے بلکہ اس کے ذریعے مسلمانوں کو پیام عمل دینے کے خواہش مند تھے۔

لکھنؤ کے مقامی مسلم لیگی رہنما بھی کانگریس کی ممکنہ شرپسندیوں سے بخوبی آگاہ تھے اور ان کے تدارک کے لیے تدابیر بھی کر رہے تھے۔ شمس الحسن نے مولوی محمد یعقوب کو لکھنؤ سے ارسال

۱۳۵- ایضاً۔

۱۳۶- اے ایم ایف، جلد ۱۵۳، ص ۳۴۔

۱۳۷- ایضاً۔

کردہ ۴ راگست ۱۹۳۰ء کے خط میں اطلاع دی کہ قوم پرست مسلمان تادمِ تحریر بہت زیادہ لاتعلق نظر آ رہے ہیں مگر یہ کہا جا رہا ہے کہ وہ لکھنؤ اجلاس کو درہم برہم کرنے کے خفیہ منصوبے بنا رہے ہیں۔ مگر جہاں تک میں اندازہ کر سکتا ہوں، یہ افواہ کے سوا کچھ نہیں۔[۱۳۸] ایک دوسرے مکتوب میں جو ۶ راگست ۱۹۳۰ء کو لکھا گیا، شمس الحسن نے مولوی محمد یعقوب کو مطلع کیا کہ کانگریس کے قوم پرست حامی عرصہ سے کوشش کر رہے ہیں کہ یہ جلسہ ملتوی کر دیا جائے مگر جلسے کے پُرامن انعقاد کا یقین دلاتے ہوئے شمس الحسن نے لکھا کہ مسلم لیگ کونسل میں ان کے ممبران کی تعداد نہایت کم کر دی گئی ہے، نیز ان کے بہت سے بااثر راہنما جیل میں ہیں۔ چونکہ اجلاس میں صرف اراکین ہی شرکت کر سکتے ہیں اس لیے جلسے میں کسی گڑبڑ کے اندیشہ کی گنجائش نہیں۔ وہ اگر شریک بھی ہوئے تو کیا کر سکتے ہیں۔[۱۳۹] مزید حفاظتی اقدام کے طور پر لکھنؤ اجلاس کے وزیٹر ٹکٹوں کی فروخت روک دی گئی کیونکہ اس بات کا اندیشہ تھا کہ مخالفین سو دو سو ٹکٹیں خرید کر غنڈہ عناصر کو جلسہ درہم برہم کرنے کے لیے نہ بھیج دیں۔[۱۴۰]

اس مراسلت سے یہ بات ظاہر ہے کہ لکھنؤ اجلاس میں اگر گڑبڑ کا کوئی اندیشہ موجود بھی تھا تو مقامی مسلم لیگی زعماء اس کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھے۔ مگر جلد ہی اجلاس کے انعقاد میں ایک دوسری رکاوٹ پیدا ہوگئی۔ ستمبر ۱۹۳۰ء میں ہندوستان بھر میں مرکزی اور صوبائی قانون ساز کونسلوں کے انتخابات ہو رہے تھے اور بڑے بڑے مسلمان راہنما اس کی تیاریوں میں مشغول تھے اور دور دراز کے علاقوں سے ان کا لکھنؤ آنا مشکل ہو گیا تھا۔ چنانچہ جلد ہی انتخابی گہما گہمی اور مصروفیت نے مختلف صوبوں کے مسلم لیگ رہنماؤں کو جلسہ کے التوا کی درخواستیں کرنے پر مجبور کر دیا۔ یہاں یہ امر تعجب خیز ہے کہ ہر چند اجلاس لکھنؤ کی تاریخوں کا اعلان بہت پہلے ہو چکا تھا مگر اس کو ملتوی کرنے کی سعی مقررہ تاریخ سے چند روز پیشتر ہی شروع ہوئی۔ ۶ راگست ۱۹۳۰ء کو شمس الحسن نے مولوی محمد یعقوب کو ایک خط کے ذریعے مطلع کیا کہ سر نواب محمد یوسف اور سر فیروز خان نون کے تار بابت التوائے لکھنؤ اجلاس ملے ہیں۔ ان کوششوں کی مخالفت کرتے ہوئے شمس الحسن نے لکھا کہ اس حالت میں جبکہ دو ہزار خطوط ممبران کو بطریق دعوت نامہ بھیجے جا چکے ہیں اور اجلاس کو

۱۳۸- ایضاً ص ۵۲۔ ۱۳۹- ایضاً ص ۶۱۔

۱۴۰- ایضاً۔

کامیاب بنانے کے لیے شہر میں ایک اچھا خاصہ پروپیگنڈا کیا جا چکا ہے، اجلاس کو ملتوی کرنا نہایت بدنامی کا باعث ہوگا۔[۱۴۱]

اس یقین کا اظہار کرتے ہوئے کہ اجلاس لکھنؤ نہایت کامیاب ہوگا، شمس الحسن نے رائے ظاہر کی کہ "سر ڈاکٹر شفاعت احمد خان (۱۸۹۳ء-۱۹۴۷ء) اور نواب محمد یوسف کو چاہیے تھا کہ اجلاس میں پرزور طریق سے شرکت کرتے، اس التوا کی کوشش میں اپنی قوت کو کمزور کرنے سے کیا فائدہ"۔[۱۴۲]

شمس الحسن نے صرف مولوی محمد یعقوب ہی کو خط لکھنے پر اکتفا نہ کیا بلکہ اسی دن یعنی ۶ر اگست ۱۹۳۰ء ہی کو قائداعظم اور نواب محمد یوسف کو بھی اس ضمن میں علیحدہ علیحدہ معروضے لکھے۔ قائداعظم کو ان کے نام نواب محمد یوسف کا تار برائے التوا لکھنؤ اجلاس ارسال کرتے ہوئے شمس الحسن نے انکشاف کیا کہ اسی قسم کے تار فیروز خان نون کی جانب سے لکھنؤ میں قیام پذیر مسلم لیگ کے ممتاز اراکین کو بھیجے گئے ہیں جن میں ان کو لیگ کے سالانہ اجلاس کو کسی بعد کی تاریخ تک ملتوی کروانے کے لیے اپنا اثر ورسوخ استعمال کرنے کی استدعا کی گئی ہے۔[۱۴۳] علامہ اقبال کے اس خط کا بھی حوالہ دیتے ہوئے، جس میں انھوں نے اس اندیشہ کا اظہار کیا تھا کہ قوم پرست حضرات لکھنؤ اجلاس کے ذریعے مسلم لیگ پر قبضہ نہ کرلیں، شمس الحسن نے خیال ظاہر کیا کہ فیروز خان نون اور نواب محمد یوسف بھی اسی اندیشہ کے پیش نظر لکھنؤ اجلاس کو ملتوی کروانا چاہتے تھے۔[۱۴۴] ان تمام خدشات کی نفی کرتے ہوئے شمس الحسن نے قائداعظم کو یقین دلایا کہ قوم پرست جماعت مسلم لیگ کونسل

۱۴۱- ایضاً، ص۶۲۔ نواب محمد یوسف جون پور کے ایک ممتاز صاحب ثروت تھے جو ملی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ وہ صوبائی اسمبلی کے ممبر اور بعد میں یو پی حکومت میں وزیر بھی رہے۔ ان کی رہائش گاہ الٰہ آباد کا دورہ کرنے والے ممتاز مسلم رہنماؤں کے قیام کے لئے استعمال ہوتی تھی۔ علامہ اقبال نے اپنے سفر الٰہ آباد ۱۹۳۰ء میں ان کی کوٹھی میں قیام کیا تھا اور ان ہی کے ہمراہ جلسہ گاہ میں پہنچے تھے۔

۱۴۲- ایضاً۔

۱۴۳- ایضاً، ص۶۵-۶۶۔

۱۴۴- ایضاً۔

میں نا قابل ذکر اقلیت میں ہے اور اس کے حامی یا تو لاتعلق ہیں یا جیل میں مقید ہیں اور ان سے استدعا کی کہ وہ علامہ اقبال، نواب محمد یوسف اور ملک فیروز خان نون پر زور دیں کہ وہ لکھنؤ اجلاس میں بلاخوف وخطر اپنی تمام تر قوت کے ساتھ شریک ہوں۔[۱۴۵]

نواب محمد یوسف کے نام خط میں شمس الحسن نے انھیں مطلع کیا کہ ''اجلاس کے لیے تمام انتظامات پوری تندہی سے جاری ہیں۔ تقریباً دو ہزار دعوت نامے ہندوستان کے مختلف علاقوں بشمول برما جاری کیے جا چکے ہیں۔ استقبالیہ مجلس قائم کر دی گئی ہے۔ فنڈ جمع کر لیے گئے ہیں۔ ہینڈ بل اور پوسٹرز تقسیم کیے جا رہے ہیں۔ ہندوستان کے مختلف علاقوں سے بہت سے ممبران لیگ نے اپنی آمد سے دفتر کو مطلع کر دیا ہے۔ علامہ اقبال نے اپنا صدارتی خطبہ تیار کر لیا ہے۔ ان حالات میں میری ناقص رائے میں التوا کا سوال بعد از وقت ہے۔''[۱۴۶] اس یقین کا اظہار کرتے ہوئے کہ لکھنؤ اجلاس ایک تاریخی کامیابی ہوگا، شمس الحسن نے اُمید ظاہر کی کہ نواب محمد یوسف اپنے احباب کے ہمراہ شریک جلسہ ہوں گے۔[۱۴۷]

دریں اثناء لکھنؤ اجلاس کو ملتوی کرنے کے حامی حضرات نے قائداعظم کو انتخابی مصروفیات کا عذر کر کے لکھنؤ اجلاس کے التوا کے لیے مجبور کرنا شروع کر دیا۔[۱۴۸] چنانچہ قائداعظم جو ۳ راگست ۱۹۳۰ء تک لکھنؤ اجلاس مقررہ وقت پر منعقد کرنے کے حامی تھے بلکہ ایک دن پہلے لکھنؤ پہنچنے کا عندیہ بھی دے چکے تھے۔[۱۴۹]

۱۴۵- ایضاً، یہاں علامہ اقبال کا ذکر بے محل معلوم ہوتا ہے کیوں کہ اپنے تمام تر خدشات کے باوجود انھوں نے لکھنؤ اجلاس میں شرکت سے انکار نہیں کیا تھا اور وہ اس کی صدارت کرنے کے لیے تیار بھی تھے۔

۱۴۶- ایضاً، ص ۶۵-۶۶۔

۱۴۷- ایضاً۔

۱۴۸- سر فیروز خان نون کے نام قائداعظم کے ایک خط محررہ ۱۱راگست ۱۹۳۰ء سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں ہر صوبہ سے درخواستیں موصول ہوئی تھیں کہ لکھنؤ اجلاس سر دست ملتوی کر دیا جائے۔ دیکھیے: ایضاً، ص ۶۴۔

۱۴۹- ۳راگست ۱۹۳۰ء کو قائداعظم نے الٰہ آباد کے ممتاز مسلم رہنما ڈاکٹر شفاعت احمد خان کو ایک خط تحریر کیا جس میں کہا گیا تھا کہ انھیں اس بات پر مسرت ہے کہ ڈاکٹر شفاعت ان حالات کی اہمیت کا ادراک رکھتے ہیں جن کے تحت مسلم لیگ کا لکھنؤ اجلاس منعقد ہو رہا ہے اور بتایا کہ وہ لکھنؤ ایک دن پہلے جا رہے ہیں جہاں وہ ڈاکٹر شفاعت سے ملاقات کی اُمید رکھتے ہیں۔ یہ خط غیر مطبوعہ حالت میں قومی عجائب گھر کراچی کے شعبہ تحریک پاکستان میں محفوظ ہے اور وہیں سے نقل کیا گیا ہے۔

نے ۶؍اگست ۱۹۳۰ء کو مولوی محمد یعقوب اور شمس الحسن کو علیحدہ علیحدہ تار دیے جن میں کہا گیا تھا کہ انھیں لکھنؤ اجلاس کے التوا پر کوئی اعتراض نہیں مگر مسلم لیگ کونسل کے اراکین سے مشورہ کر لیا جائے۔[۱۵۰] سالانہ اجلاس میں اپنی شرکت کے بارے میں مطلع کیا کہ وہ بمبئی الیکشن میں مصروف ہیں، شاید شریک نہ ہوسکیں اور خدشہ ظاہر کیا کہ کئی اور لوگ بھی انتخابات کی وجہ سے شریک جلسہ نہ ہوسکیں گے۔[۱۵۱]

تاہم التوائے جلسہ کی کوششوں سے عوام الناس، قومی پریس اور حتیٰ کہ علامہ اقبال بھی بے خبر تھے اور مقدور بھر لکھنؤ اجلاس کی تیاریاں کر رہے تھے۔ ۷؍اگست ۱۹۳۰ء کی اشاعت میں روزنامہ انقلاب نے اس بات پر تشویش کا اظہار کیا کہ ہندو سیاست دان اپنے مسلمان گماشتوں کی مدد سے لیگ کے اجلاس لکھنؤ کو تفرقہ پردازی کے لیے استعمال کرنا چاہتے ہیں اور یوپی کے مسلم رہنماؤں پر زور دیا کہ ان کوششوں کا مکمل سدباب کریں۔[۱۵۲] اخبار نے پنجاب و بنگال کے مسلمانوں پر خصوصیت سے زور دیا کہ وہ کثیر تعداد میں شریک اجلاس ہوں تاکہ کسی ناخوشگوار صورت حال سے بچا جا سکے۔[۱۵۳] ۸؍اگست کو ایک لیگی کارکن محمد ایوب نے شمس الحسن کو مطلع کیا کہ مسلم لیگ کے بلیٹن کی اُردو اور انگریزی کاپیاں تیار ہیں اور انھیں اُردو اور انگریزی اخبارات کے نام و پتے بھیج دیے جائیں تاکہ انھیں بلیٹن کی کاپیاں ارسال کی جا سکیں۔[۱۵۴] ۹؍اگست ۱۹۳۰ء کو علامہ اقبال نے سیکرٹری مسلم لیگ کے نام اپنے ایک مکتوب میں تحریر کیا کہ استقبالیہ کمیٹی نے جو فیصلے کیے ہوں، آپ پر لازم ہے کہ انھیں صوبہ پنجاب اور دیگر صوبوں کے اخباروں میں شائع کریں تاکہ لوگوں کو ضروری اطلاعات مل سکیں۔[۱۵۵] نیز علامہ نے اُمید ظاہر کی کہ پنجاب سے خاصی تعداد میں لوگ

۱۵۰- اے ایم ایف، جلد ۱۵۳، ص ۶۷-۶۸۔

۱۵۱- ایضاً۔

۱۵۲- انقلاب، ۷؍اگست ۱۹۳۰ء۔

۱۵۳- ایضاً۔

۱۵۴- اے ایم ایف، جلد ۱۵۳، ص ۶۹۔

۱۵۵- برنی، ایضاً، ص ۱۴۸۔ اے ایم ایف، جلد ۱۵۳، ص ۱۷۔

آ ئیں گے اور یہ استفسار کیا کہ مسلم لیگ کا اجلاس ۱۶ /اگست ۱۹۳۰ء کو کس وقت شروع ہوگا۔[۱۵۶]

۱۱/اگست ۱۹۳۰ء کو ممتاز مسلمان صحافی اور روزنامہ انقلاب کے مدیر غلام رسول مہر (۱۸۹۴ء-۱۹۷۱ء) نے سیکرٹری مسلم لیگ کو مطلع کیا کہ وہ لکھنؤ اجلاس میں ضرور شریک ہوں گے۔[۱۵۷] اسی طرح ۱۲/اگست ۱۹۳۰ء کی اشاعت میں روزنامہ انقلاب نے اجلاس لکھنؤ کے التوا کی افواہوں کی تردید کرتے ہوئے لکھا کہ مسلم لیگ کا اجلاس مقرر وقت پر منعقد ہوگا۔[۱۵۸]

درحقیقت لکھنؤ اجلاس کو ملتوی کرنے کا فیصلہ ۹/اگست سے ۱۲/اگست تک چند دنوں میں طے پایا جب شمس الحسن اور مولوی محمد یعقوب پر لکھنؤ اجلاس ملتوی کرنے کے لیے دباؤ بے حد بڑھ گیا۔ ۹/اگست ۱۹۳۰ء کو فیروز خان نون نے مولوی محمد یعقوب کو ایک ٹیلی گرام بھیجا جس میں کہا گیا تھا کہ مسلم کانفرنس کا وسط اگست میں لکھنؤ میں ہونے والا اجلاس ملتوی کر دیا گیا ہے چنانچہ وہ بھی اکتوبر کے پہلے ہفتے تک مسلم لیگ کا اجلاس ملتوی کر دیں کیونکہ انتخابات کی وجہ سے مسلمانان پنجاب کے لیے لکھنؤ آنا ناممکن ہے اور اگر لیگ اور کانفرنس کے اجلاس علیحدہ علیحدہ منعقد ہوئے تو مسلمانوں کی قوت اتحاد متاثر ہوگی۔[۱۵۹]

۱۵۶- ایضاً۔

۱۵۷- اے ایم ایف، جلد ۱۵۳، ص ۷۵۔

۱۵۸- انقلاب، ۱۲/اگست ۱۹۳۰ء۔

۱۵۹- اے ایم ایف، جلد ۱۵۳، ص ۷۰۔ ملک فیروز خان نون ۷/مئی ۱۸۹۳ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم ایچی سن کالج لاہور میں پائی۔ پھر اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے آکسفورڈ چلے گئے۔ وطن واپسی پر ۱۹۱۷ء میں پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور ۱۹۲۶ء تک اسی حیثیت سے قومی خدمات انجام دیتے رہے۔ جب پنجاب میں زمیندار پارٹی برسر اقتدار آئی تو وہ پہلے وزیر لوکل سیلف گورنمنٹ (۱۹۲۷ء-۱۹۳۱ء) اور بعد میں وزیر تعلیم (۳۰-۱۹۳۱ء) مقرر ہوئے۔ ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۱ء تک ملک فیروز خان برطانیہ میں ہندوستان کے ہائی کمشنر رہے۔ وطن واپسی پر وہ گورنر جنرل کی مجلس عامہ کے ممبر (۴۰-۱۹۴۱ء) اور پھر ممبر دفاع (۱۹۴۲ء-۱۹۴۵ء) رہے۔ انھوں نے تحریک پاکستان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ قیام پاکستان کے بعد وہ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۰ء تک دستور ساز اسمبلی کے رکن رہے۔ ۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۳ء تک انھیں مشرقی بنگال کے گورنر جنرل کی حیثیت سے خدمات انجام دینے کا موقع ملا۔ ۱۹۵۳ء سے ۱۹۵۵ء تک وہ پنجاب کے وزیر اعلیٰ رہے۔ ۱۹۵۵ء میں انھی وزیر خارجہ مقرر کیا گیا۔ اس دور میں ان کا اہم کارنامہ عمان سے گوادر کی بندرگاہ کا حاصل کرنا تھا۔ دسمبر ۱۹۵۷ء سے اکتوبر ۱۹۵۸ء تک انھوں نے ملک کے وزیر اعظم کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ ۱۹۵۸ء میں صدر ایوب کی طرف سے مارشل لا کے نفاذ کے بعد انھوں نے سیاسی سرگرمیاں ترک کر دیں اور گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ انھوں نے ۹/دسمبر ۱۹۷۰ء کو انتقال کیا۔

اس برقیہ کو نظر انداز کرتے ہوئے مولوی محمد یعقوب نے ۱۰ اگست ۱۹۳۰ء کو مسلم لیگ کے ممتاز اراکین کے نام ایک خط بھیجا جس میں ان سے ہر زحمت برداشت کر کے بھی لکھنؤ اجلاس میں شرکت کی پُر زور درخواست کی گئی تھی۔[۱۶۰] نیز ۱۱ اگست ۱۹۳۰ء کو ایک تار کے ذریعے سید شمس الحسن نے فیروز خان نون کو مطلع کیا کہ وہ لکھنؤ اجلاس کو ملتوی کرنے کی تجویز سے اتفاق نہیں کرتے۔[۱۶۱] ۱۱ اگست کو قائداعظم نے شمس الحسن کو تار دی کہ ان کا لکھنؤ آنا یقینی نہیں ہے اور اگر ضروری ہے، تو لکھنؤ اجلاس ملتوی کر دیا جائے۔[۱۶۲] ۹ اگست کو ہی فیروز خان نون نے شمس الحسن اور مولوی محمد یعقوب کو التوائے اجلاس کے لیے علیحدہ علیحدہ تار دیے۔[۱۶۳] مولوی محمد یعقوب کے نام اپنے برقیہ میں فیروز خان نون نے کہا کہ مختلف صوبوں کی عرض داشتوں کے پیش نظر قائداعظم نے لکھنؤ اجلاس کے التوا پر اتفاق کر لیا ہے۔ براہ کرم التوائے اجلاس کے لیے اہتمام کیجیے اور دعویٰ کیا کہ وہ مسلم لیگ کونسل کے پنجابی اراکین کی اکثریت کی ترجمانی کر رہے ہیں۔[۱۶۴] ایسا معلوم ہوتا ہے کہ التوائے اجلاس کی ان کوششوں کی علامہ اقبال کو بھی خبر ہو گئی تھی چنانچہ انھوں نے بھی ۱۱ اگست کو شمس الحسن سے بذریعہ تار دریافت کیا کہ اگر لکھنؤ اجلاس ملتوی ہو گیا تو انھیں مطلع کیا جائے۔[۱۶۵]

۱۲ اگست کو فیروز خان نون نے لکھنؤ میں ہونے والے مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کے التوا کے لیے مولوی محمد یعقوب کو ایک تفصیلی خط لکھا۔ انھوں نے بتایا کہ انھیں مسلم لیگ کے جوائنٹ سیکرٹری نے تار دی تھی کہ قائداعظم سے لکھنؤ اجلاس کو ملتوی کروانے کے لیے رابطہ کروں اور اب جب قائداعظم اس پر رضامند ہو گئے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مقامی رہنما قائداعظم کے خیالات سے اتفاق کرنے کے لیے تیار نہیں۔[۱۶۶] فیروز خان نون نے مزید وضاحت کی کہ قائداعظم

۱۶۰- ایضاً، ص ۷۲۔

۱۶۱- ایضاً، جلد ۱۵۴، ص ۶

۱۶۲- ایضاً، ص ۷۶۔

۱۶۳- ایضاً، جلد ۱۵۴، ص ۴-۵

۱۶۴- ایضاً۔

۱۶۵- ایضاً، ص ۷۔

۱۶۶- ایضاً، جلد ۱۵۳، ص ۷۳-۷۴۔ اس خط کو فیروز خان نون کے ذاتی معتمد نے جاری کیا تھا۔

کو ہر صوبہ سے درخواستیں موصول ہوئی تھیں کہ لکھنؤ اجلاس ملتوی کر دیا جائے اور اگر تمام صوبوں کی رائے عامہ اجلاس کا التوا ہی چاہتی ہے تو ایسا کر دینا ہی مناسب ہوگا۔[۱۶۷]

پنجاب کی سیاسی صورت حال کا تذکرہ کرتے ہوئے فیروز خان نون نے لکھا کہ انھیں پنجاب میں کسی کو بھی لکھنؤ اجلاس میں شرکت پر آمادہ کرنے میں شدید دشواری ہو رہی ہے کیونکہ ہر شخص انتخابات میں مصروف ہے۔ یا تو وہ خود اُمیدوار ہے یا اپنے دوستوں کے لیے کام کر رہا ہے۔[۱۶۸] اس صورت حال کے پیش نظر فیروز خان نون نے مولوی محمد یعقوب سے درخواست کی کہ وہ اپنے خیالات پر دوبارہ غور کریں اور التوا پر رضامند ہو جائیں، جس کا تمام ہندوستان سے مطالبہ کیا جا رہا ہے اور اس بات پر زور دیا کہ یہ ضروری ہے کہ جلسہ لیگ کامیاب ہو مگر جب تک مختلف صوبوں سے اہم مسلم رہنما لکھنؤ نہ آئیں، مسلم اتحاد کا فریضہ ادا نہیں ہو سکتا۔ انھوں نے یقین دلایا کہ اکتوبر زیادہ دور نہیں ہے اور ہم سب انتخابات سے ستمبر تک فارغ ہو جائیں گے اور اپنی تمام تر توجہ مسلم لیگ کی جانب مبذول کر سکیں گے۔[۱۶۹]

اس مکتوب کے علاوہ ۱۲راگست کو ہی مسلم لیگی رہنماؤں سید مرتضیٰ اور اے۔ ایچ غزنوی کی طرف سے بھی مولوی محمد یعقوب کو الگ الگ تاروں کے ذریعے انتخابات کی مصروفیت کی بنا پر اجلاس لکھنؤ ملتوی کرنے کی درخواست کی گئی تھی۔[۱۷۰] ان تمام تر التجاؤں کے باوجود مولوی محمد یعقوب سالانہ اجلاس کو مقررہ تاریخوں پر کرنے پر مصر تھے۔ چنانچہ انھوں نے ۱۲راگست ۱۹۳۰ء کو شمس الحسن سے بذریعہ خط اجلاس کے انتظامات کی رفتار کے بارے میں پوچھا اور اُمید ظاہر کی کہ انھوں نے کسی بھی ممکنہ گڑبڑ کے دفعیہ کا معقول انتظام کر لیا ہوگا۔[۱۷۱] مگر مولوی محمد یعقوب کی تمام تر مزاحمت اس وقت دم توڑ گئی جب انھیں قائداعظم کا ارسال کردہ تار ملا کہ انتخابات کی وجہ سے لکھنؤ اجلاس میں شرکت کرنا بہت دشوار ہے، اس لیے اجلاس ملتوی کر دیا جائے۔[۱۷۲]

۱۶۷- ایضاً۔

۱۶۸- ایضاً۔

۱۶۹- ایضاً۔

۱۷۰- ایضاً، جلد ۱۵۴، ص ۹-۱۰۔

۱۷۱- ایضاً، ص ۱۱۔

۱۷۲- ایضاً، ص ۸۔

اس حتمی فیصلے کے بعد مولوی محمد یعقوب کے پاس التوائے اجلاس کا اعلان کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا اور اتنا وقت بھی نہ تھا کہ وہ لکھنؤ میں قائم مجلس استقبالیہ سے مشورہ کر سکتے۔ اس صورت حال میں انھیں مجبوراً تمام اخبارات اور مسلم لیگی زعماء مثلاً قائداعظم محمد علی جناح، علامہ اقبال، مولوی شفیع داؤدی (۱۸۷۹ء۔۱۹۴۹ء)، اے۔ کے غزنوی اور منشی اظہر علی کو لکھنؤ اجلاس کے التوا کی خبر بذریعہ تار ہی دینی پڑی۔[۱۷۳] چنانچہ روزنامہ انقلاب کی 14 اگست کی اشاعت میں مولوی محمد یعقوب کے حوالے سے خبر شائع ہوئی کہ صدر مسلم لیگ، محمد علی جناح کی ہدایات اور تمام اراکین کی خواہش کے مطابق مسلم لیگ کا اجلاس لکھنؤ تا اطلاع ثانی ملتوی کر دیا گیا ہے۔[۱۷۴] اسی مضمون کا تار شمس الحسن نے بھی علامہ اقبال کی خدمت میں ارسال کیا۔[۱۷۵]

III

لکھنؤ اجلاس کے عین وقت پر التوا نے لکھنؤ کی مقامی مسلم لیگی قیادت کو شدید غم و غصہ میں مبتلا کر دیا کیونکہ وہ اعلیٰ سطح پر ہونے والی التوا کی کوششوں سے بے خبر تھے اور جلسے کو کامیاب بنانے کے لیے انتھک محنت میں مصروف تھے۔ نیز اس فیصلے کے بارے میں ان سے کوئی صلاح و مشورہ نہ کیا گیا تھا۔ اس سلسلے میں اپنی صفائی پیش کرنے کے لیے مولوی محمد یعقوب نے ۱۴ اگست ۱۹۳۰ء کو شمس الحسن کو اوپر تلے دو خطوط لکھے جس میں اچانک اجلاس ملتوی کرنے سے لکھنؤ میں پیدا شدہ مایوسی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ وہ اس کے قطعی ذمہ دار نہیں ہیں کیونکہ وہ آخر وقت تک جلسہ ہونے پر اصرار کرتے رہے تھے اور لکھنؤ کے احباب سے استدعا کی کہ وہ جلسے کے انتظامات کو قائم رکھیں اور مجلس استقبالیہ اپنا کام جاری رکھے تاکہ اکتوبر کا اجلاس بھرپور کامیاب ہو۔[۱۷۶] اگلے روز یعنی ۱۳ اگست ۱۹۳۰ء کو مولوی محمد یعقوب نے شمس الحسن کو بذریعہ خط دوبارہ تاکید کی کہ وہ ابھی لکھنؤ میں ہی ٹھہریں اور ۱۵ اگست ۱۹۳۰ء کو اگر کورم پورا ہوتا ہے تو مسلم لیگ کونسل کا جلسہ کر کے اس میں

۱۷۳- ایضاً، ص ۱۵-۱۶۔

۱۷۴- انقلاب، ۱۴ اگست ۱۹۳۰ء۔

۱۷۵- ایضاً۔

۱۷۶- اے ایم ایف، جلد ۱۵۴، ص ۱۵-۱۶۔

صرف سالانہ جلسے کا حسب خواہش قائداعظم التوا تا اکتوبر منظور کر لیں اور اکتوبر کے جلسے کے واسطے کام جاری رکھیں۔[۱۷۷] ان خطوط سے ظاہر ہوتا ہے التوا کا فیصلہ بادل نخواستہ کیا گیا تھا اور مسلم لیگی قیادت اکتوبر میں لکھنؤ ہی میں سالانہ اجلاس کیا نعقاد کے بارے میں سنجیدہ تھی۔

ابتداءً ملتوی شدہ سالانہ اجلاس کو اکتوبر کے پہلے ہفتہ ہی میں منعقد کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا مگر اس ضمن میں حتمی تاریخوں کا کوئی اعلان نہ کیا گیا۔ ۱۴راگست ۱۹۳۰ء کے ایک خط میں علامہ اقبال نے سید نذیر نیازی (۱۹۰۰ء-۱۹۸۱ء) کو مطلع کیا کہ مسلم لیگ کا ملتوی شدہ اجلاس اکتوبر کے پہلے ہفتے میں غالباً لکھنؤ میں ہوگا مگر یہ بھی ممکن ہے کہ کسی اور جگہ ہو۔ اور رائے ظاہر کی کہ ''لکھنؤ پنجاب والوں کے لیے ذرا دور ہے، پہلے بھی بہت سے لوگ جانے کے لیے تیار تھے مگر اخراجات سے گھبراتے تھے۔''[۱۷۸] ۱۵راگست ۱۹۳۰ء کو روزنامہ انقلاب میں فیروز خان نون کے حوالے سے یہ خبر شائع ہوئی کہ مسلم لیگ اور مسلم کانفرنس کے اجلاس اکتوبر کے پہلے ہفتے تک ملتوی کر دیئے گئے ہیں کیونکہ انتخابی مہم کے دوران مندوبین کا شریک ہونا مشکل تھا۔[۱۷۹] مگر ان تمام تر قیاس آرائیوں کے باوجود مسلم لیگ کے مرکزی دفتر کی جانب سے سالانہ اجلاس کے مقام اور وقت کے سلسلے میں کوئی اعلان اخبارات میں شائع نہ ہوا تھا اور نہ ہی دعوتی خطوط جاری ہوئے۔ چنانچہ ۲۹راگست ۱۹۳۰ء کو علامہ اقبال نے شمس الحسن کو خط لکھ کر دریافت کیا کہ ملتوی شدہ اجلاس کب اور کہاں ہوگا۔[۱۸۰]

اس مکتوب کے حوالے سے شمس الحسن نے مولوی محمد یعقوب کو اپنے ۳۰راگست ۱۹۳۰ء کے خط میں تحریر کیا کہ ان کے خیال میں ملتوی شدہ اجلاس لکھنؤ ہی میں ہونا چاہئے کیونکہ استقبالیہ کمیٹی کے پاس کافی روپیہ جمع ہے اور انتظامات بھی مکمل ہیں۔[۱۸۱] محض اجلاس کی تاریخوں کے تعین کے لیے مسلم لیگ کونسل کا اجلاس طلب کرنے کی مخالفت کرتے ہوئے شمس الحسن نے رائے دی کہ قائد اعظم سے مشورہ کر کے اس کی بابت اخبارات میں اعلان کر دیا جائے کیونکہ دعوتی خطوط میں اس کی

۱۷۷- ایضاً، ص ۱۳۔

۱۷۸- برنی، ایضاً، ص ۱۵۶۔

۱۷۹- انقلاب ۱۵راگست ۱۹۳۰ء۔

۱۸۰- برنی، ایضاً، ص ۱۵۸۔

۱۸۱- اے ایم ایف، جلد ۱۵۴، ص ۱۸۔

مزید وضاحت ہو جائے گی۔[۱۸۲] ۳۰ راگست ہی کو شمس الحسن نے علامہ اقبال کو بذریعہ خط مطلع کیا کہ مقام اجلاس تو لکھنؤ ہی رہے گا مگر اجلاس کی تاریخوں کے سلسلے میں قائداعظم سے خط و کتابت ہو رہی ہے جس کا جواب آنے پر ان کو مطلع کر دیا جائے گا اور رائے دی کہ اکتوبر کے پہلے ہفتے میں ۷ اور ۸ کی تاریخیں زیادہ موزوں رہیں گی کیونکہ غالباً بعض قائدین بھی یہی چاہتے ہیں۔[۱۸۳]

اس خط کے جواب میں علامہ اقبال نے شمس الحسن کو یکم ستمبر ۱۹۳۰ء کو مطلع کیا کہ آئندہ اجلاس جہاں بھی ہو ۷ یا ۸ اکتوبر ان کے لیے موزوں نہیں کیونکہ پنجاب ہائی کورٹ ۷ راکتوبر سے کام شروع کر دے گی۔[۱۸۴] اس ضمن میں انھوں نے تجویز کیا کہ مذکورہ اجلاس ۲۸ اور ۲۹ رستمبر کو ہونا چاہیے۔ ۲۸ رستمبر کو آخری ہفتہ اور ۲۹ رستمبر کو اتوار ہے چنانچہ اجلاس کے شرکاء کو سہولت ہوگی۔ نیز پنجاب میں انتخابات کا ہنگامہ ۲۲ رستمبر تک ختم ہو جائے گا کیونکہ اکثر مقامات پر اُمیدوار بلا مقابلہ منتخب ہو گئے ہیں۔[۱۸۵] اس خط کا کوئی جواب موصول نہ ہونے پر علامہ اقبال نے ۸ رستمبر ۱۹۳۰ء کو شمس الحسن کو ایک اور خط لکھا جس میں زور دیا گیا کہ مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کی تاریخ جلد مقرر ہونی چاہیے تاکہ اخباروں کو تشہیر کرنے کے لیے مناسب وقت مل سکے گا۔[۱۸۶] مگر یہ مکتوب بھی جواب طلب رہا۔ دراصل ہندوستان بھر میں مسلم لیگی اپنے اپنے حلقوں کی انتخابی گہما گہمی میں مصروف تھے جبکہ صدر مسلم لیگ و دیگر اہم رہنما پہلی گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن جانے کی تیاریوں میں مشغول تھے۔ چنانچہ ستمبر کے اواخر یا اکتوبر کے پہلے ہفتے میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس منعقد کرنے کا پروگرام دھرے کا دھرا رہ گیا اور اجلاس کے لیے دوبارہ نئی تاریخیں منتخب کرنے کا مرحلہ درپیش ہو گیا۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ انھی دنوں بمبئی کے ممتاز مسلم رہنما

۱۸۲- ایضاً۔

۱۸۳- ایضاً، ص ۱۹۔

۱۸۴- ایضاً، ص ۲۰۔ برنی کی مرتبہ کلیات مکاتیب اقبال (جلد سوم، ص ۱۶۵) میں یہ خط بلا تاریخ دیا ہوا ہے۔

۱۸۵- ایضاً۔

۱۸۶- ایضاً، ص ۱۹۔ برنی کی مرتبہ کلیات مکاتیب اقبال (جلد سوم، ص ۱۶۵) میں اس خط کو انگریزی سے ترجمہ شدہ ظاہر کیا گیا ہے مگر اے ایف ایم میں اصل خط اُردو میں موجود ہے۔

ابراہیم رحمت اللہ (۱۹۱۲ء-۱۹۹۱ء) نے علامہ اقبال کو دعوت دی کہ مسلم وفد کے ہمراہ پہلی گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن چلیں مگر علامہ اقبال نے مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں شرکت کی بنا پر معذرت کر لی تھی۔[۱۸۷]

۲۴ ستمبر ۱۹۳۰ء کو علامہ اقبال نے سیکرٹری مسلم لیگ کو بذریعہ خط مطلع کیا کہ انھیں قائداعظم کا ایک خط موصول ہوا ہے جس میں کہا گیا تھا کہ سالانہ اجلاس کی تاریخ اور جگہ کا تعین کے لیے مسلم لیگ کونسل کی میٹنگ طلب کی جائے اور بتایا کہ انھوں نے قائداعظم کو مشورہ دیا ہے کہ وہ خود ہی اجلاس کی تاریخ مقرر کر دیں اور اسے لکھنؤ ہی میں منعقد کیا جائے کیونکہ وہاں اجلاس کے انعقاد کی تیاریاں ہو چکی ہیں۔ کسی اور مقام کے انتخاب میں نہ صرف دقت ہوگی بلکہ وہاں کے لوگ اس بات کا تقاضا کریں گے کہ لیگ کے اجلاس کو کامیاب بنانے کے لیے مزید وقت کی ضرورت ہے۔[۱۸۸] اس ضمن میں علامہ نے سیکرٹری مسلم لیگ کو مشورہ دیا کہ سالانہ اجلاس کے انعقاد کے لیے ۱۸؍اکتوبر (ہفتہ) کی تاریخ موزوں رہے گی چنانچہ وہ قائداعظم سے جلد خط و کتابت کر کے اس کا اعلان کر دیں کیونکہ قائداعظم ۱۴؍اکتوبر کو انگلستان جا رہے ہیں اور اجلاس کی کامیابی کا دارومدار اس بات پر ہے کہ تاریخ اجلاس کا اعلان جہاں تک ممکن ہو، جلد ہو جائے۔[۱۸۹] اس خط کے حوالے سے ۲۵ ستمبر ۱۹۳۰ء کو شمس الحسن نے منشی اظہر علی لکھنؤ اور مولوی محمد یعقوب کو مرادآباد خطوط ارسال کیے کہ علامہ اقبال کے خیال میں ۱۸؍اکتوبر کی تاریخ سالانہ اجلاس کے انعقاد کے لیے موزوں ہے اور ان سے استدعا کی کہ اپنی سہولتیں مدنظر رکھ کر اس تجویز کے متعلق اپنی آرا سے مطلع کریں۔[۱۹۰]

۱۸۷- ایضاً۔

۱۸۸- ایضاً، ص ۲۷- برنی کی مرتبہ کلیات مکاتیب اقبال (جلد سوم، ص ۱۷۲) میں یہ خط بلا تاریخ ترتیب دیا گیا ہے جب کہ اے ایم ایف میں موجود عکسی نقول میں ۲۴؍اکتوبر کی تاریخ صاف پڑھی جا رہی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علامہ سہواً ستمبر کی جگہ اکتوبر لکھ گئے ہیں کیونکہ اس خط میں وہ لیگ کے ملتوی شدہ سالانہ اجلاس کے لیے ۱۸؍اکتوبر کی تاریخ تجویز کر رہے ہیں۔ مزید برآں اسی خط کے حوالے سے شمس الحسن نے مولوی محمد یعقوب کو ۲۵ ستمبر کو ایک خط تحریر کیا۔ دیکھیے: اے ایم ایف، جلد ۱۵۴، ص ۲۲۔

۱۸۹- ایضاً۔

۱۹۰- ایضاً، ص ۲۲۔

ابھی ان خطوط کے جواب موصول نہ ہوئے تھے کہ ۲۹ ستمبر ۱۹۳۰ء کو علامہ اقبال نے شمس الحسن کو ایک اور خط تحریر کیا جس میں زور دیا گیا تھا کہ لیگ کا سالانہ اجلاس مسلم کانفرنس کے ملتوی شدہ اجلاس سے پہلے لکھنؤ میں ۱۸ اکتوبر کو ہونا چاہیے۔[۱۹۱] محض جگہ اور وقت کے تعین کے لیے مسلم لیگ کونسل کے اجلاس کو طلب کرنے کو وقت کا ضیاع قرار دیتے ہوئے علامہ نے لکھا کہ انھیں اُمید نہیں کہ لوگ مسلم لیگ کونسل کے اجلاس میں شرکت کے لیے پہلے دہلی یا لاہور جائیں اور پھر کانفرنس اور لیگ کے اجلاسوں کے لیے لکھنؤ یا کسی اور مقام کا سفر کریں۔[۱۹۲] علامہ اقبال نے اس بات کی بھی نشاندہی کی کہ پنجاب کی مجلس قانون ساز کا اجلاس بھی ۱۲ اکتوبر سے شروع ہونا متوقع ہے جس کے باعث پنجاب سے لوگ مسلم لیگ کونسل کے اجلاس کے لیے نہ آ سکیں گے اور آخر میں ملک فیروز خان نون کی رائے درج کی کہ کونسل کا اجلاس ضروری تو نہیں ہے۔[۱۹۳]

مسلم لیگ کے مرکزی دفتر سے کوئی حتمی اطلاع موصول نہ ہونے پر ۳ اکتوبر کو علامہ اقبال نے شمس الحسن کو ایک اور خط تحریر کیا کہ اگر کونسل کا اجلاس منعقد کرنے کا فیصلہ ہو چکا ہے تو انھیں اس کی جائے انعقاد اور تاریخ مقررہ سے مطلع کیا جائے کیونکہ مسلم لیگ کی طرف سے کوئی اطلاع اخبارات میں شائع نہیں ہوئی اور لوگ ان سے دریافت کر رہے ہیں۔[۱۹۴] یہ خط بھی حسب سابق تشنہ جواب ہی رہا۔ دریں اثنا لاہور سے شائع ہونے والے ممتاز اُردو روزنامہ سیاست نے تجویز پیش کی کہ مولانا محمد علی جوہر کی عدم موجودگی میں جو پہلی گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن گئے ہوئے تھے، علامہ اقبال کو مسلم کانفرنس کے ملتوی شدہ اجلاس کا صدر منتخب کیا جائے۔[۱۹۵] اس تجویز کی تائید میں ۷ اکتوبر ۱۹۳۰ء کی اشاعت میں مدیر انقلاب نے ''آل پارٹیز مسلم کانفرنس کی صدارت'' کے عنوان سے ایک اداریہ لکھا جس میں کہا گیا تھا کہ اگر مسلم لیگ کے اجلاس میں تاخیر ہو یا مسلم کانفرنس کے ساتھ لیگ کا اجلاس منعقد نہ ہو سکتا ہو تو مسلم کانفرنس کے اجلاس کی صدارت کے لیے علامہ اقبال کو ہر حال میں مجبور کیا جائے تا کہ اس نازک موقع پر قوم ان

۱۹۱- ایضاً، ص ۲۳۔ برنی کی مرتبہ کلیات مکاتیب اقبال (جلد سوم، ص ۱۷۰) میں یہ خط بلا تاریخ درج ہے۔ ابتدائی تین جملوں کو علامہ کے اصل خط کے مطابق نشان زدہ نہیں کیا گیا اور ایک جگہ لفظ ''جگہ'' بھی چھوٹ گیا ہے۔

۱۹۲- ایضاً۔ ۱۹۳- ایضاً۔ ۱۹۴- ایضاً، ص ۲۴۔

۱۹۵- بحوالہ انقلاب، ۷ اکتوبر ۱۹۳۰ء۔

کے خیالات سے استفادہ کر سکے۔[١٩٦]

مندرجہ بالا سطور سے یہ حقیقت عیاں ہے کہ علامہ اقبال اور ان کے رفقا ہندوستان کی تیزی سے بدلتی ہوئی سیاسی صورت حال کے پیش نظر مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے متحدہ قومی موقف کے اظہار کے خواہش مند تھے تا کہ انگلستان میں پہلی گول میز کانفرنس کے شرکاء اور برطانوی رائے عامہ کے سامنے مسلم نقطہ نظر پوری صراحت کے ساتھ پیش کیا جا سکے۔ تاہم مسلم لیگی زعماء کی ہر ممکن سعی اور علامہ اقبال کی تمام تر نیک خواہشات کے باوجود اکتوبر میں لکھنؤ میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس منعقد نہ ہو سکا اور انجام کار سب کی نگاہیں کرسمس کی تعطیلات پر جا لگیں کیونکہ اب دسمبر کے آخری عشرے ہی میں کسی سیاسی اجتماع کا انعقاد ممکن تھا۔ مگر اب ایک بار پھر اجلاس کے لیے موزوں جگہ کی تلاش کا مرحلہ درپیش ہو گیا کیونکہ لکھنؤ کے مسلم لیگی قائدین دسمبر میں اجلاس کی میزبانی سے پس و پیش کر رہے تھے اور ان کی رائے تھی کہ مارچ ١٩٣١ء میں، جب مسلم نمائندے لندن سے واپس آ جائیں، تب ہی وہاں لیگ کا سالانہ اجتماع منعقد کیا جائے۔[١٩٧]

٣ر نومبر ١٩٣٠ء کو مولوی محمد یعقوب نے شمس الحسن کو تحریر کیا کہ ''سر اقبال کی بہت خواہش ہے کہ کسی طرح مسلم لیگ کا اجلاس منعقد ہو سکے۔ بڑے دن (کرسمس) سے پیشتر کوئی صورت جلسہ کی مجھے معلوم نہیں ہوتی۔ اس سال بڑے دن کی تعطیلات میں بنارس میں آل ایشیا ایجوکیشنل کانفرنس اور آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس ہونے والی ہے۔ اس لئے میرا خیال ہے کہ اگر بنارس سے مسلم لیگ کو بھی دعوت مل سکے تو وہاں جلسہ ہو سکے گا۔ سر اقبال بھی اس پر رضامند ہو گئے ہیں۔ لہٰذا آپ مراد آباد آ جائیں تو آپ کو یہاں سے بنارس جانا ہوگا تا کہ آپ وہاں سے وعدہ حاصل کرنے کی کوشش کریں۔''[١٩٨]

بنارس یوں تو ہندو اکثریت کا علاقہ تھا اور ہندوؤں کے نزدیک مذہبی تقدس کا بھی حامل تھا۔ مگر مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس کی وجہ سے کرسمس کی تعطیلات میں وہاں مسلمانوں کا خاصا

١٩٦- ایضاً، بعد میں مسلم کانفرنس کا ملتوی شدہ اجلاس ٣٠ر ستمبر ١٩٣٠ء کو مجلس مرکزیہ خلافت کے صدر نواب محمد اسمٰعیل کی قیادت میں لکھنؤ میں منعقد ہوا۔

١٩٧- اے ایم ایف، جلد ١٥٤، ص ٢٨-٣١۔

١٩٨- ایضاً، ص ٢٩۔

اجتماع ہونے کی توقع تھی اور چونکہ مسلم لیگ اور ایجوکیشنل کانفرنس کے ممبران تقریباً یکساں تھے، اس لیے ایک ہی وقت و مقام پر دونوں جلسوں کے ساتھ ساتھ ہونے سے دونوں اجتماعات کو ایک دوسرے سے تقویت پہنچنے اور دونوں کی رونق بڑھنے کا بھی قوی امکان تھا۔ مگر مسلم لیگ اپنی کمزور مالی حالت کی بنا پر سالانہ اجلاس کے مصارف برداشت کرنے سے بھی قاصر تھی اور وہاں کسی ذی حیثیت مسلم میزبان کی متلاشی تھی۔ چنانچہ مولوی محمد یعقوب نے شمس الحسن کو ممتاز لیگی رہنما عبدالجبار کی خدمت میں بھیجتے ہوئے ان سے استدعا کی کہ وہ دیوان اجمیر شریف کی وساطت سے بابا خلیل احمد جو مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے بنارس میں میزبان تھے، سے درخواست کریں کہ وہ مسلم لیگ کی بھی مہمانداری اور سرپرستی قبول فرمالیں کیوں کہ ''دو برس سے مسلم لیگ کا سالانہ جلسہ نہیں ہوسکا اور اس وقت بھی جبکہ نہایت اہم سیاسی معاملات درپیش ہیں، مسلم لیگ کے جلسہ نہ ہونے کے معنی مسلم لیگ کا فنا ہوجانا ہے۔''[۱۹۹]

بابا خلیل احمد کے ممکنہ خدشات کا سدباب کرتے ہوئے مولوی محمد یعقوب نے انھیں یقین دلایا کہ مسلم لیگ کسی طرح بھی حکومت کی مخالف نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کے مذہبی اور قومی حقوق کی حفاظت کے لیے کوشاں ہے نیز کانگریس کی موجودہ تحریک سول نافرمانی سے مسلم لیگ سخت اختلاف رکھتی ہے اور اس وقت جلسہ کرنے کی ایک بڑی غرض یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کو کانگریس کی تحریکات میں شریک ہونے سے روکا جائے۔[۲۰۰] یہ سعی کامیاب ہوئی اور بابا خلیل احمد نے مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کی بنارس میں میزبانی کرنے کی درخواست قبول کرلی۔[۲۰۱] مولوی محمد یعقوب نے اس دعوت کا شکریہ ادا کرتے ہوئے انھیں مطلع کیا کہ وہ مسلم لیگ کونسل کا ہنگامی اجلاس دہلی میں ۱۰ردسمبر ۱۹۳۰ء کو منعقد کررہے ہیں تاکہ اراکین کونسل کی رسمی منظوری حاصل کرلی جائے۔[۲۰۲]
۳ردسمبر ۱۹۳۰ء کی اشاعت میں روزنامہ انقلاب نے شمس الحسن کے حوالے سے خبر شائع کی کہ مولوی محمد یعقوب کی خدمت میں بنارس سے دعوت موصول ہوئی ہے کہ لیگ کا سالانہ اجلاس کرسمس کی تعطیلات میں بنارس میں منعقد کیا جائے۔[۲۰۳] اسی خبر کے حوالے سے علامہ اقبال سید نذیر نیازی کے نام اپنے مکتوب محررہ ۹ردسمبر ۱۹۳۰ء میں تحریر کرتے ہیں کہ وہ غالباً بنارس جائیں گے۔[۲۰۴] مگر

۱۹۹- ایضاً۔
۲۰۰- ایضاً۔
۲۰۱- ایضاً،ص۳۵۔
۲۰۲- ایضاً،ص۳۶۔
۲۰۳- انقلاب، ۳ردسمبر ۱۹۳۰ء۔
۲۰۴- برنی، ایضاً،ص۱۸۰۔

جلد ہی بنارس میں چند ایسی مشکلات پیدا ہوگئیں کہ وہاں سالانہ اجلاس کا انعقاد ناممکن ہوگیا۔

۴ر دسمبر ۱۹۳۰ء کو بنارس مسلم لیگ کونسل کے رکن مولوی طفیل احمد، جو بنارس میں سالانہ اجلاس کا اہتمام کر رہے تھے، نے مولوی محمد یعقوب کو اطلاع دی کہ طعام کا بندوبست تو بابا خلیل کر رہے ہیں مگر مسلمانوں کی رہائش کے لیے خیمے مسلم لیگ کو خود کرایہ پر لینے پڑیں گے۔[۲۰۵] اس طرح جلسے کے لیے موزوں جگہ کا چناؤ بھی مشکل ہوگیا تھا کیونکہ جے نراین کالج بنارس کے احاطہ میں جہاں جلسہ منعقد کرنے کا خیال تھا، وہاں کی انتظامیہ نے سیاسی اجتماع ہونے کی بنا پر جگہ دینے سے انکار کر دیا تھا۔[۲۰۶] اس کے بعد ٹاؤن ہال بنارس کا انتخاب کیا گیا مگر وہاں کرسیاں ندارد تھیں اور انھیں دنوں کئی اجتماعات ہونے کے باعث کرایہ پر بھی کرسیاں ملنی محال تھیں۔[۲۰۷] اس صورت حال کے تدارک کے لیے مولوی طفیل احمد نے تجویز پیش کی کہ مسلم لیگ کا جلسہ ۳۰ اور ۳۱ر دسمبر کو کر لیا جائے اور ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس ایک دن پہلے ختم کر لیے جائیں تاکہ حاضرین کے لیے کرسیاں دستیاب ہوسکیں۔[۲۰۸] اس پیچیدہ صورت حال نے مولوی محمد یعقوب کو پریشان کر دیا اور انھوں نے ۶ر دسمبر ۱۹۳۰ء کو بذریعہ خط شمس الحسن کو ہدایت کی کہ وہ مولوی طفیل احمد سے صلاح مشورہ کے لئے ان کے پاس چلے جائیں۔[۲۰۹]

۷ر دسمبر ۱۹۳۰ء کو مولوی طفیل احمد نے سیکرٹری مسلم لیگ کو بنارس میں سالانہ اجلاس کے انتظامات کے سلسلے میں مزید اطلاعات دیتے ہوئے لکھا کہ ٹاؤن ہال میں جلسے کے لیے کرسیاں کرایہ پر لینی پڑیں گی جس کا کرایہ فی کرسی ایک آنہ یومیہ ہے۔ مزید اس عمارت میں تین چار سو سے زیادہ کرسیاں نہیں آسکتیں جب کہ اجلاس میں صدہا مندوبین کی آمد متوقع تھی۔[۲۱۰] مہمانوں کی رہائش کے بارے میں لکھا کہ ابھی تک انھیں صرف دس خیمے بلا کرایہ ملے ہیں جو ناکافی ہیں اور

۲۰۵- اے ایم ایف، جلد ۱۵۴، ص ۳۷-۳۸۔

۲۰۶- ایضاً۔

۲۰۷- ایضاً۔

۲۰۸- ایضاً۔

۲۰۹- ایضاً، ص ۴۱۔

۲۱۰- ایضاً، ص ۴۳-۴۵۔

مرکزی دفتر کو مزید خیموں کا انتظام کرنے کی درخواست کی۔[۲۱۱] ظاہر ہے کہ مرکزی دفتر خود لیگ کے معاملات انتہائی مشکل سے چلا رہا تھا اور اس وسیع انتظام کے قابل نہ تھا۔ مزید برآں مالی مشکلات بھی سدِ راہ تھیں۔

مسلم لیگ کے اکابرین ابھی اسی ادھیڑ بن میں تھے کہ اِلٰہ آباد سے سید محمد حسین، ممبر کونسل آف سٹیٹ و صدر تنظیم اِلٰہ آباد نے سیکرٹری مسلم لیگ کو ۸ ؍دسمبر ۱۹۳۰ء کو بذریعہ تار دعوت دی کہ کرسمس کی تعطیلات کے دوران اِلٰہ آباد میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس منعقد کیا جائے۔[۲۱۲] اگلے دن ۹ ؍دسمبر ۱۹۳۰ء کو سید محمد حسین نے سیکرٹری مسلم لیگ کے نام ایک اور تار کے ذریعے مندوبین کے قیام و طعام کی ذمہ داری قبول کرتے ہوئے مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس اِلٰہ آباد ہی میں کرنے پر اصرار کیا۔[۲۱۳]

بنارس میں پیدا شدہ غیر متوقع انتظامی مشکلات کے پیش نظر مسلم لیگ کے قائدین نے اس دعوت کو امداد غیبی تصور کیا اور ۱۰ ؍دسمبر ۱۹۳۰ء کو منعقدہ مسلم لیگ کونسل کے ہنگامی اجلاس میں متفقہ طور سید محمد حسین کی وساطت سے موصول شدہ مسلمانانِ اِلٰہ آباد کی اس دعوت کو قبول کر لیا کہ علامہ اقبال کی صدارت میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس اِلٰہ آباد میں منعقد کیا جائے۔[۲۱۴] بنارس میں درپیش انتظامی دشواریوں کے علاوہ مسلم لیگ کونسل کے پیش نظر یہ امر بھی تھا کہ انہی دنوں میں اِلٰہ آباد میں علماء کانفرنس اور تنظیم کانفرنس کے اجلاس بھی منعقد ہو رہے تھے جس سے وہاں مسلمانوں کا ایک اچھا خاصا اجتماع ہونے کی اُمید تھی۔ نیز بنارس سے اِلٰہ آباد کا صرف تین گھنٹے کا سفر تھا جس کی وجہ سے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اور مسلم لیگ کے مشترکہ ممبران بہ سہولت دونوں شہروں میں آ جا سکتے تھے۔[۲۱۵]

مسلم لیگ کے گزشتہ فیصلوں کی نسبت اِلٰہ آباد میں سالانہ اجلاس کے انعقاد کی اطلاع علامہ اقبال کو فوراً مل گئی۔ چنانچہ ۱۱ ؍دسمبر ۱۹۳۰ء کو سید نذیر نیازی کے نام اپنے مکتوب میں تحریر کرتے ہیں

۲۱۱- ایضاً۔

۲۱۲- ایضاً،ص ۴۸۔

۲۱۳- ایضاً،ص ۵۰۔

۲۱۴- ایضاً،ص ۵۲۔

۲۱۵- ایضاً،ص ۵۱۔

کہ مسلم لیگ کا جلسہ بنارس کی جگہ اِلٰہ آباد میں ہوگا جس میں شرکت کے لیے وہ غالباً ۲۷؍دسمبر ۱۹۳۰ء کو اِلٰہ آباد جائیں گے۔[۲۱۶] اس فیصلے سے باشعور مسلم حلقوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

۱۸؍دسمبر کی اشاعت میں روزنامہ انقلاب نے اِلٰہ آباد میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس منعقد کرنے کا خیر مقدم کرتے ہوئے اُمید ظاہر کی کہ علامہ اقبال کی رہنمائی میں لیگ کا یہ اجلاس نہایت کامیاب ہوگا اور اس نازک زمانے میں مسلمانوں کی صحیح ترجمانی اور رہنمائی کا پورا پورا حق ادا کرے گا۔ اخبار نے مسلمانانِ ہند پر زور دیا کہ اِلٰہ آباد کے اجلاس میں جوق در جوق شریک ہوں اور علامہ اقبال کا خطبہ صدارت سنیں جس میں وہ اپنے اندازِ خصوصی میں مسلمانوں کو ایک روشن نصب العین کی طرف توجہ دلا کر پیغامِ عمل دیں گے۔[۲۱۷]

IV

اِلٰہ آباد کا اصل نام پریاگ تھا۔ اس کا شمار ہندوستان کے قدیم ترین شہروں میں ہوتا تھا۔ گنگا، جمنا اور ہندو دیومالا کے مطابق ایک گم شدہ دریا سرسوتی کا سنگم ہونے کے باعث یہ شہر تربینی بھی کہلاتا ہے۔ ہندو روایات کے مطابق راجہ ہرش کی بہن اسی جگہ ہر سال دان پن کے لیے آتی تھی۔ اسی وجہ سے اِلٰہ آباد ہندوؤں کے لیے انتہائی تقدس کا حامل تھا اور ہندوستان کے ہر حصے سے لاکھوں ناظرین کمبھ کے میلے میں یاترا اور اشنان کرنے آیا کرتے تھے۔[۲۱۸]

غیر منقسم ہندوستان میں اِلٰہ آباد ایک خاص سیاسی اہمیت بھی رکھتا تھا۔ یہ شہر مشہور ہندو رہنماؤں موتی لال نہرو اور جواہر لال نہرو (۱۸۸۹ء–۱۹۶۴ء) کا مولد و مسکن تھا۔ موتی لال نہرو نے کانگریس میں شمولیت کے بعد اپنی عالی شان رہائش گاہ 'آنند بھون' کو ہندو قوم کے لیے وقف کر دیا تھا اور اسے 'سوراج بھون' کا نام دیا تھا۔ اس مکان میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا صدر دفتر واقع

۲۱۶- برنی، ایضاً، ص ۱۸۴۔

۲۱۷- انقلاب، ۱۸؍دسمبر ۱۹۳۰ء۔

۲۱۸- احمد الدین مارہروی، ''جلسہ اِلٰہ آباد کا آنکھوں دیکھا حال'' اُردو ڈائجسٹ، اپریل ۱۹۶۷ء، لاہور، ص ۳۳-۳۴، نیز دیکھیے: مختار زمن ''دوازدہ منزل سے منزلِ پاکستان تک'' نقوش، اقبال نمبر، شمارہ ۱۲۱، ستمبر ۱۹۷۷ء، ص ۴۰۹-۵۰۱۔

تھا اور گاندھی (۱۸۴۶ء-۱۹۲۱ء) اِلٰہ آباد میں قیام کے دوران یہیں ٹھہرا کرتے تھے۔[۲۱۹]

اِلٰہ آباد میں مسلمانوں کی عمومی حالت نہایت خستہ تھی اور اکبر اِلٰہ آبادی (۱۸۴۶ء-۱۹۲۱ء) کی رحلت کے بعد ان میں کوئی صحیح قومی رہنما موجود نہ تھا۔ ہر چند ایک شفاعت احمد خان (۱۸۹۳ء-۱۹۴۷) تھے مگر وہ بھی پہلی گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن گئے ہوئے تھے۔[۲۲۰] ان کی عدم موجودگی میں حافظ غضنفر اللہ، ممبر کونسل اور ان کے احباب نے مقدور بھر جلسے کی تنظیم، مہمانوں کے استقبال اور قیام وطعام کی ذمہ داری نبھانے کی کوشش کی۔ اس کے علاوہ اِلٰہ آباد سے شائع ہونے والے ہفت روزہ اخبار سٹار کے ایڈیٹر رحم علی الہاشمی اور اِلٰہ آباد یونیورسٹی کے شعبہ تاریخ کے ریسرچ سکالر احمد الدین مارہروی نے جلسہ کی تشہیر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اخبارات، پوسٹرز اور دستی اشتہارات کے ذریعے خوب پروپیگنڈا کیا۔[۲۲۱]

مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سید محمد حسین مسلم لیگ کے رہنماؤں کی توقعات پر پورا نہ اتر سکے۔ انھوں نے نہ سالانہ اجلاس کی حتمی تاریخوں کا اعلان کیا اور نہ ہی مرکزی دفتر کو جلسے کے انتظامات سے باخبر رکھ سکے۔ ۱۶؍دسمبر ۱۹۳۰ء کو اِلٰہ آباد کے لیگی کارکن رفیع الدین نے شمس الحسن کے نام اپنے مکتوب میں اجلاس کے ناقص انتظامات کی اطلاع دی۔[۲۲۲] ۱۹؍دسمبر ۱۹۳۰ء کو مولوی محمد یعقوب نے بمبئی سے شمس الحسن کے نام اپنے مکتوب میں لکھا کہ وہ یہاں لوگوں کو سالانہ اجلاس میں شرکت کے لیے آمادہ کر رہے ہیں مگر کامیابی کے امکانات موہوم ہیں اور انھیں ہدایت کی کہ اِلٰہ آباد میں مہمانوں کے قیام کے انتظامات کے بارے میں معلومات حاصل کر کے ایسوسی ایٹیڈ پریس کے ذریعے اس بندوبست کو مشتہر کیا جائے۔[۲۲۳] اگلے روز یعنی ۲۰؍دسمبر ۱۹۳۰ء کو شمس الحسن کے نام ایک

۲۱۹- ایضاً۔

۲۲۰- مارہروی، ایضاً، ص ۳۴، ڈاکٹر شفاعت اِلٰہ آباد یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر تھے۔ وہ مراد آباد کے حلقے سے صوبائی کونسل کے بھی ممبر تھے اور آئینی اُمور پر ان کی مہارت کا لوہا سر شیخ بہادر سپرو جیسے مقنن بھی مانتے تھے۔ وہ اپنے ذاتی اخراجات سے ایک ہفتہ وار اخبار سٹار بھی نکالتے تھے جو مسلم نقطہ نظر کی ترجمانی کرتا تھا۔

۲۲۱- ایضاً۔

۲۲۲- اے ایم ایف، جلد ۱۵۴، ص ۵۴۔

۲۲۳- ایضاً، ص ۵۵-۵۶۔

اور خط میں تنگی وقت کی بنا پر مندوبین کو علیحدہ علیحدہ دعوتی خطوط کے اجراء کو رد کرتے ہوئے مولوی محمد یعقوب نے بتایا کہ انھوں نے انگریزی اور اُردو اخبارات میں دعوت نامہ شائع کروا دیا ہے۔[۲۲۴] اِلٰہ آباد میں انتظام جلسہ کے بارے میں اظہار تشویش کرتے ہوئے مولوی محمد یعقوب نے لکھا کہ ابھی تک سید محمد حسین سے تاریخ جلسہ کا فیصلہ نہیں ہوا اور بتایا کہ انھوں نے سید محمد حسین کو تار دیا ہے کہ ۲۸ ر دسمبر کی سہ پہر کو جلسہ شروع کیا جائے اور ۲۹ ر دسمبر کی شام کو ختم کر دیا جائے۔

ان کے جواب آنے پر لیگ کونسل کا نوٹس درست کر کے روانہ کر دوں گا اور آپ کو بھی لکھوں گا کہ آپ فوراً اِلٰہ آباد چلے جائیں، اس واسطے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سید محمد حسین نے ابھی تک کوئی انتظام نہیں کیا ہے۔[۲۲۵] اگلے دو دن بھی بلا کسی پیش رفت کے گزر گئے۔ حتیٰ کہ شمس الحسن جیسے مستقل مزاج اور ہر قیمت پر سالانہ اجلاس کے انعقاد کے خواہش مند بھی نا اُمید ہو گئے۔ ۲۲ ر دسمبر کو انھوں نے مولوی محمد یعقوب کو لکھا ''آج کی ڈاک سے بھی مسودہ ایجنڈا نہیں ملا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اِلٰہ آباد سے آپ کے تاروں کا جواب نہیں آیا۔ ایسی صورت میں یہ ہی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اخبارات کے ذریعے سالانہ اجلاس کے التوا کا اعلان کر دیا جائے کیونکہ مجھے یقین ہے کہ ان حالات میں قواعد و دستور کو بالائے طاق رکھتے ہوئے بھی اگر ہم وہاں جلسہ کریں گے تو بجز بدنامی کچھ حاصل نہ ہو گا۔ ممبران کی شکایات کا ایک طوفان برپا ہو جائے گا جس کو دبانا مشکل ہو جائے گا۔ ان شاء اللہ جب مارچ ۱۹۳۱ء میں مسلم شرکاء لندن سے واپس آ جائیں گے تو لیگ کا سالانہ اجلاس کیجیے گا۔ لکھنؤ کے احباب کا بھی اس پر زور تھا۔''[۲۲۶] مگر شاید لکھنؤ اور بنارس میں اجلاس منعقد کرنے کا اعلان کر کے ملتوی کرنے کے بعد مولوی محمد یعقوب اب تیسرے التوا کے حق میں نہیں تھے۔ چنانچہ ۲۲ ر دسمبر ۱۹۳۰ء کو مولوی محمد یعقوب نے شمس الحسن کو کونسل لیگ کا ایجنڈا درست کر کے روانہ کرتے ہوئے انھیں ہدایت کی کہ اس کو جاری کرنے کے بعد وہ فوراً اِلٰہ آباد چلے جائیں اور وہاں ہونے والے انتظامات سے انھیں جلد مطلع کریں۔[۲۲۷] اجلاس کی حتمی تاریخیں

۲۲۴- ایضاً۔

۲۲۵- ایضاً۔

۲۲۶- ایضاً۔

۲۲۷- ایضاً ص ۵۹۔

طے نہ ہونے پر مولوی محمد یعقوب نے اظہار تشویش کرتے ہوئے لکھا کہ سید محمد حسین نے تاریخ مقرر کرنے میں بڑی گڑبڑ کر رکھی ہے۔ علامہ اقبال چاہتے ہیں کہ ۳۱ر دسمبر کو واپس لاہور پہنچ جائیں۔ اس لحاظ سے پہلا اجلاس ۲۸ر دسمبر کی سہ پہر کو ہونا چاہیے اور باقی دو اجلاس ۲۹ر دسمبر کو کر کے اسی شام کو جلسہ جلد ختم کر دیا جائے۔[۲۲۸] بہر حال اجلاس کی تاریخوں کے سلسلے میں علامہ اقبال اور مولوی محمد یعقوب کی خواہشات پوری نہ ہو سکیں۔

۲۵ر دسمبر ۱۹۳۰ء کو انقلاب میں خبر شائع ہوئی کہ مسلم لیگ کا اجلاس ۲۹، ۳۰ اور ۳۱ر دسمبر کو الٰہ آباد میں علامہ اقبال کی زیر صدارت ہوگا جس میں شرکت کے لیے علامہ ۲۷ر دسمبر کی شام کو لاہور سے روانہ ہو کر ۲۸ر دسمبر کو الٰہ آباد پہنچ جائیں گے۔ اخبار نے مسلمانان پنجاب سے اپیل کی کہ دقت برداشت کر کے بھی اس جلسے میں ضرور شریک ہوں۔[۲۲۹] ۲۷ر دسمبر کی اشاعت میں انقلاب نے خبر دی کہ مسلم لیگ کا دفتر ایک ہفتہ کے لیے دہلی سے الٰہ آباد منتقل کر دیا گیا ہے۔ اور علامہ کے ساتھ لاہور اور پنجاب کے دوسرے شہروں کے متعدد اکابرین بھی اجلاس لیگ میں شرکت کے لیے الٰہ آباد جا رہے ہیں۔ اخبار نے یہ بھی اطلاع دی کہ ۲۹ر دسمبر کو علامہ اقبال اور سیٹھ عبداللہ ہارون ایم ایل اے (۱۸۷۶ء-۱۹۴۲ء) (کراچی) جو انھی دنوں میں الٰہ آباد میں منعقد ہونے والی آل انڈیا تنظیم کانفرنس کی صدارت کے لیے منتخب کیے گئے ہیں، کا جلوس نکالا جائے گا اور اجلاس کے اختتام پر کشتیوں اور تفریحی کھیلوں کے مقابلے ہوں گے۔[۲۳۰]

۲۷ر دسمبر کو فتح پور کے مسلم لیگی رہنما امیر حسن خان نے سیکرٹری مسلم لیگ کو مطلع کیا کہ اگر علامہ اقبال ۲۹ر دسمبر کو صبح اس راستے سے گذرے تو وہ انھیں ریلوے سٹیشن پر ایک شاندار استقبالیہ دیں گے اور درخواست کی کہ ۳۰ر دسمبر کو یو پی کے ممتاز شاعر مولانا محمد ابراہیم، جنہیں فردوسی ہند بھی کہا جاتا ہے، کو پنڈال میں موقعہ کی مناسبت سے لکھی گئی ایک نظم پڑھنے کی اجازت دی جائے۔[۲۳۱]

۲۲۸- ایضاً۔

۲۲۹- انقلاب، ۲۵ر دسمبر ۱۹۳۰ء۔

۲۳۰- انقلاب، ۲۷ر دسمبر ۱۹۳۰ء۔

۲۳۱- اے ایم ایف، جلد ۱۵۴، ص ۶۱- تاہم دستیاب دستاویزات میں ایسے کسی استقبالیے یا اجلاس میں کسی نظم پڑھنے کا ذکر نہیں ملتا۔

نمائندہ انقلاب نے ۲۸ر دسمبر کو اِلٰہ آباد سے اجلاس لیگ کی تیاریوں کا آنکھوں دیکھا حال بیان کرتے ہوئے لکھا کہ ''مسلم لیگ کے اجلاس کے انتظامات تقریباً مکمل ہو چکے ہیں۔ مولوی محمد یعقوب تشریف لے آئے ہیں۔ تنظیم اور لیگ کے دفتر ۲۷ر دسمبر سے کھل چکے ہیں۔ لیگ کونسل کا اجلاس ۲۸ر دسمبر کو ہوگا جبکہ پہلا کھلا اجلاس ۲۹ر دسمبر کو ۸ بجے صبح مجیدیہ سکول کے باہر میدان میں منعقد ہوگا۔ مندوبین کے قیام کا بندوبست بھی مجیدیہ سکول میں کیا گیا ہے۔ ۲۹ر دسمبر کو ایک بجے بعد دوپہر کشتیاں شروع ہوں گی جو پورا دن جاری رہیں گی۔ علامہ اقبال اور عبداللہ ہارون جب پنجاب میل سے وارد ہوں گے تو انھیں ریلوے سٹیشن سے جلوس کی شکل میں لایا جائے گا جو شہر بھر سے ہوتا ہوا، نواب محمد یوسف کے مکان پر ختم ہوگا جہاں دونوں صاحبان فروکش ہوں گے۔[۲۳۲]

اِلٰہ آباد ریلوے سٹیشن پر علامہ اقبال کا تاریخی استقبال ہوا۔ ان کا خیر مقدم کرنے والوں میں مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلم بھی شامل تھے۔ اِلٰہ آباد کے باسیوں کے بقول ایسا مجمع پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔ پلیٹ فارم، ریل گاڑی کے ڈبوں کی چھتوں حتیٰ کہ ریلوے سٹیشن کے باہر بھی کھوا سے کھوا چھل رہا تھا اور مجمع سے گاہے بہ گاہے شاعر اعظم زندہ باد کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔[۲۳۳]

اِلٰہ آباد کی مسلم قصاب برادری نہ صرف انتہائی با اثر اور منظم تھی بلکہ قومی معاملات میں جوش و خروش سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کرتی تھی۔ اس کے اراکین قومی جلوسوں کے موقع پر لاٹھیاں لے کر ایک گروہ کی شکل میں آگے آگے چلتے اور مختصر دورانیہ کے بعد نعرہ تکبیر کی صدا کے ساتھ انھیں اس زور سے زمین پر مارتے کہ در و بام لرز جاتے۔ علامہ اقبال کے استقبال کے لیے ان کا ایک دستہ بھی پلیٹ فارم پر موجود تھا جس نے گاڑی رکتے ہی نعرہ تکبیر کی صداؤں سے فضا کو گرما دیا جس سے علامہ کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔[۲۳۴] بے پناہ ہجوم کی بنا پر اِلٰہ آباد یونیورسٹی مسلم ہوسٹل اور اسلامیہ سکول اِلٰہ آباد کے طالب علموں کے خیر مقدمی پروگرام بھی درہم برہم ہو کر رہ گئے۔[۲۳۵] خیر مقدم کی طرح استقبالیہ جلوس بھی بے مثل رہا۔ راستے بھر میں سڑکوں، درختوں، چھتوں اور

۲۳۲- انقلاب، ۳۰ر دسمبر ۱۹۳۰ء۔

۲۳۳- مارہروی، ایضاً، ص ۳۴۔

۲۳۴- ایضاً۔

۲۳۵- تفصیلات کے لیے دیکھیے: ایضاً۔

دیواروں پر تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی اور منتظمین کو معزز مہمانوں کو ان کی قیام گاہ تک پہنچانے میں خاصی تگ و دو کرنی پڑی۔ علامہ اقبال اور ان کے احباب اس عظیم الشان جلوس کی معیت میں نواب محمد یوسف کی کوٹھی واقع ساؤتھ روڈ، اِلٰہ آباد پہنچے جہاں انھوں نے قیام کیا۔[۲۳۶]

علامہ اقبال کے استقبال کے لیے عوام نے جس جوش و خروش اور دلی عقیدت کا مظاہرہ کیا، جلسے کے منتظمین نے اس کے برعکس جلسہ گاہ میں حاضرین کی موجودگی کو یقینی بنانے کا کوئی معقول بندوبست نہیں کیا۔ اِلٰہ آباد میں سیاسی جلسے عموماً شہر سے باہر ایک وسیع باغ میں واقع میو ہال میں ہوا کرتے تھے اور مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس بھی وہیں منعقد کرنے کا پروگرام تھا مگر دفعتاً جلسے کا مقام بدل کر شہر کے اندر واقع ایک غیر معروف حویلی میں کر دیا گیا جس میں ہال سرے سے ندارد تھا اور اندرونی صحن میں بمشکل چند آدمیوں کے بیٹھنے کی جگہ تھی۔[۲۳۷] جلسہ گاہ، محلّہ یاقوت گنج میں شیر شاہ سوری کی بنوائی ہوئی شاہراہ اعظم پر واقع ایک دو منزلہ عمارت تھی جس کا بلند و بالا مرکزی دروازہ سڑک کی طرف کھلتا تھا اور اس پر اُردو میں 'دوازدہ منزل' تحریر تھا۔[۲۳۸]

یہ عمارت شہر کے ممتاز مسلم تاجر شیخ رحیم بخش کی ملکیت تھی جن کا شمار اِلٰہ آباد کے پڑھے لکھے معزز مسلمانوں میں ہوتا تھا اور وہ صوفیوں، بزرگوں اور عالموں کی مجالس میں شرکت کو اپنے لیے باعث اعزاز جانتے تھے۔[۲۳۹] جلسہ گاہ کی تبدیلی کی دو وجوہات بیان کی جاتی ہیں پہلی یہ کہ مقامی سیاسی دھڑے بندی کی بنا پر مخالف جماعتوں کی طرف سے مظاہرے اور گڑبڑ کا اندیشہ تھا اور دوسرا یہ کہ شہر میں مسلم سیاست کی زبوں حالی کو دیکھتے ہوئے جلسہ میں بہت کم شرکاء متوقع تھے۔ اس لیے دوازدہ منزل کے نسبتاً مختصر مگر محفوظ صحن کو سالانہ اجلاس کے لیے موزوں خیال کیا گیا۔[۲۴۰]

۲۳۶- ایضاً، علامہ کے ساتھ لاہور سے آنے والوں میں سر عبدالقادر ایڈیٹر مخزن، ڈاکٹر عبداللہ چغتائی اور مشہور پنجابی شاعر اور قومی کارکن ملک لال دین قیصر نمایاں تھے۔

۲۳۷- ایضاً، ص ۳۵۔

۲۳۸- زمن، ایضاً، ص ۴۹۹۔

۲۳۹- ایضاً، ص ۵۰۰۔

۲۴۰- مارہروی، ایضاً، ص ۳۵۔

V

اسی 'دوازدہ منزل' میں علامہ اقبال کی صدارت میں مسلم لیگ کا اکیسواں سالانہ اجلاس ۲۹ردسمبر ۱۹۳۰ء کو صبح گیارہ بجے شروع ہوا۔ ابتدا میں حاضرین کی تعداد مایوس کن طور پر کم تھی اور نصف کرسیاں خالی تھیں۔ حاضرین میں بڑی تعداد ایسے حضرات کی تھی جو انگریزی سے نابلد ہونے کے ساتھ ساتھ سیاسی مسائل کو سمجھنے کی اہلیت سے عاری تھے اور جلسہ کو مشاعرہ سمجھ کر علامہ اقبال کے کلام سے لطف اندوز ہونے آئے تھے۔[۲۴۱]

شہر کے عمائدین اور دانشوروں میں سے چند ہی موجود تھے۔ البتہ اِلٰہ آباد یونیورسٹی کے مسلم ہوسٹل کے مکینوں کا ایک گروہ اپنے روحانی قائد کی تقریر سننے کے لیے ہمہ تن گوش تھا اور علامہ اقبال بھی اپنے خطبے کے دوران زیادہ تر انھی نوجوانوں کی طرف متوجہ رہے۔[۲۴۲]

جلسے کے شرکاء کی کل تعداد کے بارے میں بھی مختلف آرا ہیں۔ مفتی فخر الاسلام، جو تقسیم سے پہلے اِلٰہ آباد شہری مسلم لیگ کے صدر اور یو پی اسمبلی کے رکن رہ چکے ہیں، کے خیال میں جلسے میں مشکل سے چار پانچ سو آدمی موجود تھے۔[۲۴۳] ایک اور مسلم لیگی کارکن عبدالحئی عباسی، جو جلسے میں شریک تھے، کے بیان کے مطابق حاضرین کی تعداد اس سے بھی کم تھی اور ان میں سے بہت سے مدرسہ کے طالب علم بھی شامل تھے جو شاید تفریحاً شریک ہو گئے تھے۔[۲۴۴] بہرحال انڈین اینول رجسٹر ۱۹۳۰ء کے مرتب کے مطابق شرکاء کی تعداد چھ سو تھی جس میں اکثریت مقامی لوگوں کی تھی۔ اس کے علاوہ اِلٰہ آباد کے کئی اعزازی مجسٹریٹ اور حکومتی ملازمین بھی شریک جلسہ تھے۔[۲۴۵] سالانہ اجلاس میں شریک ممتاز مقامی زعماء میں نواب محمد یوسف، مفتی فخر الاسلام،

۲۴۱- ایضاً۔

۲۴۲- ایضاً۔

۲۴۳- زمن، ایضاً، ص ۱۰۵۔

۲۴۴- ایضاً۔

۲۴۵- نرپندار ناتھ مترا، مرتبہ، دی انڈین اینویل رجسٹر، جلد دوم، جولائی تا دسمبر ۱۹۳۰ء کلکتہ، ص ۳۳۴۔

عبدالحئی عباسی، احمد الدین مار ہروی، رحم علی الہاشمی ایڈیٹر ہفتہ وار سٹار اِلٰہ آباد، سید محمد حسین ممبر کونسل آف سٹیٹ وصدر استقبالیہ کمیٹی، بیرسٹر شیخ ظہور احمد، ڈاکٹر ایم یو ایس جنگ اور شیخ رحیم بخش وغیرہ نمایاں تھے۔[۲۴۶] باہر سے آنے والے مندوبین کے بارے میں کئی سو افراد کا تخمینہ لگایا گیا تھا مگر ان کی تعداد دو درجن سے زیادہ نہ تھی۔ نمایاں بیرونی مہمانوں میں مولوی محمد یعقوب (مراد آباد)، نواب محمد اسمٰعیل خان (۱۸۸۶ء-۱۹۵۸ء) (میرٹھ)، سید حسین امام (۱۸۹۷ء-۱۹۸۵ء) (گیا)، سید حبیب شاہ (۱۸۹۱ء-۱۹۵۲ء) (لاہور)، سر شیخ عبدالقادر (۱۸۷۴ء-۱۹۵۰ء) (لاہور)، سیٹھ عبداللہ ہارون، ایم ایل اے (کراچی)، حفیظ الرحمان، محمد عظیم (غازی پور)، مولانا شیخ عبدالمجید سندھی (۱۸۸۹ء-۱۹۷۸ء) (حیدرآباد، سندھ)، مولوی عبدالقادر قصوری (۱۸۶۵ء-۱۹۴۲ء) (لاہور)، سید ذاکر علی (لکھنؤ)، مولانا عبدالماجد بدایونی (۱۸۸۷-۱۹۳۱ء) (بدایوں)، سیٹھ طیب علی (کراچی)، مولوی علاء الدین (میرٹھ)، مولانا عبدالخیر (غازی پور)، خان بہادر برکت اللہ (غازی پور)، شاہ نذیر حسین، ایم ایل سی (بہار)، مولوی عبدالکافی (کانپور)، مولوی عبدالصمد (بدایوں)، اظہر علی، ایم ایل اے (لکھنؤ) وغیرہ شامل تھے۔[۲۴۷]

سالانہ اجلاس کی باقاعدہ کاروائی کا آغاز سید محمد حسین صدر مجلس استقبالیہ کے خیر مقدمی کلمات سے ہوا۔ معزز مہمانوں کو خوش آمدید کہتے ہوئے انھوں نے واضح کیا کہ مسلمانوں نے ہندوؤں کے ساتھ کسی قابلِ عمل سمجھوتہ تک پہنچنے کے لیے کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی مگر وہ اس کا کوئی مثبت جواب دینے سے قاصر رہے۔[۲۴۸] اس الزام کو جھٹلاتے ہوئے کہ مسلمان اپنے فرقہ پرستانہ جذبات کی بنا پر ملکی ترقی میں حائل ہیں، سید محمد حسین نے یقین دلایا کہ اگر ہندو ذہنیت بدل جائے اور مسلمانوں کو یہ یقین دہانی کرادی جائے کہ ان کی روایات، مذہب، تعلیم، اور زبان کو ختم نہیں کیا

۲۴۶- دیکھیے: ایضاً، ص۳۴۴-۳۳۴، ۳۴۸، زمن، ایضاً، ص ۵۰۱، مار ہروی، ص۳۴-۳۷ اور سید شریف الدین پیرزادہ، مرتبہ، فاؤنڈیشنز آف پاکستان: آل انڈیا مسلم لیگ ڈاکومینٹز، ۱۹۰۶-۱۹۴۷ء، جلد دوم، کراچی، ۱۹۷۰ء، ص۱۵۳-۱۷۶۔

۲۴۷- ایضاً۔

۲۴۸- پیرزادہ، ایضاً، ص۱۵۳۔

جائے گا اور ان سے ہندوستان کے دیگر فرزندوں کی مانند یکساں سلوک ہوگا، تو مسلمان اپنے حقوق کیسے تحفظ کا سوال اُٹھانا چھوڑ دیں گے۔[۲۴۹] سید محمد حسین نے پہلی گول میز کانفرنس کے مسلم شرکا کے طرزِ عمل کی تحسین کرتے ہوئے حکومت کو خبر دار کیا کہ اگر گول میز کانفرنس میں مسلمانوں کو درپیش مشکلات کا کوئی ازالہ نہ کیا گیا تو وہ اپنے مطالبات کو منوانے کے لیے کسی قربانی سے دریغ نہیں کریں گے۔[۲۵۰]

سید محمد حسین کے استقبالیہ کلمات کے بعد علامہ اقبال نے اپنا شہرہ آفاق خطبہ صدارت پڑھا۔ یہ خطبہ انگریزی میں تھا اور اس کی چھپی ہوئی کاپیاں بھی حاضرین میں تقسیم کی گئیں۔ کچھ لوگ تو سرے سے اس کا ادراک نہ کر سکے اور جلد ہی اس کو ایک طرف رکھ دیا۔ کچھ نے اس کا بغور مطالعہ کرنے کی کوشش کی مگر تقریب کے اختتام تک پہلے ہی صفحے تک پہنچ پائے۔ بعضوں نے ابتدائی صفحات پڑھ کر کسی ادبی شہ پارے کا اختتام معلوم کرنے کے سے انداز میں فوراً آخری صفحات کھول لیے۔[۲۵۱] جلسے کے ایک سامع احمد الدین مارہروی کے بقول اجتماع میں موجود طالب علموں کے علاوہ بمشکل پچیس تیس اشخاص ایسے ہوں گے جنھوں نے علامہ کی صدارتی تقریر کے ساتھ ساتھ خطبے کا بالاستیعاب مطالعہ کیا اور اس میں پنہاں اشاروں اور باریکیوں کو پہنچ پائے۔[۲۵۲] عمومی طور پر پوری مجلس پر ایک مبہم سا سکوت اور بے لطف خاموشی چھائی رہی جس کو سٹیج پر سے بجائی جانے والی تالیوں کی آواز کبھی کبھی توڑتی رہی۔ یہ صاف ظاہر تھا کہ حاضرین کی اکثریت علامہ اقبال کی فکری بلندی اور نکتہ رسی کے ادراک سے قاصر ہے، چنانچہ وہ اہم نکات کی تشریح کے وقت طلبا کی جماعت کی ہی طرف متوجہ رہے۔

علامہ خطبہ پڑھنے کے دووان اپنے مطالب کی وضاحت قرآنی آیات اور احادیث کے حوالوں اور تشریحی جملوں سے کرتے رہے۔ جب علامہ اپنی تقریر کے دوران اس مقام تک پہنچے جہاں وہ ہندو مسلم اتحاد کے لیے مغل بادشاہ اکبر اور کبیر بھگت کی طرف سے کی جانے والی ناکام

۲۴۹- ایضاً۔

۲۵۰- ایضاً۔

۲۵۱- مارہروی، ایضاً، ص ۳۶، اگلے کئی صفحات میں انداز بیان مارہروی سے مستعار لیا گیا ہے۔

۲۵۲- ایضاً۔

کوششوں کا ذکر کر رہے تھے تو سامعین میں سے کسی نے بلا سبب و تحریک نعرہ تکبیر بلند کیا جس سے علامہ کی تیوری پر بل پڑ گئے اور انھوں نے سلسلہ کلام کچھ دیر کے لیے منقطع کر دیا، کیونکہ ان کو اندازہ ہو گیا تھا کہ حاضرین کی بڑی تعداد ان کے خیالات سے آگہی نہیں رکھتی۔[۲۵۳]

جب علامہ اس فقرے پر پہنچے کہ مسلم قوم کی طرف سے برصغیر پاک و ہند میں ایک اسلامی مملکت قائم کرنے کا مطالبہ بالکل حق بجانب ہے تو اس کی وضاحت کے لیے ایک ثانیہ کے لیے رک کر، انھوں نے تشریحاً ایک منفرد سیاسی اصطلاح استعمال کی جو سامعین کی اکثریت نے پہلے نہ سنی تھی۔ انھوں نے کہا کہ اس سے میری مراد ہے An Imperium in Imperio (اقتدار اعلیٰ کے اندر کامل اختیار) تو مجمع میں موجود تعلیم یافتہ احباب کے منہ سے بے ساختہ سبحان اللہ نکلا اور جلسہ گاہ صدائے تحسین سے گونج اٹھی۔ علامہ کا چہرہ دمک اُٹھا اور گردن کے اشارے سے انھوں نے یہ داد قبول فرمائی۔[۲۵۴] اس کے بعد انھوں نے قدرے بلند آواز میں اپنی وہ شہرہ آفاق تجویز پیش کی جس میں مسلم اکثریتی صوبوں کو یکجا کر کے برطانوی سلطنت کے اندر یا باہر ایک طاقت ور اسلامی مملکت کے قیام کا اشارہ پنہاں تھا۔ مگر حاضرین میں اس وقت کوئی بھی اس کے مضمرات نہ سمجھ سکا اور اس پر علامہ کو اتنی بھی تحسین نہ ملی جتنی انھیں اپنے کسی شعر پر مل سکتی تھی۔[۲۵۵]

جب علامہ اقبال اپنے صدارتی خطبے کے اختتام پر پہنچے تو اس وقت ہال کی تمام نشستیں پُر ہو چکی تھیں اور کئی افراد دائیں، بائیں یا پیچھے کھڑے تھے۔ ان میں سے اکثریت علامہ اقبال کو ایک عظیم الشان شاعر کی حیثیت سے جانتی تھی اور ان کی بلند پایہ سیاسی بصیرت سے ناآشنا تھی۔ چنانچہ ابھی علامہ خطبہ ختم کر کے بیٹھنے بھی نہ پائے تھے کہ جلسہ گاہ میں ایک عجیب صورت حال پیدا ہو گئی۔ حاضرین نے یک زبان ہو کر علامہ سے شعر خوانی کا مطالبہ کیا۔ علامہ جو عام حالات میں بھی بطور شاعر اپنا تعارف کروانا پسند نہ کرتے تھے اور عام شعرا کی طرح ہر وقت اپنا کلام سنانے کے شائق نہ تھے، اس غیر متوقع فرمائش کے لیے قطعی تیار نہ تھے۔ مگر مجمع کے پُر زور اصرار پر انھوں نے بہت مدھم آواز میں بے رغبتی سے خودی سے متعلق اپنے چند اشعار سنائے جس سے حاضرین جلسہ کی

۲۵۳- ایضاً۔

۲۵۴- ایضاً، ص ۳۶-۳۷۔

۲۵۵- ایضاً۔

تشنگی اور بڑھ گئی اور ہل من مزید کی صدائیں بلند ہونے لگیں مگر اس وقت تک علامہ بھی قدرے سنبھل چکے تھے اور بہت دردمند لہجے میں حاضرین مجلس کو مخاطب کر کے کہنے لگے کہ اب میں آپ کو ایک حدیث مبارکہ سناؤں گا جس پر اگر آپ لوگ عامل ہو گئے تو تمام قومی مسائل حل ہو جائیں گے۔ اس کے بعد انھوں نے ایک مشہور حدیث پاک سنائی جس کا ترجمہ ہے ''جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا، اس نے خدا کو پہچان لیا'' اور اپنی نشست پر تشریف فرما ہو گئے۔[۲۵۶] خطبہ صدارت کے خاتمے پر مولوی محمد یعقوب نے انگریزی سے ناآشنا افراد کے لیے خطبے کے مرکزی خیالات کا اُردو میں ترجمہ کیا جس کے بعد اجلاس کی پہلی نشست برخواست ہوئی۔[۲۵۷]

علامہ اقبال کے عالمانہ خطبہ صدارت اور حاضرین کی کم فہمی پر تبصرہ کرتے ہوئے ممتاز مسلم لیگی راہنما چودھری خلیق الزمان (۱۸۸۹ء-۱۹۷۳ء) اپنی خودنوشت میں لکھتے ہیں ''ایسے کھلے ہوئے اشارے اور تصریح کے بعد بھی مسلم لیگ کے اس اجلاس میں موجود کسی ایک فرد نے بھی اس کا کوئی نوٹس نہ لیا اور نہ کسی نے اپنی تقریر میں اس کی تائید میں کوئی تجویز پیش کی اور ہوتی بھی کیسے کیونکہ مسلم لیگ محض زمینداروں، تعلقہ داروں اور خطاب یافتوں کا ایک سودمند گھوارہ تھا۔ شاید وہ جلسہ بھی اس قابل نہ تھا کہ اس میں وہ جواہر پارے بکھیرے جاتے۔''[۲۵۸] علامہ بھی اپنے حیات آفرین پیغام کی عظمت اور حاضرین کی بے حسی اور مسلم زعما کی محدود نظری سے بخوبی آگاہ تھے۔ مگر ان کی مستقبل بین نگاہوں نے بھانپ لیا تھا کہ آج جو محض ایک شاعر کا تخیل ہے کل وہ پوری ملت کی دل کی آواز بن جائے گا۔ چنانچہ جب اجلاس کے اختتام پر مفتی فخر الاسلام اور ان کے رفقا نے علیحدگی میں آہستہ سے علامہ سے عرض کیا کہ آپ ان ''ٹوڈیوں'' میں کہاں آ پھنسے؟ تو انھوں نے پُر یقین لہجے میں جواب دیا کہ ''تم لوگ گھبراؤ مت۔ یہ لوگ باقی رہنے والے نہیں، قوم باقی رہے گی۔''[۲۵۹]

۲۵۶- ایضاً۔

۲۵۷- پیرزادہ، ایضاً، ص۱۵۳-۱۵۴۔

۲۵۸- چودھری خلیق الزمان، شاہراہ پاکستان، کراچی، ۱۹۷۷ء، ص۵۰۹، بحوالہ زمن، ایضاً، ص۵۰۲۔

۲۵۹- زمن، ایضاً، ص۵۰۱۔

VI

مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کی دوسری نشست ۳۰ر دسمبر ۱۹۳۰ء کی صبح کو علامہ اقبال کی صدارت میں شروع ہوئی جو تین گھنٹے تک جاری رہنے کے بعد سات قراردادیں منظور کر کے اختتام پذیر ہوئی۔[۲۶۰]

اس زمانے کی سیاسی روایات کے مطابق جلسوں کے اختتام پر منظور کی گئی قراردادوں کی خاص اہمیت ہوتی تھی اور انھی کے ذریعے ہی حکومت ہند اور دیگر ہم وطنوں کے سامنے اپنے مطالبات پیش کیے جاتے تھے۔ خاص طور پر مسلم لیگ کی سیاست تو زیادہ تر قراردادوں اور بیانات ہی کے گرد گھومتی تھی کیونکہ قرارداد پاکستان (۱۹۴۰ء) کے منظور ہونے سے قبل اس میں عوامی رنگ مفقود تھا اور خواص مودب التجاؤں ہی پر گزارا کرتے تھے۔

۱۹۳۰ء کے سالانہ اجلاس کے لیے سب سے پہلے چار قراردادوں کے مسودے فتح پور کے مسلم لیگی رہنما امیر حسن خان نے سیکرٹری مسلم لیگ کو ارسال کیے۔[۲۶۱] پہلی قرارداد میں برطانوی وزیر اعظم ریمزے میکڈونلڈ کے ہندو نواز رویے کی مذمت کرتے ہوئے اسے متنبہ کیا گیا تھا کہ مستقبل میں مسلمانان ہند کی ہمدردیاں کھو دینے کی ذمہ داری اسی پر عائد ہوگی۔[۲۶۲] دوسری قرارداد کے ذریعے پہلی گول میز کانفرنس میں شریک مسلم نمائندوں کے اس طرز عمل کو سراہا گیا تھا جس کے ذریعے وہ آل انڈیا مسلم کانفرنس کی یکم جنوری ۱۹۲۹ء کو منظور شدہ قرارداد پر مبنی مسلم مطالبات کی منظوری کے لیے کوشاں تھے۔ قرارداد میں انھیں اسلام کے کھلے دشمنوں کی سازشوں سے چوکس رہنے کی تلقین کرتے ہوئے ان سے یہ التجا بھی کی گئی تھی کہ برطانوی رائے عامہ پر مسلم مطالبات کی اہمیت کو ہندو اکثریت کی بڑھوتری کے تناظر میں واضح کریں۔[۲۶۳] تیسری قرارداد میں ریاست جے پور کے حکام کے اس فیصلے پر غم و غصے کا اظہار کیا گیا تھا جس کی رو سے مسلمانوں کو کلمہ پڑھنے اور اذان دینے سے روک دیا گیا تھا۔[۲۶۴] چوتھی قرارداد میں حکومت فرانس کی بربروں کی جبری تبدیلی مذہب کی پالیسی اور اطالوی حکومت کی طرف سے مسلمانان طرابلس کو منتشر کرنے کی مہم پر اظہار تشویش کیا گیا تھا۔[۲۶۵]

۲۶۰- پیرزادہ، ایضاً، ص ۱۷۲۔

۲۶۱- اے ایم ایف، جلد ۱۵۴، ص ۶۱-۶۲۔

۲۶۲-ایضاً۔ ۲۶۳- ایضاً۔ ۲۶۴-ایضاً۔ ۲۶۵-ایضاً۔

ان قراردادوں کے علاوہ پانچ مزید قراردادوں کے مسودے مسلم لیگ ریکارڈز میں ملتے ہیں۔ پہلی قرارداد میں مسلم لیگ کے اس دیرینہ مطالبہ کا اعادہ کیا گیا تھا کہ سندھ کو بمبئی سے جلد از جلد علیحدہ کر کے ایک الگ صوبے کی حیثیت دی جائے۔ اسے پشاور سے کے۔ایم اسلم نے تجویز کیا اور چودھری مجید نے اس کی تائید کی۔[۲۶۶] دوسری قرارداد جسے مظفر حسین چودھری نے پیش کیا اور جس کی تائید ڈاکٹر اے خان نے کی، میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ بلوچستان اور صوبہ سرحد میں آئینی اصلاحات متعارف کرائی جائیں۔[۲۶۷]

ممتاز لیگی رہنما عبداللہ الکافی کی طرف سے اس قرارداد میں یہ ترمیم پیش کی گئی تھی کہ بلوچستان اور صوبہ سرحد کے علاوہ ایسے تمام نئے صوبے بھی جو دوسرے صوبوں سے علیحدگی کے ذریعے تشکیل پائیں (مثلاً سندھ) ان میں بھی وہی نظام حکومت ہونا چاہیے جو ہندوستان کے دوسرے صوبوں میں رائج ہے۔[۲۶۸] تیسری قرارداد جسے ڈاکٹر اے خان نے تجویز کیا اور جس کی تائید ابوطاہر محمد احمد نے کی، میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ آئندہ تمام مردم شماریوں میں نچلی ذاتوں اور اچھوتوں کی علیحدہ درجہ بندی کی جائے اور انھیں ''ہندوؤں'' کے عمومی زمرے میں ظاہر نہ کیا جائے۔[۲۶۹] چوتھی قرارداد جسے اے۔آر بخاری نے تجویز کیا اور جسے تصدق احمد خان شیروانی (۱۸۸۴ء-۱۹۳۵ء) اور ایم طفیل احمد کی تائید حاصل تھی، قانونی و آئینی معاملات سے متعلق تھی۔ اس میں منجملہ دیگر اُمور کے یہ مطالبہ بھی کیا گیا تھا کہ ہندوستانی عدالتوں کے تسلیم شدہ اسلامی قوانین میں مرکزی یا صوبائی کونسلوں کی کسی قانون سازی کے ذریعے کوئی ترمیم یا مداخلت نہ کی جائے جب تک اسے متعلقہ مجلس کے مسلم اراکین کی اکثریت کی حمایت حاصل نہ ہو۔[۲۷۰] پانچویں قرارداد جس کے محرک و تائید کنندہ کا نام درج نہیں ۲ ردسمبر ۱۹۳۰ء کی تحریر شدہ ہے جس میں ممتاز ہندو رہنما تلک کی وفات پر اظہار تاسف کیا گیا تھا اور اس کی سیاسی خدمات کی تحسین کرتے ہوئے

۲۶۶- ایضاً ص ۶۳-۶۴۔

۲۶۷- ایضاً۔

۲۶۸- ایضاً۔

۲۶۹- ایضاً۔

۲۷۰- ایضاً۔

اس کے غم زدہ خاندان کے ساتھ اظہار ہمدردی کیا گیا تھا۔[۲۷۱] ان تمام قراردادوں پر ۲۹ردسمبر کی سہ پہر کو ہونے والی سبجیکٹ کمیٹی کے اجلاس میں غور کیا گیا جس میں پچیس اراکین نے شرکت کی۔[۲۷۲] اس اجلاس میں صلاح ومشورہ کے بعد کل سات قراردادوں کی منظوری دی گئی جنھیں ۳۰ردسمبر کو مسلم لیگ کے کھلے اجلاس کی دوسری نشست میں بحث کے لیے پیش کیا گیا جس کی صدارت علامہ اقبال نے کی۔ پہلی قرارداد میں، جو صدرِ مجلس کی طرف سے پیش ہوئی اور جسے متفقہ طور پر منظور کیا گیا، مسلم لیگ کے پرانے اور ممتاز اراکین مولوی مظہر الحق (۱۸۶۶ء-۱۹۳۰ء)، صاحب زادہ آفتاب احمد خان (۱۸۶۷ء-۱۹۳۰ء)، مرزا علی محمد خان، سر ابراہیم ہارون جعفر (۱۸۸۱ء-۱۹۳۰ء) اور سید بشارت علی جالب دھلوی (۱۸۷۴ء-۱۹۳۰ء) کی وفات پر لیگ کی جانب سے اظہارِ تاسف اور غمزدہ خاندانوں سے اظہار ہمدردی کیا گیا تھا۔[۲۷۳] دوسری قرارداد جسے گیا کے سید حسین امام نے پیش کیا اور اِلٰہ آباد کے ڈاکٹر ایم یو ایس جنگ نے جس کی تائید کی، میں کہا گیا تھا کہ حکومت ہند کا مراسلہ برائے آئینی اصلاحات میں موجود سفارشات ہندوستانی خواہشات کو بالعموم اور مسلم مطالبات کو بالخصوص پورا نہیں کر سکیں گی۔[۲۷۴]

تیسری قرارداد نے، جسے لاہور کے مشہور صحافی سید حبیب شاہ نے پیش کیا تھا، ایک طویل اور تلخ بحث کو جنم دیا۔ اس قرارداد میں پہلی گول میز کانفرنس کے مسلم شرکاء کی ان متفقہ کوششوں کی تحسین کرتے ہوئے جو مسلم نقطہ نظر کے پُرخلوص اظہار پر مبنی تھیں، یہ اُمید ظاہر کی گئی تھی کہ وہ آل انڈیا مسلم کانفرنس کی قرارداد دہلی (۱۹۲۹ء) کی منظوری کے لیے متحد ہو کر جدوجہد کریں گے۔[۲۷۵]

سید حبیب شاہ نے قرارداد پیش کرتے ہوئے کہا کہ یہ مقام تشکر ہے کہ گول میز کانفرنس کے مسلم شرکاء مسلمانوں کی طرف سے نہ چنے جانے کے باوجود، مسلم مطالبات کی حمایت کر رہے ہیں اور اس بات پر زور دیا کہ آئندہ آئین کے متعلق گول میز کانفرنس کا جو بھی فیصلہ ہو، اس کو قبول یا

۲۷۱- ایضاً، ص۶۹۔

۲۷۲- پیرزادہ، ایضاً، ص۱۷۲۔

۲۷۳- ایضاً۔

۲۷۴- ایضاً۔

۲۷۵- ایضاً۔

مسترد کرنے کا سوال ایک ایسا معاملہ ہے جو مسلمانان ہند سے متعلقہ ہے اور وہ کسی ایسے فیصلے کو ماننے کے لیے تیار نہ ہوں گے جو ان کے حقوق کی حفاظت نہ کرتا ہو۔[۲۷۶] اس قرارداد کی مخالفت کرتے ہوئے اِلٰہ آباد کے ڈاکٹر ایم یو ایس جنگ نے آل انڈیا مسلم کانفرنس کے موقف کو محدود نقطہ نگاہ کا حامل قرار دیا اور قائداعظم کے پیش کردہ چودہ نکات کی حمایت کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ گول میز کانفرنس کے مسلم شرکاء کے اختیارات پر کوئی قدغن نہ لگائی جائے اور انھیں ایک اطمینان بخش تصفیہ پر پہنچنے کے لیے صوابدیدی اختیارات دیے جائیں۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ یہ بات مسلم لیگ جیسی قدیم جماعت کی توقیر کے منافی ہے کہ وہ مسلم کانفرنس جیسی نوزائیدہ تنظیم کی منظورشدہ قرارداد کو اختیار کر لے۔[۲۷۷]

بعد میں آنے والے مقررین کی اکثریت نے ڈاکٹر ایم یو ایس جنگ کے خیالات کو مسترد کر دیا۔ سر عبداللہ ہارون نے اصل قرارداد کی حمایت کرتے ہوئے کہا کہ وہ گول میز کانفرنس کے مسلم شرکاء کو کوئی اختیار دینے کے قائل نہیں ہیں کیونکہ انھیں ہندی مسلمانوں کی طرف سے منتخب کر کے لندن نہیں بھیجا گیا۔ متفقہ مسلم مطالبات ان کے سامنے ہیں اور اگر ان کی روشنی میں وہ کوئی مذاکرات کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں مگر کسی حتمی تصفیے کی شرائط کو تسلیم کرنے کا اختیار صرف ہندوستان کے مسلمانوں کے پاس ہے۔[۲۷۸] حفیظ الرحمٰن نے مسلم کانفرنس کی نمائندہ حیثیت پر ڈاکٹر جنگ کے خیالات پر شدید نکتہ چینی کی جس سے اجلاس میں ناخوشگوار صورت حال پیدا ہو گئی۔ معاملے کو سنبھالتے ہوئے مولوی محمد یعقوب نے کہا کہ تصفیہ طلب مسئلہ یہ نہیں کہ مسلم کانفرنس کی دہلی قرارداد یا مسٹر جناح کے ۱۴ نکات مسلمانوں کے نقطہ نظر کی ترجمانی کرتے ہیں یا نہیں بلکہ غور طلب بات یہ ہے کہ آیا مسلم لیگ کسی سمجھوتے تک پہنچنے کے لیے گول میز کانفرنس کے مسلم مندوبین کو کوئی اختیار دے سکتی ہے؟[۲۷۹] مولوی محمد یعقوب نے اس بات کی تائید نہیں کی کہ مسلم مندوبین کو مسلمانوں

۲۷۶- ایضاً۔

۲۷۷- ایضاً، ص ۱۷۳۔

۲۷۸- ایضاً۔

۲۷۹- ایضاً۔

کے نمائندے نہیں گردانا چاہیے کیونکہ ان کے خیال میں ایسا کوئی اعلان نہ صرف مسلم رہنماؤں کی توقیر میں کمی کا باعث بنے گا بلکہ جب وہ مسلم مطالبات پر زور دیں گے تو ان کے مخالفین اور خود حکومت کو یہ کہنے کا موقع ملے گا کہ ان کے خیالات ہندوستان کے مسلمانوں کے خیالات کے ترجمان نہیں۔[280] اس موقع پر سید محمد حسین نے رائے زنی کرتے ہوئے کہا کہ حکومت میں اتنی جرأت نہیں کہ وہ مسلم شرکاء کو کہیں کہ وہ مسلمانوں کے نمائندے نہیں کیونکہ ان کا انتخاب وائسرائے نے خود کیا تھا اور اگر حکومت یہ خیال کرتی ہے کہ وہ نمائندہ حیثیت نہیں رکھتے تو پھر مسلمانوں کے حقیقی نمائندے کیوں کانفرنس میں مدعو نہیں کیے گئے؟ ان کا خیال تھا کہ مسلمانوں کو مسلم شرکاء کے سامنے بار بار اپنے مطالبات دہرانے چاہئیں اور ان کو خبردار کر دینا چاہیے کہ اس سے کم تر کوئی شے بھی ان کو قابل قبول نہ ہوگی۔ بعد میں قرارداد پر رائے شماری ہوئی جس کے نتیجے میں ڈاکٹر جنگ کی پیش کردہ ترمیم مسترد کر دی گئی اور سید حبیب شاہ کی قرارداد اصل حالت میں منظور کر لی گئی۔[281]

اجلاس میں منظور شدہ چوتھی قرارداد کو مولوی محمد یعقوب نے پیش کیا اور اسے مولانا عبدالماجد کی تائید حاصل تھی۔ اس قرارداد میں کہا گیا تھا کہ آل انڈیا مسلم لیگ شمال مغربی سرحدی صوبے کے مخصوص حالات کا مکمل ادراک رکھتے ہوئے اور اس کے دفاع کے لیے خصوصی اقدامات کی ضرورت کو تسلیم کرتے ہوئے اس خیال کی پُرزور حامی ہے کہ صوبے میں جاری مسلسل سیاسی بے چینی اس وقت تک دور نہیں کی جا سکتی اور نہ مقامی رائے عامہ ایسے انتظامی منصوبے سے مطمئن ہو سکتی ہے جو ملک کے دوسرے صوبوں کے مقابلے میں صوبہ سرحد کو کم تر حیثیت دیتا ہو۔ محرک نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ سائمن کمیشن اور مرکزی سائمن کمیٹی کی رپورٹ کی طرح حکومت ہند کے مراسلے نے بھی شمال مغربی سرحدی صوبے کے مسئلے کا کوئی اطمینان بخش حل تجویز نہیں کیا اور نہ ہی حکومت نے اس موضوع پر قانون ساز اسمبلی کی متعدد بار منظور کی جانے والی قراردادوں پر کوئی عملی قدم اُٹھایا ہے۔[282]

۲۸۰- ایضاً، ص ۱۷۳-۱۷۴۔

۲۸۱- ایضاً، ص ۱۷۴۔

۲۸۲- ایضاً، ص ۱۷۵۔

اجلاس میں منظور شدہ پانچویں قرار داد کو مولانا عبدالماجد نے پیش کیا اور مولوی عبدالقادر نے اس کی تائید کی۔[283] اس قرار داد میں کہا گیا تھا کہ مسلم لیگ کی رائے میں ہندوستان کے مسلمان ایسے کسی آئین کے نفاذ سے مطمئن نہیں ہوں گے جس میں پنجاب اور بنگال کی مجالس قانون ساز میں مسلم نمائندگی آبادی کی بنیاد پر نہ ہو، سندھ کو فوراً اور بلاشرط علیحدہ صوبے کی حیثیت نہ دی جائے اور صوبہ سرحد اور برطانوی بلوچستان کو مکمل اختیارات نہ عطا کیے جائیں۔ نیز یہ کہ مسلمان ہندوستان کے لیے صرف اس وفاقی آئین کو اختیار کریں گے جس میں مذکورہ بالا اکائیوں سے صوبائی خودمختاری کے معاملے میں وفاق کے دوسرے اجزا کے برابر سلوک کیا جائے گا۔ قرار داد کے محرک کا خیال تھا کہ برطانوی حکومت اور اکثریتی فرقہ کی کوشش ہے کہ مسلمان کسی بھی صوبے میں برسر اقتدار نہ ہوں۔[284] چھٹی قرارداد کو حسین امام نے پیش کیا اور اس کی تائید ایم عظیم اور سید حبیب شاہ نے کی۔[285] اس قرار داد میں کہا گیا تھا کہ مسلم لیگ اس امر کو ضروری اور لازم خیال کرتی ہے کہ سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کی معقول نمائندگی کے لیے آئینی تحفظات فراہم کیے جائیں۔[286] آخری اور ساتویں قرار داد کے ذریعے جس کو ڈاکٹر علی نے پیش کیا، ممتاز لیگی رہنماؤں نواب محمد اسمٰعیل خان، قاضی مسعود حسین اور مولوی محمد یعقوب پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی گئی جس کو مسلم لیگ کے آئین کی از سر نو نظر ثانی اور ترامیم تجویز کرنے کا کام سونپا گیا۔[287]

علامہ اقبال دوسرے اجلاس کی ایک گھنٹے تک صدارت کرنے کے بعد اس وقت جلسہ گاہ سے چلے گئے جب تیسری قرارداد پر بحث وتمحیص کے دوران شرکاء میں تلخی پیدا ہوگئی۔ ان کے چلے جانے کے بعد نواب محمد اسمٰعیل خان نے کرسی صدارت سنبھالی۔[288] دوسرے اجلاس کے شرکاء کی تعداد پہلے دن کے مقابلے میں خاصی کم تھی اور یہ ظاہر تھا کہ اجلاس میں موجودہ مسلم لیگ کے

۲۸۳- اے ایم ایف، جلد ۱۵۴، ص ۷۰-۷۱۔

۲۸۴- پیرزادہ، ایضاً، ص ۱۷۵۔

۲۸۵- اے ایم ایف، جلد ۱۵۴، ص ۷۰-۷۱۔

۲۸۶- پیرزادہ، ایضاً، ص ۱۷۵۔

۲۸۷- ایضاً۔

۲۸۸- ایضاً، ص ۱۷۲۔

کے ممبران کی تعداد مقررہ کورم کے مطابق نہیں۔ مگر جب ڈاکٹر جنگ نے پوائنٹ آف آرڈر کے ذریعے اس کی نشاندہی کی تو نواب اسمٰعیل نے یہ اعتراض مسترد کرتے ہوئے کہا کہ کورم کی کمی کا مسئلہ پہلے دن اُٹھانا چاہیے تھا اور چونکہ موجودہ اجتماع ایک ملتوی شدہ نشست ہے، اس لیے کسی کورم کی ضرورت نہیں ہے۔[۲۸۹]

اجلاس کے اختتام پر مولوی محمد یعقوب اور بیرسٹر ظہور احمد نے مسلم لیگ کی جانب سے صدر اجلاس اور منتظمین جلسہ کا شکریہ ادا کیا۔ مولوی محمد یعقوب نے اپنی تقریر کے دوران اعتراف کیا کہ موجودہ اجلاس لیگ اپنے پچھلے اجلاسوں کے مقابلے میں اتنا نمائندہ نہیں ہے مگر ان کے خیال میں اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ بہت سے مسلم رہنما ہندوستان سے باہر تھے۔ چنانچہ اس موقع پر منعقد کی جانے والی کسی بھی کانفرنس کے ساتھ یہی معاملہ ہوگا۔ انھوں نے اس بات کی طرف بھی توجہ دلوائی کہ ہندو رہنماؤں کی عدم موجودگی کے باعث ساٹھ سال میں پہلی دفعہ انڈین نیشنل کانگریس امسال اپنا سالانہ اجلاس منعقد نہیں کرسکی۔[۲۹۰]

علامہ اقبال نے آلہ اباد میں کل دو دن قیام کیا۔ عبدالحیٔ عباسی راوی ہیں کہ ۲۹ر دسمبر ۱۹۳۰ء کی سہ پہر وہ بیرسٹر ظہور احمد کے ساتھ پیدل علاقے میں گھومتے رہے اور بہت سے لوگوں اور دکانداروں نے ان سے علیک سلیک کی۔ دوسرے دن جسٹس سر شاہ محمد سلیمان (۱۸۸۶ء-۱۹۴۱ء) نے ان کی دعوت کرنا چاہی مگر وہ لاہور واپس جانے کی بنا پر اس میں شریک نہ ہوسکے۔ البتہ انھوں نے اکبر اِلٰہ آبادی کی قبر پر جا کر دعائے مغفرت کرنے کی خواہش ظاہر کی چنانچہ مفتی فخرالاسلام انھیں پرانا کالا ڈنڈا کے قبرستان لے گئے جہاں اکبر مدفون تھے۔ علامہ نے وہاں فاتحہ پڑھی اور قبر کی خستہ حالی پر اظہار افسوس کرتے ہوئے کہا کہ ''اتنے بڑے آدمی کی قبر اور اس کی یہ حالت''۔[۲۹۱]

اِلٰہ آباد میں فقید المثال استقبال اور بے پناہ عوامی محبت کے مظاہروں کے باوجود علامہ اقبال کی فروتنی اور انکسار میں کوئی فرق نہ آیا۔ ریاض اِلٰہ آبادی جو وہاں ایک مدرسہ میں فارسی اور

۲۸۹- ایضاً، ص۱۷۳، قواعد لیگ کے مطابق اجلاس کے لیے کم از کم پچہتر اراکین کا کورم ہونا لازم تھا۔

۲۹۰- ایضاً، ص۱۷۵-۱۷۶۔

۲۹۱- زمن، ایضاً، ص۵۰۳۔

اُردو کے مدرس تھے، علامہ اقبال سے عین لاہور واپس جانے کے وقت ریلوے اسٹیشن پر ہونے والی ملاقات کا تذکرہ کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ انھوں نے علامہ سے ان کے ایک شعر کا مطلب دریافت کیا۔ علامہ نے ٹالنے یا عدم فرصت کا بہانہ کرنے کی بجائے انتہائی اخلاق سے ان کا ہاتھ تھاما اور انھیں ریلوے اسٹیشن پر واقع انتظار گاہ میں لے گئے اور وہاں بیٹھ کر انھیں اس شعر کا مفصل مفہوم سمجھانے لگے۔ کچھ دیر بعد ٹرین آ گئی اور وہ لاہور کے لیے رخصت ہو گئے۔ [۲۹۲]

VII

علامہ اقبال کی نثری نگارشات میں خطبہ الٰہ آباد کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہوئی اور اس کے مختلف پہلوؤں پر نامور اہل قلم نے دادِ تحقیق دی۔ [۲۹۳] تاہم یہ امر تعجب خیز ہے کہ عرصہ دراز تک اس کے ترجمہ وتحشیہ کی طرف خاطر خواہ توجہ نہ دی جا سکی۔ خطبہ کا پہلا مکمل ترجمہ روزنامہ انقلاب کی جنوری ۱۹۳۱ء کی دو اشاعتوں میں شائع ہوا جو غالباً مولانا غلام رسول مہر کے زورِ قلم کا ثمر تھے۔ [۲۹۴]

اس کے علاوہ ۱۹۳۱ء ہی میں سید نذیر نیازی نے علامہ کی اجازت سے خطبے کا ایک اور ترجمہ کیا جو رسالہ صوفی منڈی بہاؤالدین کے زیرِ اہتمام چھپا اور ہزاروں کی تعداد میں مفت تقسیم کیا گیا۔ [۲۹۵] اس کے بعد کئی دہائیوں تک اس کے ازسرِنو ترجمہ کی نوبت نہ آئی۔ سال اقبال ۱۹۷۷ء

۲۹۲- ایضاً۔

۲۹۳- تفصیلات کے لیے دیکھیے بشیر احمد ڈار ''خطبہ الٰہ آباد کے متعلق اقبال کے چند نادر خطوط'' صحیفہ اقبال، مرتبہ یونس جاوید، لاہور، ۱۹۸۶ء، ص ۶۸-۷۷ رحیم بخش شاہین، ''اقبال کا خطبہ الٰہ آباد۔ منظر و پس منظر'' مجلّہ اقبال ریویو، لاہور، جنوری ۱۹۷۷ء، ص ۳۱-۳۵ جاوید اقبال، زندہ رود، جلد سوم، لاہور، ۱۹۸۹ء، ص-۶۲۲-۶۹۳۔ یوسف حسن، ''خطبہ الٰہ آباد کے چند پہلو'' اقبال شناسی اور فنون، مرتبہ سلیم اختر، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۲۶۰-۲۸۹، محمد حنیف شاہد، ''اقبال کا خطبہ الٰہ آباد'' سہ ماہی فکر و نظر، اسلام آباد، جلد ۱۴، نمبر ۱۰، ۱۱، مئی اپریل ۱۹۷۷ء، ص ۵۵۵-۵۶۴، عبدالسلام خورشید، سرگزشت اقبال، لاہور، ۱۹۷۷ء، ص ۳۰۷-۳۲۰، عبدالحمید، اقبال بحیثیت مفکر پاکستان، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۱۴۵-۱۵۴، محمد جہانگیر عالم، تحریک پاکستان، فیصل آباد، ۱۹۷۷ء، ص ۱۳۴-۱۳۷۔

۲۹۴- برنی، ایضاً ص ۱۸۸۔

۲۹۵- سید نذیر نیازی، مرتبہ، مکتوبات اقبال، کراچی، ۱۹۵۷ء، ص ۶۷۔

میں جہاں اقبالیات کے کئی اور گوشے منور ہوئے وہاں ممتاز صحافی اور تحریک پاکستان کے کارکن، مختار زمن (۲۰۰۳۔۱۹۲۴ء) نے ایک جامع تمہید کے ساتھ اس کا ترجمہ ماہنامہ نقوش کے اقبال نمبر میں شائع کروایا جو اپنی سلاست اور انداز بیان کی بنا پر خاصا مقبول ہوا۔[۲۹۶] مگر خطبہ الٰہ آباد میں کئی مقامات ایسے تھے جو مفصل تشریح کے محتاج تھے۔ اس ضرورت کو کسی حد تک پروفیسر جہانگیر عالم نے ۱۹۸۴ء میں پورا کیا جب انھوں نے پہلی دفعہ خطبے کا ترجمہ مع تحشیہ شائع کروایا۔[۲۹۷] یہ ترجمہ روانی اور اسلوب بیان کے اعتبار سے سب ترجموں میں سے ممتاز ہے اور اسی وجہ سے زیر نظر مقالہ میں، چند جزوی ترامیم کے ساتھ، اسی کو اختیار کیا گیا ہے۔

۲۹۶- دیکھیے: زمن، ایضاً، ص ۴۴۹-۵۲۲۔

۲۹۷- دیکھیے محمد جہانگیر عالم، ''علامہ اقبال کا خطبہ الٰہ آباد'' مجلّہ اقبال، لاہور، جولائی ۱۹۸۴ء۔

متن خطبۂ صدارت

سالانہ اجلاس آل انڈیا مسلم لیگ ۱۹۳۰ء منعقدہ الٰہ آباد

(اُردو ترجمہ)

حضرات! میں آپ کا بے حد ممنون ہوں کہ آپ نے مجھے آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس کی صدارت کا اعزاز ایک ایسے وقت میں بخشا ہے جو ہندوستان میں مسلم سیاسی فکر و عمل کی تاریخ میں نازک ترین لمحات ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اس عظیم الشان اجتماع میں ایسے اصحاب بھی موجود ہیں جن کا سیاسی تجربہ مجھ سے کہیں زیادہ ہے اور جن کی معاملہ فہمی کا میں بے حد احترام کرتا ہوں۔ لٰہذا یہ بڑی جسارت ہوگی کہ جن سیاسی فیصلوں کے لئے وہ یہاں آج جمع ہوئے ہیں، ان کے سلسلے میں ان کی راہ نمائی کا دعویٰ کروں۔ میں کسی جماعت کا راہ نما نہیں ہوں اور نہ ہی کسی راہ نما کا پیرو ہوں۔ میں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اسلام، اس کے نظام سیاست و قانون، اس کی ثقافت، اس کی تاریخ اور اس کے ادب کے مطالعہ میں صرف کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ روح اسلام کے ساتھ مسلسل تعلق کی بدولت جس کا اظہار وقت کے ساتھ ہو رہا ہے، میرے اندر اسلام کو ایک اہم عالم گیر حقیقت کی حیثیت سے دیکھنے کی بصیرت پیدا ہو گئی ہے۔ چنانچہ یہ فرض کرتے ہوئے کہ ہندوستان کے مسلمان اسلام کی روح سے اپنی وابستگی برقرار رکھیں گے میں اپنی اس بصیرت کی روشنی میں، جس کی قدر و قیمت خواہ کچھ ہو، آپ کے فیصلوں میں آپ کی راہ نمائی کرنے کا دعویٰ تو نہیں کرتا تاہم آپ کے دل میں اس بنیادی اصول کا احساس پیدا کرنے کی ایک عاجزانہ کوشش کروں گا جس پر میرے خیال میں ان تمام فیصلوں کا عموماً انحصار ہونا چاہیے۔

اسلام اور قومیت

یہ نا قابل انکار حقیقت ہے کہ اسلام بطور ایک اخلاقی نصب العین اور سیاسی نظام مسلمانان

ہند کی تاریخ کا اہم ترین جزو ترکیبی رہا ہے۔ اس اصطلاح سے میری مراد ایک ایسا معاشرتی ڈھانچہ ہے جس کا نظم وضبط ایک مخصوص اخلاقی نصب العین اور نظام قانون کے تحت عمل میں آتا ہے۔ اسلام ہی نے وہ بنیادی جذبات اور وفاکشی فراہم کی جو منتشر انسانوں اور گروہوں کو بتدریج متحد کرتی ہے اور بالآخر انھیں ایک اپنا اخلاقی شعور رکھنے والی متمیّز و معین قوم میں تبدیل کر دیتی ہے۔ حقیقت میں یہ کہنا کوئی مبالغہ نہیں ہے کہ دنیا بھر میں شاید ہندوستان ہی ایک ایسا ملک ہے جہاں اسلام ایک بہترین مردم ساز قوت کی حیثیت سے جلوہ گر ہوا ہے۔ دوسرے ممالک کی طرح ہندوستان میں بھی اسلامی معاشرہ تقریباً پوری طرح ایک مخصوص اخلاقی نصب العین کی ثقافت سے بنا ہے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ مسلم معاشرہ اپنی نمایاں ہم آہنگی اور اندرونی اتحاد کی جس صورت میں ارتقا پذیر ہوا ہے، وہ ان قوانین اور اداروں کے باعث ہے جو اسلامی ثقافت سے وابستہ ہیں۔ مغرب کے سیاسی فکر نے جن خیالات کو پیش کیا ہے، ان سے اب ہندوستان اور ہندوستان سے باہر مسلمانوں کی موجودہ نسل کا نقطۂ نظر تیزی سے بدل رہا ہے۔ ہمارے نوجوان ان افکار سے متاثر ہو کر یہ چاہتے ہیں کہ ان کے ممالک میں بھی ایسے ہی افکار زندہ قوت بن جائیں لیکن وہ ان حقائق پر گہری نگاہ نہیں رکھتے جن کی بنا پر یورپ میں ان افکار نے نشوونما پائی۔ یورپ میں عیسائیت محض ایک رہبانی نظام تھا جو بتدریج ایک وسیع کلیسیائی تنظیم کی صورت اختیار کر گیا۔ لوتھر[۲۹۸] کا احتجاج اس کلیسیائی تنظیم کے خلاف تھا، وہ کسی لادینی نظام سیاست کے خلاف نہ تھا کیونکہ

۲۹۸- مارٹن لوتھر (۱۴۸۳ء - ۱۵۴۶ء) سولھویں صدی میں شروع ہونے والی تحریک اصلاح اور عیسائیت کے ایک بڑے مکتب فکر پروٹسٹنٹ ازم کا بانی ہے جن کا شمار مغربی تہذیب اور عیسائیت کی اہم ترین تحاریک میں ہوتا ہے۔ اس نے اپنی سرگرمیوں اور تحریروں کی بدولت نہ صرف اپنے ہم عصر معاشرے کو متاثر کیا بلکہ بعد میں رونما ہونے والی کئی سماجی، مذہبی اور سیاسی اصلاحات کی بھی بنیاد رکھ دی۔ وہ ۱۰ رنومبر ۱۴۸۳ء کو جرمنی میں پیدا ہوا۔ اس نے نوعمری ہی میں انجیل کا بغور مطالعہ کیا اور ۱۵۰۱ء میں جرمنی کی ممتاز جامعہ، یونیورسٹی آف آرفرٹ سے آرٹس میں میٹرک کر لیا۔ ۱۵۰۵ء میں لوتھر نے ایماء کا امتحان پاس کیا جو اس وقت کے تعلیمی معیار کے اعتبار سے اہم کامیابی تھی۔ اس کی ابتدائی دلچسپی کا مرکز مطالعہ قانون تھا مگر جلد ہی وہ مذہب کے عمیق مطالعہ کی طرف راغب ہو گیا۔ اس نے مارچ ۱۵۰۹ء میں بائبل کے اختصاصی مطالعہ کی سند وی ٹن برگ یونیورسٹی سے حاصل کی اور اکتوبر ۱۵۱۲ء میں اسے ڈی،

ٹی، ایچ کی ڈگری تفویض کی گئی۔ بعدازاں اسے باقاعدہ مصلح مقرر کر دیا گیا۔ اس کے کیتھولک چرچ سے اختلافات کی بنیاد ۱۵۱۰ء میں پڑی جب سفر روم کے دوران اس پر پاپائیت کی تعیش پسند زندگی اور دنیاوی معاملات سے رغبت کا راز کھلا۔ ۱۵۱۴ء میں اس کی لیبرش چرچ میں تعیناتی نے اس کو کلیسیائی معاملات کی پستی کا چشم دید مشاہدہ کرنے کا موقع فراہم کیا۔ اپنے تلخ تجربات کی روشنی میں لوتھر نے نہ صرف پاپائیت سے بیزاری ظاہر کرنا شروع کر دی بلکہ یونانی فلسفہ کی تعلیم کی بجائے مطالعہ انجیل کی اہمیت پر زور دینے لگا۔ پاپائے روم سے اس کی کھلا کھلم مخالفت کا آغاز اس وقت ہوا جب اس نے ۱۵۱۷ء میں ایک یادداشت کے ذریعے 'مغفرت ناموں' کی خرید وفروخت پر آواز احتجاج بلند کی۔ اس زمانے میں رائج کلیسیائی قوانین کے مطابق 'گناہ گار' بھاری معاوضے کے عوض اپنے گناہوں سے بریت حاصل کر سکتے تھے اور ایسی اسناد جن کے ذریعے گناہ گاروں کو جنت کی نوید سنائی جاتی تھی، 'مغفرت نامے' کہلاتی تھیں۔ اس رسم سے حاصل شدہ آمدنی عموماً پادریوں کی عیش وعشرت پر صرف ہو جایا کرتی تھی۔ اپریل ۱۵۱۸ء میں لوتھر کے باغیانہ رویے کے سبب اسے کلیسیائی ذمہ داریوں سے علیحدہ کر دیا گیا اور اس پر مذہبی عدالت میں مقدمہ دائر کرنے کی تیاریاں شروع کر دی گئیں۔ اگلے دو سال کلیسیا روم اور مارٹن لوتھر کے درمیان مقدمہ بازی، الزامات اور مخالفانہ بیانات سے بھرپور تھے۔ آہستہ آہستہ جرمن عوام لوتھر کے دلائل اور تحریروں کی معقولیت سے اتفاق کرنے لگے اور کیتھولک چرچ سرعام تنقید کا نشانہ بننے لگا۔ ۱۵۲۰ء میں ''جرمن قوم کا عیسائی اشرافیہ کے نام خطاب'' نامی رسالہ میں لوتھر نے کھل کر جرمن عوام کو پاپائے روم کے خلاف اکسایا اور مذہبی معاملات میں اصلاحی طرز فکر اختیار کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ اس رسالہ کو جرمن عوام میں قابل ذکر پذیرائی حاصل ہوئی اور جلد ہی کیتھولک چرچ کے خلاف نفرت پوری قوم کے مزاج میں ڈھل گئی۔

سولھویں صدی کی دوسری دہائی میں لوتھر کے خیالات کی مقبولیت اپنے نقطہ عروج پر پہنچ گئی اور اس کے حامیوں کو پروٹسٹنٹ (احتجاج کرنے والا) کے نام سے پکارا جانے لگا۔ ۱۵۳۰ء-۱۵۴۶ء کے درمیانی عرصے میں لوتھر کے ساتھیوں اور شاگردوں نے جرمنی میں جابجا پروٹسٹنٹ چرچ قائم کر دیے اور جلد ہی لوتھر کی تحریک کے اثرات پوری مغربی دنیا میں مقبولیت حاصل کرنے لگے خصوصاً سکنڈے نیویا کے ممالک مکمل طور پر پروٹسٹنٹ رنگ میں رنگے گئے جب کہ آسٹریا اور ہنگری کے باشندے بھی آہستہ آہستہ پروٹسٹنٹ تحریک میں شامل ہونے لگے۔ ۱۸ر فروری ۱۵۴۶ء میں جب مارٹن لوتھر نے انتقال کیا تو اس کی فکر پورے یورپ کو اپنی گرفت میں لے چکی تھی اور بطور مذہبی راہنما وہ اپنی علیحدہ اور مستقل شناخت قائم کر چکا تھا۔ یہاں علامہ اقبال قرون وسطی میں یورپ میں کلیسیائی تنظیم کے خلاف لوتھر کے احتجاج اور بغاوت کا ذکر کر رہے ہیں۔

کسی قسم کے نظام سیاست کا عیسائیت میں کوئی وجود نہ تھا۔ اس تنظیم کے خلاف لوتھر کی بغاوت ہر طرح سے حق بجانب تھی۔ اگرچہ میرے خیال میں خود لوتھر کو اس امر کا احساس نہ تھا کہ یورپ میں جو مخصوص حالات پیدا ہو گئے تھے، ان سے اس کی بغاوت کا نتیجہ بالآخر یہ ہو گا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے عالم گیر اخلاقی نظام کی بجائے بے شمار قومی نظام پیدا ہو جائیں گے جن کا حلقہ محدود ہو گا۔ اسی لئے روسو[299] اور لوتھر جیسے لوگوں کی روشن خیال تحریکوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ نوع انسان کی وحدت کو توڑ کر غیر مربوط اور منتشر کثرت میں تبدیل کر دیا جس سے انسانیت کی اکائی اقوام میں تقسیم ہو گئی۔ اس نئے تصور کے لئے انھیں سے ایک زیادہ واضح اساس مثلاً تصور وطنیت کی ضرورت محسوس ہوئی جس کا اظہار مختلف نظام ہائے سیاست کی شکل میں ہوا۔ گویا وطن کو سیاسی اتحاد واتفاق کی بنیاد مان لیا گیا۔

۲۹۹- ژاں ژاک روسو (۱۷۱۲ء-۱۷۸۸ء) مشہور فرانسیسی فلسفی، مصنف اور سیاسی مفکر تھا جس کی تصانیف نے فرانسیسی انقلاب کے رہنماؤں اور رومانوی دور کے ادیبوں کو گہرا متاثر کیا۔ وہ ۲۸ جون ۱۷۱۲ء کو جنیوا میں پیدا ہوا۔ اس نے اپنی زندگی کا آغاز بحیثیت موسیقار کیا۔ ۱۷۵۲ء میں اس کے اوپیرا 'ہوشیار آدمی' کو بے حد شہرت حاصل ہوئی۔ اسی دور میں وہ بطور ادیب کے اپنی اہلیت کا لوہا منوا چکا تھا۔ ۱۷۵۵ء میں اس کا عدم مساوات کی شروعات کے موضوع پر پہلا سیاسی مضمون شائع ہوا جس میں اس نے طبقاتی عدم مساوات کی ابتداء، ارتقاء اور موجودہ صورت حال پر روشنی ڈالی تھی۔ اس مضمون نے یورپ کے سیاسی حلقوں میں بحث و تمحیص کے دروازے کھول دیے اور جلد ہی روسو سیاسیات کے طالب علموں کا مرکز نگاہ بن گیا۔ ۱۷۵۶ء میں روسو نے اپنے ناول 'جیولی' پر کام شروع کیا جو تکمیل کے بعد ۱۷۶۱ء میں شائع ہوا اور قارئین سے داد تحسین حاصل کی۔ ۱۷۶۲ء میں اس کی دو ممتاز تصانیف 'ایملی' اور 'معاہدہ عمرانی'، شائع ہوئیں جنھوں نے بے حد مقبولیت حاصل کی۔ اول الذکر میں آزاد ماحول میں بچوں کی تعلیم و تربیت پر زور دیا گیا ہے جبکہ دوسری میں انسانی معاشرے کے آغاز اور ارتقاء کی جمہوری توضیح کی گئی ہے۔ تاہم اس وقت کے بالادست طبقے اس آزاد خیالی کو برداشت کرنے کو تیار نہ تھے۔ چنانچہ نہ صرف فرانسیسی پارلیمنٹ نے ان دونوں کتابوں کو لائق مذمت ٹھہرایا بلکہ بڑھتی ہوئی تنگ نظری کے باعث وہ جلاوطنی پر مجبور ہو گیا۔ چند سالوں کے لیے سوئٹزرلینڈ اور برطانیہ میں مقیم رہنے کے بعد ۱۷۶۷ء میں وہ فرانس واپس چلا آیا اور اپنے انتقال تک وہیں مقیم رہا۔ وہ آخری ایام میں اپنی آپ بیتی 'اعترافات' لکھنے میں مصروف رہا جو اس کی وفات کے بعد ۱۷۸۲ء میں شائع ہوئی۔ روسو نے ۲ جولائی ۱۷۷۸ء کو فرانس میں انتقال کیا۔ یہاں علامہ اقبال روسو کی تحریروں کے نتیجے میں جنم لینے والی سیاسی روشن خیالی کا حوالہ دے رہے ہیں۔

اگر آپ کا مذہب کے بارے میں یہ خیال ہے کہ اس کا تعلق صرف آخرت سے ہے تو عیسائیت کا جو حشر یورپ میں ہوا ہے وہ بالکل قدرتی امر تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے عالم گیر اخلاقی نظام کی جگہ سیاسیات اور اخلاقیات کے قومی نظاموں نے لے لی۔ اس سے یورپ اس نتیجے پر پہنچنے کے لئے مجبور ہوا کہ مذہب فرد کا ذاتی معاملہ ہے اور اس کا دنیاوی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسلام انسان کی وحدت کو مادے اور روح کی متضاد دوئی میں تقسیم نہیں کرتا۔ اسلام میں خدا اور کائنات، روح اور مادہ، کلیسیا اور ریاست ایک کل کے مختلف اجزاء ہیں۔ انسان کسی ناپاک دنیا کا باشندہ نہیں ہے جسے کسی ایسی دنیا کی خاطر ترک کرے جو کہیں اور واقع ہے۔ اسلام کے نزدیک مادہ روح کی وہ شکل ہے جو زمان و مکان میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ یورپ نے غالباً مانویت[۳۰۰] کے زیر اثر روح اور مادے کی دوئی کو بلا غور و فکر قبول کر لیا ہے۔ اس کے بہترین مفکر اس ابتدائی غلطی

۳۰۰۔ مانویت تیسری صدی کے نصف اول میں عراق میں جنم لینے والا مذہب تھا جو عیسائیت، یہودیت، زرتشی مذہب اور بدھ مت کی تعلیمات سے متاثر تھا۔ اس کا بانی مانی نامی ایک شخص تھا جو اپنی ادبی تصانیف اور مصوری کی بنا پر قرون وسطیٰ میں ممتاز حیثیت کا حامل تھا۔ مانویت کی ترویج کا آغاز مانی نے ۱۲ اپریل ۲۴۰ء کو کیا۔ اس نے ابتدا میں ساسانی سلطنت کے فرماں روا شہنشاہ شاپور کو اپنی تعلیمات پیش کیں اور اس کے نام اپنی ایک فارسی تصنیف بھی منسوب کی۔ کچھ عرصے کے بعد مانی نے فارس اور بلوچستان کا رخ کیا اور وہاں اپنی دعوت کا پرچار کیا۔ اس کو سب سے پہلی نمایاں کامیابی اس وقت حاصل ہوئی جب ایران کے جنوب مغرب میں واقع ریاست توران کے بدھ حکمران، توران شاہ نے مانویت کو قبول کر لیا۔ مشہور ساسانی بادشاہ اردشیر کی وفات پر اس کے جانشین شاپور نے مانی کو ایران بلوایا اور اس کی در پردہ حمایت کی بنا پر مانویت ایران میں تیزی سے پھیلنے لگی۔ جلد ہی اعلیٰ سرکاری عہدے داروں اور شاہی خاندان کے افراد نے مانوی تعلیمات کو قبول کر لیا اور مانویت نے تقریباً ایران کے سرکاری مذہب کی حیثیت اختیار کر لی۔ یہ دور ساسانی حکمران شاپور اور اس کے جانشین ہرمز اول کی وفات کے بعد ختم ہو گیا اور زرتشی مذہب کے راہبوں نے مانویت کے خلاف ایک زوردار مہم جاری کر دی۔ رفتہ رفتہ اس کے پیروکاروں پر عرصہ حیات تنگ ہو گیا حتیٰ کہ ۲۷۷ء میں اس وقت کے ساسانی بادشاہ بہرام اول نے خود مانی ہی کو قتل کرا دیا اور سلطنت بھر میں اس کے ماننے والوں کو ظلم و تشدد کے ذریعے تبدیلی مذہب پر مجبور کیا جانے لگا۔ مگر پھر بھی مانویت کو مکمل طور پر ختم نہ کیا جا سکا اور خلافت عباسیہ تک اس کے پیروکار موجود رہے۔ آہستہ آہستہ ان کی تعداد کم ہوتی چلی گئی اور چودھویں صدی عیسوی تک یہ مذہب بالکل معدوم ہو گیا۔ مانوی عقائد کی بنیاد ثنویت پر ہے۔ زرتشی مذہب کی طرح اس میں اندھیرے اجالے کا گہرا تصور پایا جاتا ہے۔ جو شے اچھی اور مفید ہو اس کو روشنی سے نسبت دی جاتی ہے

کو آج محسوس کر رہے ہیں، لیکن اس کے سیاست دان بالواسطہ دنیا کو مجبور کر رہے ہیں کہ اسے ناقابل انکار عقیدے کے طور پر تسلیم کرلیں۔ دراصل روحانی اور دنیاوی زندگی میں امتیاز کرنے کا یہی غلط اُصول ہے جس سے یورپ کا مذہبی اور سیاسی فکر زیادہ طور پر متاثر ہوا ہے، اور اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ یورپ کی ریاستوں سے عیسائیت عملی طور پر بالکل بے دخل ہو چکی ہے۔ اس سے مختلف بے ربط ریاستیں قائم ہو گئی ہیں، جن میں انسانی جذبے کی بجائے قومی اغراض کی بالادستی ہے۔ یہ ہی بے ربط ریاستیں عیسائیت کے اخلاقی اور مذہبی عقائد کو پامال کرنے کے بعد اب ایک وفاق یورپ کی ضرورت کو یعنی اس اتحاد کو جو کلیسیائی تنظیم نے انھیں شروع میں عطا کیا تھا، محسوس کر رہی

اور جو شے بری اور نقصان دہ ہے وہ تاریکی سے تعلق رکھتی ہے۔ کائنات کی تخلیق، ارتقاء اور خاتمے کو تین ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ پہلا دور ایک سنہری زمانہ ہے جس میں روشنی اور ظلمت باہم مدغم نہیں ہوئے تھے۔ پھر موجودہ دور، جس میں اندھیرا اور اجالا کی قوتیں کائنات میں حتمی کنٹرول حاصل کرنے کی جدوجہد میں مصروف ہیں اور تیسرا آخری زمانہ، جس میں روشنی وتاریکی الگ ہو جائیں گی اور برائی اور اچھائی کے پیروکار بھی علیحدہ علیحدہ ہو جائیں گے۔ مانوی عقاید میں دنیا کو برائی کی قوتوں سے غالب سمجھا جاتا ہے۔ دنیا کے بارے میں مایوس کن تصورات کو مانویت کے پیروکاروں پر ہونے والے ظلم وستم نے مزید ہوا دی اور اس طرح روزمرہ زندگی اور دنیاوی حیات کے متعلق یاس انگیز رویہ، مانویت کا نشان امتیاز ٹھہرا۔ مانویت کے ماننے والوں کے لیے لازم تھا کہ دنیاوی معاملات میں دس قوانین پر عمل کریں جن میں یک زوجگی، عدم تشدد، دن میں چار مرتبہ عبادت، اپنی دولت کا دسواں یا ساتواں حصہ مذہبی راہبوں کی نذر کرنا، ہر اتوار کو روزہ رکھنا، سال بھر میں 30 دن روزے رکھنا، ہر سوموار کو اپنے گناہوں کا اعتراف کرنا اور ہر سال میں روزوں کے بعد سالانہ اجتماعی توبہ کرنا شامل تھے۔ مانویت کے مذہبی راہنما چار درجوں میں منقسم تھے۔ سب سے پہلے درجے والے 'معلم' کہلاتے جن کی زیادہ سے زیادہ تعداد بارہ ہوتی۔ اس کے بعد 'پروہت' ہوتے جو بہتر (۷۲) سے زیادہ کبھی نہ ہوتے۔ اس کے بعد تین سو ساٹھ (۳۶۰) 'خدمت گاروں' کا طبقہ تھا۔ چوتھے درجے والے 'منتخب' کہلاتے جو عام پیروکاروں میں سے چنے جاتے اور ان کی سب کی سربراہی کاہن اعظم کرتا۔ مانوی راہب شہروں میں تعمیر شدہ خانقاہوں میں رہتے اور عوام الناس کی مالی امداد پر گزر بسر کرتے۔ ان پر لازم تھا کہ وہ سچائی، عدم تشدد اور غربت کو اختیار کریں اور گوشت اور ناپاک خوراک سے پرہیز کریں۔ یہاں علامہ اقبال یورپ کے سیاسی مفکرین پر مانویت کے اثرات کا ذکر کر رہے ہیں۔ یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ آگسٹین جیسے نامور یورپی فلسفیوں نے مانویت کے نظام فکر کا گہرا اثر قبول کیا۔

ہیں لیکن انھوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے انسانی اخوت کے تصور کی روشنی میں اسے تعمیر کرنے کی بجائے لوتھر کے زیر اثر برباد کر دیا۔ بہرحال دنیائے اسلام میں کسی لوتھر کا ظہور ممکن نہیں کیونکہ یہاں کوئی کلیسیائی نظام نہیں جو از منہ وسطیٰ کے عیسائی نظام کے متشابہ ہو اور جس کے توڑنے کی ضرورت پیش آئے۔ دنیائے اسلام میں ایک عالم گیر نظام ریاست موجود ہے جس کے بنیادی نکات وحی و تنزیل کا نتیجہ اور ثمرہ ہیں۔ لیکن ہمارے فقہا جدید دنیا سے بے تعلق رہے ہیں، اس لئے موجودہ زمانے میں انھیں از سر نو مرتب کر کے مستحکم کرنے کی ضرورت ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ نظریہ قومیت کا انجام دنیائے اسلام میں کیا ہوگا؟ آیا اسلام اسے اپنے اندر جذب کر کے اس کو اسی طرح بدل دے گا جس طرح اس سے پہلے اس نے مختلف نظریات کو بدل دیا تھا، یا اس نظریہ (قومیت) سے خود اسلام کے اندر کوئی زبردست تغیر رونما ہو جائے گا۔ اس بارے میں پیش گوئی کرنا مشکل ہے۔ چند دن ہوئے لیڈن (ہالینڈ) کے پروفیسر وینسنک[۳۰۱] نے مجھے لکھا تھا:

۳۰۱- آرنٹ جان وینسنک (۱۸۸۲ء-۱۹۳۹ء) ایک ممتاز ڈچ مستشرق تھا جس نے اسلامیات، الٰہیات اور سامی مذاہب اور زبانوں کی تحقیق میں نام پیدا کیا اور مغربی علمی دنیا کو مشرقی علوم و فنون سے روشناس کرانے میں اہم کردار ادا کیا۔ وہ ۱۸۸۲ء میں ہالینڈ میں آرلینڈ ڈرون کے مقام پر پیدا ہوا۔ اس کی علمی تحقیق کا اولین مرکز مطالعہ الٰہیات تھا۔ بعد میں وہ سامیات کے مطالعہ کی طرف راغب ہو گیا اور عربی زبان و تہذیب میں اختصاص حاصل کیا۔ وینسنک نے ۱۹۰۸ء میں لیڈن کی یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کرنے کے بعد اٹریچ کی یونیورسٹی میں شامی اور آرامی تہذیبوں پر داد تحقیق دینا شروع کی۔ ۱۹۱۲ء سے ۱۹۲۷ء تک وہ عبرانی، آرامی اور سامی زبانوں کے ماہر کی حیثیت میں لیڈن یونیورسٹی میں کام کرتا رہا۔ ۱۹۲۷ء میں وہ اسی یونیورسٹی میں عربی اور اسلام کے پروفیسر کی حیثیت سے تعینات ہوا اور اپنی وفات تک اسی عہدے پر متمکن رہا۔ وینسنک کی علمی شہرت کا آغاز ۱۹۰۸ء میں اس وقت ہوا جب اسے انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کا معتمد مقرر کیا گیا اور اس کی نگرانی میں تمام اہم اسلامی موضوعات پر مغربی نقطہ نظر سے مقالات قلم بند کئے جانے لگے۔ اس نے خود بھی کئی اہم اسلامی موضوعات پر کام کیا اور سیرت پاک، احادیث شریفہ، مختلف اسلامی مکاتب فکر اور ان کے الٰہیاتی پس منظر اور اسلامی تہذیب کی نشو و نما پر کئی مقالات لکھے۔ اس نے مختلف الہامی مذاہب کے تاریخی مطالعہ میں بھی گہری دلچسپی لی اور یہودیت، عیسائیت اور اسلام میں پائے جانے والے اہم مشترکہ اُمور کی نشاندہی کی۔ مزید برآں اس نے علم کائنات، اقوام عالم کے مذہبی درجات، اخلاقیات، تصوف، اور مسلم مفکرین کے مغربی دنیا پر اثرات کے موضوعات پر بھی لکھا۔ آخری سالوں میں وینسنک نے نئے عہد نامے کے آرامی پس منظر پر تحقیق کی بنا ڈالی جس کو اس کے معاصرین اور متاخرین نے پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ اس نے ۱۹۳۹ء میں وفات پائی۔ یہاں علامہ اقبال اپنے نام پروفیسر وینسنک کے تحریر شدہ ایک خط کا حوالہ دے رہے ہیں جس میں اس نے اسلام کے مستقبل کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔

''مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسلام ایک ایسے بحران میں داخل ہو رہا ہے کہ جس نازک دور میں عیسائیت کو داخل ہوئے ایک صدی سے زیادہ (عرصہ) گزر چکا ہے۔ سب سے بڑی دشواری یہ ہے کہ قدیم تصورات کو ترک کر دینے کے ساتھ ساتھ مذہب کی بنیادوں کو کس طرح محفوظ رکھا جائے۔ میرے لئے کچھ کہنا مشکل ہے کہ اس کا نتیجہ عیسائیت کے حق میں کیا ہوگا اور اسلام کے متعلق کوئی پیش گوئی کرنا اور دشوار ہے۔''

اس وقت قومیت کے نظریے نے مسلمانوں کے نقطہ نگاہ کو نسل پرستی سے آلودہ کر دیا ہے اور اس طرح (یہ نظریہ) اسلام کے انسانیت پرور مقاصد میں بری طرح حائل ہو رہا ہے۔ ممکن ہے کہ نسل پرستی کے احساسات کی ترقی ایسے معیاروں کا محرک ہو جو اسلام کے معیار سے مختلف بلکہ متضاد ہو۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ مجھے اس بظاہر علمی بحث کے لئے معاف فرمائیں گے۔ آپ نے آل انڈیا مسلم لیگ کے اس اجلاس کی صدارت کے لئے ایک ایسے شخص کو منتخب کیا ہے جو اس امر سے مایوس نہیں ہے کہ اسلام اب بھی ایک زندہ قوت ہے جو انسان کے تصور کو جغرافیائی حدود سے آزاد کرا سکتی ہے جس کا یہ عقیدہ ہے کہ مذہب کو فرد اور ریاست کی زندگی میں بے انتہا اہمیت حاصل ہے اور جس کا ایمان ہے کہ اسلام بجائے خود تقدیر ہے اسے کسی دوسری تقدیر کے حوالے نہیں کیا جا سکتا۔ ایسا شخص مجبور ہے کہ معاملات کو خود اپنے ہی نقطہ نگاہ سے دیکھے۔ یہ خیال نہ کریں کہ جس مسئلے کی طرف میں اشارہ کر رہا ہوں وہ محض ایک نظری مسئلہ ہے۔ یہ ایک زندہ اور عملی مسئلہ ہے جس سے اسلام کے دستور حیات اور نظام عمل کے تار و پود متاثر ہو سکتے ہیں۔ ہندوستان میں ایک ممتاز ثقافتی وحدت کی حیثیت سے صرف اس مسئلے کے صحیح حل پر آپ کے مستقبل کا انحصار ہے۔ ہماری تاریخ میں اسلام پر آزمائش کا ایسا سخت دور کبھی نہیں آیا تھا جیسا کہ آج درپیش ہے۔ ایک قوم کو یہ حق تو حاصل ہے کہ وہ اپنے معاشرتی ڈھانچے کے بنیادی اصولوں میں ترمیم کرے یا ان میں نئے معنی تلاش کرے یا انھیں بالکل مسترد کر دے، لیکن نئے تجربات کرنے سے پہلے واضح طور پر یہ دیکھ لینا ضروری ہے کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ میں نہیں چاہتا کہ جس انداز سے میں اس مسئلے کو دیکھ رہا ہوں، اس سے یہ خیال پیدا ہو کہ جن حضرات کی سوچ میری سوچ سے مختلف ہے، میں ان سے جھگڑا کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کا اجتماع مسلمانوں کا اجتماع ہے میرا خیال ہے کہ آپ اسلام کے مقاصد اور اس کی روح سے وفادار رہنے کے خواہش مند

ہیں۔ میرا واحد مقصد یہ ہے کہ موجودہ صورت حال کے بارے میں جو میری دیانت دارانہ رائے ہے اس کا صاف صاف اظہار کر دوں۔ میرے خیال میں صرف یہی ایک صورت ہے کہ میں آپ کے سیاسی عمل کی راہوں کو اپنے عقائد کی روشنی سے منور کر سکوں۔

ہندوستانی قوم کا اتحاد

اب سوال یہ ہے کہ اصل مسئلہ اور اس کی صحیح حیثیت کیا ہے؟ کیا مذہب صرف ایک ذاتی معاملہ ہے؟ کیا آپ چاہتے ہیں کہ ایک اخلاقی اور سیاسی نصب العین کی حیثیت سے اسلام کا بھی وہی حشر ہو جو مغرب میں عیسائیت کا ہوا ہے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم اسلام کو بطور ایک اخلاقی نصب العین تو باقی رکھیں لیکن اس کے نظام سیاست کو رد کر کے نظریہ قومیت کی بنیاد پر سیاسی نظامات اختیار کر لیں جن میں مذہبی رجحان کو کوئی کردار ادا کرنے کی اجازت نہیں دی جاتی؟ ہندوستان میں یہ سوال خصوصی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ مسلمان یہاں اقلیت میں ہیں۔ یہ دعویٰ کہ مذہب صرف انفرادی اور ذاتی واردات کا معاملہ ہے، اہل مغرب کی زبان پر تعجب خیز معلوم نہیں ہوتا۔ یورپ میں عیسائیت کا تصور ہی مشرب رہبانیت ہے، جس میں مادی دنیا سے منہ موڑ کر اپنی تمام تر توجہ روحانی دنیا پر مرکوز کی جاتی ہے۔ اس سے وہی منطقی نتیجہ مرتب ہوتا ہے جس کا اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مذہبی واردات کی نوعیت جیسا کہ قران پاک میں بتایا گیا ہے بالکل مختلف ہے۔ یہ محض حیاتیاتی نوعیت کی واردات نہیں جس کا تعلق صرف تجربہ کرنے والے کی اندرونی ذات سے ہو اور اس کے معاشرتی ماحول پر کوئی رد عمل نہ ہو۔ یہ انفرادی واردات ایک معاشرتی نظام کی تخلیق کا باعث ہوئی۔ اس کا فوری نتیجہ ایک ایسے نظام سیاست کے بنیادی اُصولوں کی صورت میں ظاہر ہوا جس میں قانونی تصورات مضمر تھے اور جس کی معاشرتی اہمیت کو محض اس لئے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی بنیاد وحی والہام پر ہے۔ اس لئے اسلام کا مذہبی نصب العین اس کے معاشرتی نظام سے مربوط و منسلک ہے جو خود اس کا اپنا پیدا کردہ ہے۔ اگر ایک کو رد کیا گیا تو دوسرا خود بخود مسترد ہو جائے گا اس لئے ایک مسلمان اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتا کہ نظام سیاست کو ایسے قومی خطوط پر مرتب کیا جائے جس سے اسلام کے اُصول اتحاد کی نفی ہو

جائے۔ یہی مسئلہ اس وقت ہندوستان کے مسلمانوں کے سامنے ہے۔ رینان[۳۰۲] کا قول ہے:

۳۰۲- جوزف ارنسٹ رینان (۱۸۲۳ء-۱۸۹۲ء) ممتاز فرانسیسی فلسفی، مورخ، مطالعہ مذہب کا عالم اور تنقیدی فلسفے کے ایک نمایاں مکتب فکر کا رہنما تھا۔ جس نے اپنی تحریروں اور علمی انکشافات کی بنا پر اپنے ہم عصر معاشرے کے مذہبی تصورات اور سماجی رویوں پر گہرے اثرات مرتب کئے۔ وہ ۲۸ر فروری ۱۸۲۳ء کو پیدا ہوا۔ اس نے ابتدائی تعلیم کا آغاز مذہبی مطالعہ سے کیا اور اس کا ارادہ مذہبی رہنما بننے کا تھا مگر جلد ہی وہ مذہبی تعلیمات سے متنفر ہو گیا اور باقی عمر مذہبی روایاتوں کی عدم پیروی میں گزاری۔ رینان کی علمی شہرت کا آغاز اس وقت ہوا جب اس نے سائنس کا مستقبل نامی کتاب تحریر کی جس میں اس نے مذہبی بنیادوں کی تاریخی اہمیت پر بحث کرتے ہوئے اسے ایک انسانی علم قرار دیا اور اسے قدرتی علوم کے برابر ٹھہرایا۔ ۱۸۴۹ء میں رینان کو فرانسیسی حکومت نے اٹلی بھجوایا تا کہ ان مسودات پر تحقیق کر سکے جو اس سے قبل فرانسیسی علماء تک ناقابل رسائی تھے۔ ۱۸۵۲ء میں مشہور مسلمان فلسفی ابن رشد کی حیات و خدمات پر اس کا ڈاکٹریٹ کا مقالہ سامنے آیا جس نے مغربی دنیا کو مسلم مفکرین کے عملی کاموں سے روشناس کرانے میں اہم کردار ادا کیا۔ ۱۸۵۷ء اور ۱۸۵۹ء میں اس کے تحقیقی مضامین کے دو مجموعے سامنے آئے جو مذہب کے تاریخی اور تنقیدی مطالعہ پر مبنی تھے۔ ۱۸۶۰ء میں رینان کو لبنان میں آثار قدیمہ پر تحقیق کے لئے بھیجا گیا جس کے نتائج ۱۸۶۴ء - ۱۸۷۴ء میں 'فیونتن مسہم' کے عنوان سے شائع ہوئے۔ ۱۸۶۲ء میں اسے کالج ڈی فرانس میں عبرانی کا پروفیسر مقرر کیا گیا مگر اس کے باغیانہ مذہبی خیالات کی بنا پر جلد ہی اسے اس منصب سے علیحدہ کر دیا گیا۔ ۱۸۶۳ء میں اس کی نمایاں تصنیف حیات مسیح شائع ہوئی جس نے مذہبی حلقوں میں شدید مخالفت کو جنم دیا کیونکہ اس میں عیسائیت کی ابتدا کے بارے میں مسلمہ عقاید کی نفی کی گئی تھی۔ ۶۵-۱۸۶۴ء میں رینان نے ایشیا خرد کا مطالعاتی دورہ کیا اور واپسی پر عیسائیت کی شروعات کے بارے میں مزید کئی کتب لکھیں۔ ان میں ۱۸۶۶ء میں شائع ہونے والی، اوپوسٹلز ۱۸۶۹ء میں شائع ہونے والی سینٹ پال اور تاریخ عیسائیت نمایاں ہیں جن میں ایشیا خرد کے نچلے طبقات میں نصرانیت کی ترویج کی کہانی بیان کی گئی تھی۔ ان تمام تصنیفات نے اس کی شہرت بطور مذہبی مورخ مسلم کر دی۔ تصنیف و تالیف کے ساتھ ساتھ رینان نے عملی سیاست میں بھی گہری دلچسپی لینا شروع کی۔ ۱۸۶۹ء میں وہ پارلیمنٹ کے انتخاب کے لئے کھڑا ہوا مگر اسے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ نظریاتی طور پر ابتداً وہ آئینی بادشاہت کے تصور کی حمایت کرتا رہا مگر ۱۸۷۰ء-۱۸۷۱ء میں ہونے والی فرانس اور جرمنی کی جنگ میں فرانس کی شکست کے بعد وہ مطلق العنانیت کا حامی بن گیا۔ فرانس کے تیزی سے بدلتے ہوئے حالات اس کے سیاسی تصورات سے مطابقت نہ رکھتے تھے اور تیسری جمہوریہ (۱۸۷۰ء-۱۹۴۰ء) کے قیام پر وہ سیاسی زندگی سے علیحدہ ہو گیا اور باقی عمر تاریخ نویسی میں صرف کر دی جس میں ۱۸۸۸ء-۱۸۹۶ء میں شائع ہونے والی تاریخ بنی اسرائیل نمایاں ہے۔ رینان نے ۲ر اکتوبر ۱۸۹۲ء کو پیرس میں وفات پائی۔ یہاں علامہ اقبال قومیت کی ابتداء کے بارے میں رینان کی رائے کا حوالہ دے رہے ہیں:

''انسان نہ نسل کی قید گوارا کر سکتا ہے، نہ مذہب کی، نہ دریاؤں کے بہاؤ کی، نہ پہاڑی سلسلوں کی۔ لوگوں کا ایک بڑا گروہ جو سمجھ دار اور دلوں میں گرمی جذبات رکھتا ہو، اپنے اندر ایک اخلاقی شعور پیدا کر لیتا ہے۔ اسے قوم کا نام دیا جاتا ہے''۔ اس قسم کی ترکیب بالکل ممکن ہے۔ اگر چہ یہ ایک طویل اور صبر آزما عمل ہے، اس لئے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کی یکسر نئی تشکیل کی جائے اور ان کے لئے نئے احساسات وجذبات مہیا کئے جائیں۔ اگر اکبر[۳۰۳] کا دین الٰہی[۳۰۴]

۳۰۳- جلال الدین محمد اکبر (۱۵۴۲ء-۱۶۰۵ء) مشہور مغل بادشاہ تھا جو توسیع سلطنت، مدبرانہ نظم ونسق، علوم و فنون کی وسیع پیمانے پر سرپرستی اور کج رو مذہبی عقائد کی بنا پر تاریخ پاک و ہند میں منفرد مقام کا حامل ہے۔ وہ ۱۵/اکتوبر ۱۵۴۲ء کو عمر کوٹ، سندھ کے مقام پر پیدا ہوا اور ۱۵۵۶ء میں اپنے باپ ہمایوں کے انتقال پر تخت نشین ہوا۔ اس کی ابتدائی حکمرانی کے ماہ وسال اس کے اتالیق بیرم خان کے حسن انتظام کے مرہون منت ہیں جس نے نوعمر اکبر کے مفادات کی دل جمعی سے نگہبانی کی اور ہیموں بقال کے علاوہ مخالف سوری خاندان کو پے در پے شکستوں سے دوچار کیا۔ اکبر نے ابتدا ہی سے توسیع سلطنت پر اپنی توجہات مرکوز کیں اور ۱۵۶۲ء سے ۱۵۷۶ء کے دوران مغل سلطنت کی سرحدیں ہندوستان کے دور دراز علاقوں تک پہنچا دیں۔ اس عرصے میں اس کے مقبوضات میں شامل ہونے والے علاقوں میں مالوہ (۱۵۶۲ء)، گجرات (۱۵۷۳ء) اور بنگال (۱۵۷۶ء) نمایاں ہیں۔ ۱۵۸۶ء میں کشمیر فتح ہوا اور آنے والے سالوں میں سندھ (۱۵۹۱ء)، اڑیسہ (۱۵۹۲ء)، بلوچستان و مکران (۱۵۹۴ء) اور قندھار (۱۵۹۵ء) بھی اس کے پایہ تخت میں شامل ہوئے۔ ان فتوحات کے بعد اکبر نے دکن پر لشکر کشی کی اور ۱۵۹۵ء سے ۱۶۰۱ء تک برار، خاندیش اور احمد نگر کے کچھ حصے اس کے زیر نگیں ہو چکے تھے۔ اکبر کی وفات تک مغل سلطنت پندرہ صوبوں تک پھیل چکی تھی جن کی سرحدیں ہندوستان کے طول وعرض میں پھیلی ہوئی تھیں۔ اکبر نہ صرف ایک عظیم فاتح بلکہ اعلیٰ منتظم اور علوم وفنون کا سرپرست بھی تھا۔ اس نے شعراء ادباء، مصوروں، موسیقاروں اور دیگر ماہرین فن کی فراخدلی سے پرورش کی اور اس کے دربار میں دور دراز سے فن کار اور عالم کھچے چلے آئے۔ اس نے مرکزی اور صوبائی حکومتوں کو مضبوط بنیادوں پر استوار کیا اور درباری امراء میں ارتکاز قوت کا خاتمہ کر کے مختلف نسلوں اور مذہبوں سے تعلق رکھنے والے افراد کو اہم مناصب تفویض کیے جس سے بدامنی اور شورشوں پر قابو پانے میں خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی۔ مذہبی معاملات میں اکبر نے صلح کل کی پالیسی روا رکھی جو بڑھتے بڑھتے ہندو نوازی تک پہنچ گئی جس سے مسلمان ملت کو شدید تہذیبی اور سیاسی نقصانات پہنچے۔ رفتہ رفتہ وہ شریعت اسلامیہ کی بالادستی سے منکر ہو گیا اور دین الٰہی کے نام سے ایک نئے مکتب فکر کو رواج دیا جس میں بادشاہ پرستی کا عنصر نمایاں تھا اور اس میں مختلف ادیان کے عقائد اور رسم ورواج شامل تھے۔ یہ نیا مذہب کبھی بھی عوامی مقبولیت نہ حاصل کر سکا اور ۶/اکتوبر ۱۶۰۵ء کو اکبر کی رحلت کے بعد اپنی موت آپ مر گیا۔ یہاں علامہ، اکبر کی مختلف ادیان اور قوموں کے ادغام کے لئے کی جانے والی ناکام کوششوں کا ذکر کر رہے ہیں۔

ایشیا کی تقدیر کا انحصار صرف اس بات پر ہے کہ ہندوستانی قوم کا اتحاد اسی نہج پر قائم کریں۔ ہندوستان چھوٹا ایشیا ہے۔ اس کے لوگوں کا ایک حصہ مشرق میں بسنے والی اقوام کے ساتھ اور دوسرا حصہ وسطی اور مغربی ایشیا کی اقوام کے ساتھ ثقافتی روابط رکھتا ہے۔ اگر ہندوستان میں اشتراک و تعاون کے موثر اصول کی راہ نکل آئی تو اس قدیم سرزمین میں جو اپنے باشندوں کی کسی فطری کمزوری کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنے تاریخی عمل کی وجہ سے ایک طویل عرصے سے مصائب کی شکار رہی ہے، امن وامان پیدا ہو جائے گا اور اسی وقت یہ اُصول ایشیا کے تمام مسائل بھی حل کر دے گا۔

اس کے باوجود یہ امر تکلیف دہ ہے کہ باہمی تعاون کے حصول کی تمام کوششیں بے کار ثابت ہوئیں۔ ان کی ناکامی کا سبب کیا ہے؟ شاید ہم ایک دوسرے کی نیتوں پر شک وشبہ کرتے ہیں اور دل میں ایک دوسرے پر غلبہ حاصل کرنے کے خواہش مند ہیں یا یہ ممکن ہے کہ باہمی تعاون کے بلند مقاصد کے لئے ہم اتنا ایثار بھی نہیں کر سکتے کہ جو اجارہ داریاں (اختیارات) حالات نے ہمارے ہاتھوں میں سونپ دی ہیں، ان سے دست بردار ہو جائیں۔ ہم اپنی انانیت کو قوم پرستی کے پردے میں چھپاتے ہیں۔ بظاہر ہم فراخ دل اور حب الوطنی کے دعوے دار ہیں مگر بہ باطن ہم ذات پات اور قبیلہ پرستی کی تنگ نظری میں مبتلا ہیں۔ غالباً ہم یہ تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ ہر گروہ کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی تہذیبی روایات کے مطابق آزادی کے ساتھ ترقی کرے۔ لیکن ہماری ناکامی کے اسباب کچھ بھی ہوں میں اب بھی پر اُمید ہوں واقعات کا رجحان داخلی ہم آہنگی کی طرف بڑھتا ہوا نظر آتا ہے اور جہاں تک میں مسلمانوں کے ذہن کو سمجھ سکا ہوں مجھے یہ اعلان کرنے میں کوئی تامل نہیں ہے کہ اگر فرقہ وارانہ اُمور کے مستقل تصفیہ کے لئے اس اُصول کو تسلیم کر لیا جائے کہ ہندوستانی مسلمان کو اپنی روایات اور ثقافت کے مطابق اپنے ہندوستانی وطن میں مکمل اور آزادانہ ترقی کرنے کا حق حاصل ہے تو وہ ہندوستان کی آزادی کے لئے اپنا سب کچھ قربان کرنے پر تیار ہو جائے گا۔ یہ اُصول کہ ہر گروہ اپنے عقیدے کے مطابق آزادانہ ترقی کرنے کا حق رکھتا ہے تنگ نظرانہ فرقہ پرستی کے جذبے پر مبنی نہیں ہے۔ فرقہ پرستی کی بھی کئی صورتیں ہیں۔ جو فرقہ دوسرے فرقوں کی طرف بدخواہی کے جذبات رکھتا ہو وہ نیچ اور ذلیل ہے۔ میں دوسری قوموں کے رسوم، قوانین، معاشرتی اور مذہبی اداروں کا بے حد احترام کرتا ہوں۔ یہی نہیں بلکہ قرآن پاک کی تعلیم کے مطابق ضرورت پڑے تو ان کی عبادت گاہوں کی حفاظت بھی میرا فرض ہے۔ اس کے باوجود مجھے اس جماعت سے محبت ہے جو میری حیات اور میرے اوضاع و اطوار کا سرچشمہ ہے اور جس نے مجھے اپنا

یا کبیر[۳۰۵] کی تعلیمات اس ملک کے عوام میں مقبول ہو جاتیں تو ممکن ہے کہ ہندوستان میں یہ حقیقت بن جاتی، لیکن تجربے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی متعدد ذاتوں اور مذہبوں میں ایسا کوئی رجحان موجود نہیں ہے کہ وہ اپنی انفرادی حیثیت کو ترک کر کے ایک وسیع تر جماعت کی صورت اختیار کر لیں۔ ہر گروہ اپنی الگ اجتماعی حیثیت کو برقرار رکھنے کے لئے مضطرب ہے۔ اس قسم کا اخلاقی شعور جو رینان کے نقطہ نظر کے مطابق قوم کی تخلیق کے لئے ناگزیر ہے، ایسی قربانی کا طالب ہے جو ہندوستان کے لوگ دینے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ اس لئے ہندوستانی قوم کا اتحاد جماعتوں کی نفی میں نہیں بلکہ ان کے باہمی اشتراک اور ہم آہنگی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ صحیح تدبر کا تقاضا ہے کہ حقائق کو نظر انداز نہ کیا جائے خواہ وہ کتنے ہی ناخوش گوار کیوں نہ ہوں۔ عملی راہ یہ نہیں کہ ایسی صورت حال کو فرض کر لیا جائے جو فی الواقع موجود نہ ہو بلکہ (طریق کار یہ ہونا چاہیے کہ) حقائق کو تسلیم کرتے ہوئے ان سے حتی الامکان فائدہ اُٹھانے کی کوشش کی جائے۔ ہندوستان اور ایشیا کی

۳۰۵- بھگت کبیر (۱۴۴۰ء-۱۵۱۸ء) پندرھویں صدی عیسوی کا مشہور ہندوستانی صوفی بزرگ تھا جس کے متعلق ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کا گمان تھا کہ وہ ان کے مذہب سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ بھگتی تحریک کا موید، ہندو مسلم اتحاد کا حامی، بت پرستی کا مخالف، ذات پات کی تفریق کا منکر اور لوگوں کو اعلیٰ اخلاقی قدروں کی تعلیم دیتا تھا۔ کبیر کی روحانی شخصیت کے علاوہ اس کی ایک ادبی حیثیت بھی تھی۔ وہ ہندی زبان کا عمدہ شاعر تھا اور اس سے ہندی دوہوں کی ایک بڑی تعداد منسوب کی جاتی ہے۔ بھگت کبیر کے اصل حالات زندگی ہم تک نہیں پہنچے اور ان پر افسانوی رنگ غالب ہے۔ روایات کے مطابق وہ ایک مسلمان جولاہے کا بیٹا یا متبنّٰی تھا اور ابتدا ہی سے ہندو جوگیانہ روایات سے متاثر تھا۔ اس نے پہلے ویشنومت کے ایک مصلح رامانند کی پیروی اختیار کی جو بنارس میں مقیم تھا اور ہندو جوگیوں میں ممتاز مقام رکھتا تھا مگر جلد ہی اس نے اپنا ایک الگ مکتبہ فکر قائم کر لیا جس کے پیروکار کبیر پنتھی کہلاتے تھے۔ کبیر کا مرکزی پیغام محبت الٰہی اور وحدانیت کی تعلیم تھی۔ وہ کٹر مذہبی پابندیوں کے خلاف تھا اور خصوصیت سے ہندو جوگیوں کی پیشہ وارانہ رہبانیت کو نگاہ حقارت سے دیکھتا تھا۔ اس کے نزدیک خالق حقیقی ایک ایسی ہستی کا نام ہے جو ہر جگہ موجود ہے اور اس کا قرب علم یا عبادت کے ذریعے نہیں بلکہ عشق کے ذریعے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ توحید الٰہی کی تبلیغ کی وجہ سے اسے ہندو حلقوں کی جانب سے مذمت اور تشدد کا سامنا کرنا پڑا اور ۱۴۹۵ء میں اسے ساٹھ سال کی عمر میں بنارس سے نکال دیا گیا۔ کبیر نے غریب الوطنی میں ۱۵۱۵ء میں وفات پائی۔ یہاں علامہ اقبال بھگت کبیر کے ہندو مسلم اتحاد کے فلسفہ کی عدم پیروی اور غیر مقبولیت کی طرف توجہ دلا رہے ہیں۔

جائیں۔اسی طرح صوبہ سرحد کے ہندوؤں کے لئے بھی نشستیں مخصوص کر دی جائیں۔
۴) پنجاب و بنگال میں مسلمانوں کے لئے کوئی نشست مخصوص نہ کی جائے۔
۵) نشستیں مخصوص کرنے کا عمل ۱۰ سال کی مدت کے لئے ہو اور اس میں آبادی کے تناسب کا خیال رکھا جائے۔
۶) وہ قومیں، جن کے لئے نشستیں مخصوص کی جائیں، ان کو عام نشستوں پر بھی انتخاب لڑنے کا حق ہوگا۔
۷) آئندہ انتخابات بالغ رائے دہی کی بنیاد پر ہوں۔
۸) سندھ اور کرناٹک کو علیحدہ صوبے بنا دیا جائے۔
۹) ملک کا نام 'ہندوستان کی دولت مشترکہ' ہو اور اس کا نظم و نسق اسی طریق پر چلایا جائے۔
۱۰) نہرو رپورٹ میں ایسی مرکزی مقننہ کی تجویز بھی پیش کی گئی تھی جو قانون سازی میں خود مختار ہو اور ملکی انتظامیہ اس کے سامنے جواب دہ ہو۔

نہرو رپورٹ میں پیش کردہ تجاویز مسلمانوں کے لئے ناقابل قبول تھیں اور اس وقت تک پیش کردہ مسلم مطالبات کے بالکل برعکس تھیں۔ مسلم جذبات کو نظر انداز کرتے ہوئے آل پارٹیز کانفرنس کے اجلاس لکھنؤ میں ان سفارشات کی اُصولی منظوری دے دی گئی اور نہرو کمیٹی کو ہدایت کی گئی کہ ایک پارلیمانی خاکہ ساز کی خدمات حاصل کی جائیں جو ان سفارشات کو دستوری شکل دے تاکہ نہرو رپورٹ کو ایک بل کی شکل میں سیاسی نمائندوں کے ایک کنونشن میں پیش کیا جا سکے۔ آئینی بل کی تیاری کے لئے نہرو کمیٹی نے اینی بسنت، ڈاکٹر ایم اے انصاری، پنڈت مدن موہن مالویہ، لالہ لاجپت رائے، مولانا ابوالکلام آزاد، جیراگھو اچاریہ، مولانا عبدالقادر قصوری اور قائداعظم محمد علی جناح سے معاونت کی درخواست کی جسے قائداعظم کے سوا سب نے قبول کر لیا۔ مگر جلد ہی مجوزہ بل کی تیاری کا کام ترک کر دیا گیا اور چند ترمیمات کے بعد، نہرو رپورٹ اسی سال کے آخر میں عوام کے سامنے پیش کر دی گئی۔

نہرو رپورٹ چونکہ کانگریسی خیالات کی ترجمان تھی اس لئے آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے دہلی میں منعقدہ اجلاس بروز ۴-۵ نومبر ۱۹۲۸ء میں معمولی تبدیلیوں کے ساتھ اسے فوراً منظور کر لیا۔ اس کے بعد نہرو رپورٹ کو کلکتہ میں ہونے والے آل پارٹیز کنونشن میں پیش کیا گیا جہاں قائداعظم جو آل انڈیا مسلم لیگ کی نمائندگی کر رہے تھے نے اس کی شدید مخالفت کی۔ قائداعظم نے دیگر مطالبات کے ساتھ اس بات پر بھی زور دیا کہ مرکزی اسمبلی کی ایک تہائی نشستیں مسلمانوں کے لئے وقف کی جائیں، پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کی آبادی کے مطابق ان کے لئے نشستیں مقرر کی جائیں اور وفاق کے ماتقی اختیارات صوبوں کو دیئے جائیں۔ ان مطالبات کو مسترد کرتے ہوئے ہندو مہاسبھا کے نمائندے ایم آر جیاکار نے قائداعظم کے مسلمانوں کے حقیقی نمائندے ہونے ہی سے انکار کیا اور کنونشن سے مطالبہ کیا کہ نہرو رپورٹ من و عن منظور کی جائے۔ انجام کار مسلمانوں کے تمام تر جائز تحفظات کی نفی کرتے ہوئے نہرو رپورٹ کو بلا ترمیم منظور کر لیا گیا اور برطانوی حکومت پر زور دیا جانے لگا کہ اسے ہندوستان کے مستقبل کے آئین کے طور پر قبول کر لیا جائے۔ مگر اس ناروا مطالبے کو انگریز اور مسلمانوں، دونوں بڑے گروہوں نے مسترد کر دیا اور گول میز کانفرنس کے انعقاد اور سائمن کمیشن کی سفارشات شائع ہونے کے بعد یہ طاقِ نسیان پر سجا دی گئی۔ مگر قائداعظم اور مولانا محمد علی جوہر کو ہندو ذہنیت کا جو تلخ تجربہ آل پارٹیز کانفرنس کے اجلاس میں ہوا، اس کے پیش نظر دونوں رہنما متحدہ قومیت کے تصور ہی سے دستبردار ہو گئے اور اس کے بعد اپنی تمام تر صلاحیتیں خالصتاً مسلمانوں کی فلاح کے لئے وقف کر دیں۔

یہاں علامہ اقبال نہرو رپورٹ کے مرتبین کی طرف سے ہندوستان میں پائی جانے والی فرقہ پرستی کے احسن پہلوؤں کے اعتراف کا ذکر کر رہے ہیں۔

مذہب، اپنا ادب، اپنی فِکر اور اپنی ثقافت دے کر میری تشکیل اس صورت میں کی ہے کہ جیسا میں ہوں، اور اس طور پر میرے ماضی کو از سر نو زندہ کر کے وہ میرے شعور کا ایک زندہ و فعال عنصر بن چکی ہے۔ 'نہرو رپورٹ'[۳۰۶] کے مرتبین نے بھی فرقہ پرستی کے اس اعلیٰ وارفع پہلو کا اعتراف کیا

۳۰۶۔ ۱۹۲۷ء میں برطانوی حکومت نے ہندوستان کے آئینی مسائل کے حل کے لئے ایک شاہی کمیشن کی تقرری کا اعلان کیا جس کو اس کے سربراہ سر جان سائمن کی وجہ سے سائمن کمیشن بھی کہا جاتا ہے۔ اس کمیشن میں کوئی ہندوستانی رکن شامل نہ کیا گیا جس کی وجہ سے تقریباً تمام بڑی ہندوستانی سیاسی جماعتوں نے اس کا مقاطعہ کر دیا۔ ہندوستانی سیاسی افق پر مزید اتحاد پیدا کرنے کے لئے کانگریس نے اپنے دسمبر ۱۹۲۷ء میں منعقدہ اجلاس بمقام مدراس میں ایک قرارداد پیش کی جس میں آل پارٹیز کانفرنس کا تخیل پیش کیا گیا۔ اس تصور کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ۱۲ر فروری ۱۹۲۸ء کو دہلی میں آل پارٹیز کانفرنس کا قیام عمل میں آیا جس کے صدر ڈاکٹر ایم اے انصاری مقرر ہوئے۔ آل پارٹیز کانفرنس میں انتیس تنظیموں نے شرکت کی جن میں مرکزی خلافت کمیٹی، مرکزی سکھ لیگ، ساؤتھ انڈین لبرل فیڈریشن، سنٹرل کونسل آف آل برمیز ایسوسی ایشنز، انڈین سٹیٹ سبجیکٹز ایسوسی ایشن، پارسی پنچایت، بمبئی نان برہمن پارٹی، کیمونسٹ پارٹی آف بمبئی اور بمبئی مزدور کسان پارٹی نمایاں تھیں۔ ابتداء ہی میں ہندوستان کے مستقبل کے آئین کے بنیادی مقاصد کے تعین کے سوال پر شدید اختلاف رائے پیدا ہو گیا جسے یہ کہہ کر طے کیا گیا کہ ہندوستان کی آئینی منزل، مکمل ذمہ دارانہ حکومت کا قیام ہو گی۔ اس اتفاق رائے کے بعد کانفرنس نے ایک کمیٹی قائم کی جس کو دو یا یک ایوانی مقننہ، بالغ رائے دہی، بنیادی حقوق اور ہندوستانی ریاستوں کے آئینی مستقبل جیسے معاملات پر سفارشات تیار کرنے کا کام سونپا گیا۔ بوجوہ مذکورہ کمیٹی اپنے مقاصد کے حصول میں کامیاب نہ ہو سکی۔ چنانچہ اپنے ایک اجلاس میں جو ۱۹ر مئی ۱۹۲۸ء کو بمبئی میں منعقد ہوا، آل پارٹیز کانفرنس نے پنڈت موتی لال نہرو کی سربراہی میں ایک اور کمیٹی تشکیل دی جس کو ہندوستان کے آئندہ آئین کے بنیادی اُصول متعین کرنے کا کام سونپا گیا۔ کمیٹی کو ہدایت کی گئی کہ یکم جولائی ۱۹۲۸ء سے پہلے اپنی رپورٹ تیار کرے تاکہ اس پر آل پارٹیز کانفرنس کے اگست ۱۹۲۸ء میں ہونے والے اجلاس میں غور کیا جا سکے۔ کافی بحث و مباحث اور جون اور جولائی ۱۹۲۸ء میں ۲۵ اجلاس منعقد کرنے کے بعد، نہرو کمیٹی نے اپنی سفارشات نہرو رپورٹ کی صورت میں آل پارٹیز کانفرنس کے چوتھے اجلاس، جو لکھنؤ میں اگست ۱۹۲۸ء کو منعقد ہوا، میں پیش کر دیں۔

نہرو رپورٹ سات ابواب، دو جدولوں اور تین ضمیموں پر مشتمل تھی۔ ساتواں باب، جو ۲۴ صفحات پر مشتمل تھا، ہندوستان کے لئے تجویز کئے گئے آئینی ڈھانچے کا عمومی خاکہ پیش کرتا تھا۔ اس میں شامل اہم تجاویز یہ تھیں۔

۱) ہندوستان کا آئندہ دستور درجہ نو آبادیات کی بنیاد پر بنایا جائے۔ (اس طرح ملک کے لئے کامل آزادی کے حصول کی نفی کر دی گئی تھی)۔

۲) مرکزی قانون ساز اسمبلی اور صوبائی کونسلوں کے ایوان زیریں کے اراکین کا چناؤ مشترکہ انتخاب کے ذریعے کیا جائے۔

۳) مرکزی اسمبلی اور ان صوبوں میں، جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں، ان کے لئے نشستیں محفوظ رکھی

ہندوستان کے اندر ایک اسلامی ہندوستان

لٰہذا ہندوستان جیسے ملک میں ایک ہم آہنگ کل کی تشکیل کے لئے ارفع و اعلیٰ سطح پر فرقہ پرستی کا وجود ناگزیر ہے۔ یورپ کے ممالک کی طرح ہندوستانی معاشرے کی اکائیاں علاقائی نہیں ہیں۔ ہندوستان ایک براعظم ہے جس میں مختلف نسلوں، مختلف زبانیں بولنے والے اور مختلف مذاہب کے پیروکار آباد ہیں۔ ان کے اعمال و افعال میں وہ احساس موجود نہیں ہے جو ایک ہی نسل کے لوگوں میں ہوتا ہے، یہاں تک کہ ہندو بھی کوئی متجانس جماعت نہیں ہیں۔ ہندوستان میں یورپی جمہوریت کے اُصول کا اطلاق مذہبی فرقوں کے وجود کو تسلیم کئے بغیر ممکن نہیں ہے۔ لٰہذا مسلمانوں کا یہ مطالبہ کہ ہندوستان کے اندر ایک مسلم ہندوستان قائم کیا جائے بالکل حق بجانب ہے۔ میری رائے میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس[۳۰۸] منعقدہ دہلی کی قرارداد[۳۰۹] کا محرک یہی بلند نصب العین

۳۰۸- نہرو رپورٹ جاری ہونے کے بعد ہندوستانی مسلمانوں پر یہ تلخ حقیقت بالکل واضح ہوگئی کہ ہندو اکثریت اپنی عددی برتری کے زعم میں ان کے جائز تحفظات بھی تسلیم کرنے کو تیار نہیں اور جمہوریت کے لبادہ میں ان پر ہمیشہ کے لئے رام راج مسلط کرنا چاہتی ہے۔ اس نازک مرحلے میں ایک متفقہ سیاسی موقف اختیار کرنے اور مسلمانوں کے سیاسی اتحاد کا مظاہرہ کرنے کے لئے چند دردمند مسلم رہنماؤں کی مساعی سے آل پارٹیز مسلم کانفرنس کا ڈول ڈالا گیا جس میں تمام نمایاں مسلم جماعتیں شامل تھیں۔ یہ کانفرنس سر آغا خان کی صدارت میں دہلی میں ۲۹ر دسمبر ۱۹۲۸ء سے لے کر یکم جنوری ۱۹۲۹ء تک جاری رہی۔ کانفرنس کے اختتام پر ایک طویل قرارداد منظور کی گئی جس میں ان کم از کم مسلم مطالبات کا احاطہ کیا گیا جو ہندوستان میں مسلمان قوم کی باعزت بقا کے لئے ضروری تھے۔ جلد ہی اس قرارداد کو مسلمانوں کے 'میگنا کارٹا' کی حیثیت حاصل ہوگئی اور مطالبہ پاکستان (۱۹۴۰ء) تک برصغیر کی مسلم سیاست اس قرارداد پر عمل درآمد کے لئے کی جانے والی جدوجہد کے گرد گھومتی رہی۔ یہاں علامہ اقبال مسلمانوں کے مطالبات پیش کرنے کے ضمن میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس کے کردار کا حوالہ دے رہے ہیں۔

۳۰۹- آل پارٹیز مسلم کانفرنس کے دہلی میں ہونے والے اجلاس کے اختتام پر، جو ۲۹ر دسمبر ۱۹۲۸ء سے یکم جنوری ۱۹۲۹ء تک جاری رہا، مسلم مطالبات کے متعلق ایک تفصیلی قرارداد کی منظوری دی گئی جسے 'قرارداد دہلی' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس قرارداد میں ملک میں ہونے والی آئینی اور انتظامی تبدیلیوں کے پیش نظر ان کم از کم مراعات کا مطالبہ کیا گیا تھا جو مسلمانوں کی باعزت سیاسی اور تہذیبی بقا کے لئے لازم تھیں۔ اس قرارداد میں کہا گیا تھا کہ مسلمانوں کے لئے جداگانہ طرز انتخاب برقرار رکھا جائے، ہندوستان کا آئندہ دستور وفاقی طرز کا ہو، مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کے لئے ایک تہائی نشستیں مخصوص کی جائیں، مسلم

ہے۔ سندھ کی علیحدگی[۳۰۷] پر بحث کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

''یہ کہنا کہ قومیت کے وسیع نقطہ نگاہ کے ماتحت کسی فرقہ وارانہ صوبے کا قیام مناسب نہیں، بالکل ایسا ہے جیسے یہ دعویٰ کہ وسیع تر بین الاقوامی نقطہ نگاہ کے مطابق علیحدہ قوموں کا وجود مناسب نہیں، ان دونوں بیانات میں ایک حد تک صداقت موجود ہے لیکن بین الاقوامیت کے بڑے سے بڑے حامی کو بھی اس امر کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ قوموں کی خودمختاری کے بغیر بین الاقوامی ریاست کا قیام مشکل ہے۔ اسی طرح مکمل تمدنی آزادی کے بغیر، اور فرقہ پرستی اپنی اعلیٰ و ارفع سطح پر تمدن ہی ہے، ایک ہم آہنگ قوم کی تشکیل مشکل ہے۔''

۳۰۷- وادی مہران جسے باب الاسلام ہونے کا بھی شرف حاصل ہے، ہمیشہ سے مسلمان اکثریت کا علاقہ رہی اور اس پر مختلف مسلم حکمران خاندان حکومت کرتے رہے۔ فروری مارچ ۱۸۴۳ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی اور سندھ کے تالپور حکمرانوں کے درمیان ہونے والی جنگ میں انگریزوں کو فتح حاصل ہوئی اور سندھ انگریز عمل داری میں چلا گیا۔ انگریزوں نے اپنے مفادات کے پیش نظر اسے احاطہ بمبئی میں شامل کر لیا اور نوے سال تک اس کا نظم ونسق 'بے ضابطہ صوبے' کی حیثیت سے بمبئی کے گورنر کے ہاتھوں رہا۔ ایک وسیع صوبہ کا جز بننے سے سندھ کے مسلمانوں کے حقوق ان کے اپنے علاقے میں اکثریت کے باوجود پامال ہوتے رہے۔ چنانچہ برصغیر کے تمام مسلمان رہنما عرصہ دراز سے مطالبہ کر رہے تھے کہ سندھ کو بمبئی سے علیحدہ کر کے ایک الگ صوبے کی حیثیت دی جائے۔ دوسری طرف ہندو اس مطالبے کے خلاف تھے کیونکہ اس سے مسلمانوں پر خوشحالی، خودمختاری اور خود انحصاری کے دروازے کھلتے تھے اور ہندو اجارہ داری پر ضرب کاری لگتی تھی۔ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ، ۱۹۳۵ء میں مسلمانوں کے اس دیرینہ مطالبہ کو تسلیم کر لیا گیا اور سندھ ایک علیحدہ صوبے کی حیثیت سے وجود میں آ گیا جس کا علیحدہ گورنر مقرر ہو گیا۔ ۱۹۳۶ء میں اس کی اپنی صوبائی قانون ساز اسمبلی بن گئی جس کے ممبران نے مسلم مفادات کے تحفظ اور تحریک پاکستان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

یہاں علامہ اقبال علیحدگی سندھ کے بارے میں نہرو رپورٹ کے مرتبین کے موقف کا حوالہ دے رہے ہیں۔

اس پر عمل درآمد کیا گیا تو بڑی وسیع ریاست وجود میں آ جائے گی جس کا انتظام مشکل ہوگا۔ جہاں تک رقبے کا تعلق ہے یہ بات درست ہے، لیکن آبادی کے لحاظ سے مجوزہ ریاست بعض موجودہ ہندوستانی صوبوں سے چھوٹی ہوگی۔ انبالہ ڈویژن اور شاید کچھ ایسے اضلاع کو جہاں غیر مسلموں کی اکثریت ہے الگ کر دینے سے اس کی وسعت اور بھی کم ہو جائے گی اور آبادی میں مسلمان زیادہ ہوں گے۔ اس طرح (ان اضلاع کی) علیحدگی سے اپنی حدود کے اندر یہ مربوط ریاست غیر مسلموں کے حقوق کی حفاظت بہتر طریق سے کر سکے گی۔ اس تجویز سے نہ ہندوؤں کو پریشان ہونا چاہیے نہ انگریزوں کو۔ ہندوستان دنیا میں سب سے بڑا اسلامی ملک ہے۔ اسلام کو بحیثیت ایک تمدنی قوت کے زندہ رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایک مخصوص علاقے میں اپنی مرکزیت قائم کر سکے۔ ہندوستانی مسلمانوں کے اس سب سے زیادہ جان دار حصے کو جس نے برطانیہ کے ناروا سلوک کے باوجود فوج اور پولیس میں شریک ہو کر انگریزوں کی حکومت کو اس ملک میں ممکن بنایا ہے، ایک جگہ مرکوز کرنے سے نہ صرف ہندوستان بلکہ ایشیا کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔ اس سے ان کا احساس ذمہ داری قوی اور حب الوطنی کا جذبہ گہرا ہو جائے گا۔ ہندوستان کے جسد سیاسی کے

امام نے صرف ایک جلاس میں شرکت کی جب کہ جی آر پردھان نے صرف ۱۲رجون ۱۹۲۸ء تک ہونے والی نشستوں میں حصہ لیا۔ اس طرح سوبھاش چندر بوس نے بھی نہرو کمیٹی کے کام میں خاطر خواہ دلچسپی نہ لی مگر جب نہرو کمیٹی نے اپنی رپورٹ کا مسودہ تیار کیا تو سر علی امام، پردھان اور چندر بوس نے اسے ملاحظہ کرنے کے بعد اپنی منظوری سے مطلع کر دیا۔ شعیب قریشی، جو نہرو کمیٹی کے حتمی اجلاس میں شامل نہ تھے، نے مسودہ دیکھنے کے بعد زور دیا کہ مرکزی قانون ساز اسمبلی میں ایک تہائی نشستیں مسلمانوں کے لئے مختص کرنے کی صراحت سے وضاحت کی جائے۔ اس طرح انھوں نے رپورٹ میں پیش کیے جانے والے چند دلائل اور اعداد و شمار پر بھی عدم اعتماد کا اظہار کیا۔ ان اختلافات سے قطع نظر نہرو کمیٹی نے اپنی حتمی رپورٹ آل پارٹیز کانفرنس کے چوتھے اجلاس، جو ۳۰راگست ۱۹۲۸ء میں لکھنؤ میں ہوا، میں پیش کر دی جس کو مسلم رائے عامہ کی پرزور مخالفت کے باوجود منظور کر لیا گیا۔ نہرو کمیٹی کا سب سے نمایاں کارنامہ مسلم مطالبات کو سرے سے نظر انداز کرنا اور ان کی درخواستوں کو یکسر مسترد کرنا تھا۔ اسی تنگ نظری کی بدولت نہرو کمیٹی کی پیش کردہ رپورٹ کو ہندوستان کی تمام قوموں کی تائید حاصل نہ ہو سکی اور یہ اپنی موت آپ مر گئی۔

یہاں علامہ اقبال نہرو کمیٹی کی کارروائیوں کا حوالہ دے رہے ہیں۔

ہے کہ ایک ہم آہنگ کل کے قیام کے لئے ضروری ہے کہ اس کے اجزا کی انفرادیت کا گلہ گھونٹنے کی بجائے انھیں مواقع دیے جائیں کہ وہ ان ممکنہ قوتوں کو بروئے کار لاسکیں جو ان میں پوشیدہ ہیں اور مجھے یقین ہے کہ یہ ایوان مسلم مطالبات کی، جو اس قرارداد میں موجود ہیں، پورے شدومد سے تائید کرے گا۔ میں ذاتی طور پر ان مطالبات سے بھی ایک قدم آگے جانا چاہتا ہوں جو اس قرارداد میں پیش کئے گئے ہیں۔ میری خواہش ہے کہ پنجاب، شمال مغربی سرحدی صوبہ، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک ریاست بنا دیا جائے۔ مجھے تو ایسا نظر آتا ہے کہ کم از کم ہندوستان کے شمال مغرب میں ایک مربوط ہندوستانی مسلم ریاست، خواہ یہ ریاست سلطنت برطانیہ کے اندر حکومت خود مختاری حاصل کرے یا اس کے باہر، ہندوستان کے شمالی مغربی مسلمانوں کا آخر کار مقدر ہے۔ یہ تجویز نہرو کمیٹی[۳۱۰] کے سامنے پیش کی گئی تھی۔ انھوں نے اسے اس بنا پر مسترد کر دیا کہ اگر

اکثریتی صوبوں کے قانون ساز اداروں میں ان کی عددی اکثریت برقرار رکھی جائے، مرکزی اور صوبائی کابینہ میں مسلمانوں کو خاطر خواہ حصہ دیا جائے، بلوچستان اور سرحد میں بھی آئینی اصلاحات نافذ کی جائیں، ایسا کوئی قانون جس کا تعلق کسی قوم کے مذہبی یا تہذیبی پہلو سے ہو، اس وقت تک پاس نہ کیا جائے جب تک متعلقہ مقننہ میں موجود اس قوم کے تین چوتھائی اراکین اس کی تائید نہ کریں اور سندھ کو بمبئی سے الگ کر کے علیحدہ صوبہ بنایا جائے۔ اس قرارداد کو مسلمانوں کی اکثریت کی تائید حاصل ہوئی اور آئندہ کئی سالوں تک مسلم قیادت اس قرارداد کی منظوری کی تگ ودو میں مصروف عمل رہی۔ یہاں علامہ اقبال مسلم مطالبات کے بارے میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس کے اختیار کردہ موقف کی طرف اشارہ کر رہے ہیں جو قرارداد دہلی میں بیان کیے گئے تھے۔

۳۱۰- ہندوستان کے مستقل آئین کا ایک متفقہ مسودہ تیار کرنے کے لئے آل پاٹیز کانفرنس نے ۱۹ مئی ۱۹۲۸ء کو پنڈت موتی لال نہرو کی سربراہی میں ایک کمیٹی تشکیل دی جس کو ہندوستان کے آئندہ دستور کے بنیادی اُصول متعین کرنے کا کام سونپا گیا۔ کمیٹی کے دیگر ممبران میں سر تیج بہادر سپرو (۱۹۴۹ء-۱۸۷۵ء) (لبرل فیڈریشن)، سر علی امام (۱۹۳۲ء-۱۸۶۹ء)، ایم ایس آئینی، ایم آر جیا کار (۱۹۵۹ء-۱۸۷۳ء)، این ایم جوشی (۱۹۵۵ء-۱۸۷۹ء) (مزدور رہنما)، منگل سنگھ (سکھ لیگ)، سوبھاش چندر بوس (۱۹۴۵ء-۱۸۹۷ء)، انڈین نیشنل کانگریس کے جنرل سیکرٹری شعیب قریشی اور جی آر پردھان شامل تھے جو غیر برہمن نقطہ نظر کی نمائندگی کر رہے تھے۔ نہرو کمیٹی کے ۲۵ اجلاس جون اور جولائی ۱۹۲۸ء میں منعقد ہوئے۔ این ایم جوشی کسی بھی اجلاس میں شریک نہ ہوا۔ سر علی

پر دباؤ ڈالا جا سکے۔ میں واضح طور پر بتا دینا چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کے دل میں ایسا کوئی جذبہ موجود نہیں ہے جس کا وہ ہم پر الزام لگا رہے ہیں۔ ان کا مدعا صرف یہ ہے کہ وہ آزادانہ ترقی کر سکیں جو اس قسم کی وحدانی حکومت میں ممکن نہیں جس کا تصور قوم پرست ہندو سیاست دانوں کے ذہن میں ہے اور جس کا مقصد پورے ہندوستان میں ان کا مستقل فرقہ وارانہ غلبہ حاصل کرنا ہے۔

ہندوؤں کو خوف زدہ نہیں ہونا چاہیے کہ خود مختار مسلم ریاستوں کے قیام سے ایک طرح کی مذہبی حکومتیں قائم ہو جائیں گی۔ اس سے پہلے میں بتا چکا ہوں کہ اسلام میں مذاہب کا مفہوم کیا ہے۔ حقیقتاً اسلام میں کلیسیائی نظام نہیں ہے۔ یہ ایک ایسی ریاست ہے جس کا اظہار روسو سے بھی بہت پہلے معاہدہ عمرانی کی صورت میں ہو چکا تھا۔ اس کے پیچھے ایک اخلاقی نصب العین ہے جو انسان کو کسی خاص علاقے کی سرزمین سے وابستہ نہیں سمجھتا بلکہ وہ ایک روحانی ہستی ہے جو ایک اجتماعی معاشرتی نظام کا زندہ و متحرک جزو اور چند حقوق و فرائض کا حامل ہے۔ مسلم ریاست کے کردار کا اندازہ ٹائمز آف انڈیا کے اس اداریے سے لگایا جا سکتا ہے جو کچھ روز پہلے ہندوستانی بینکوں کی تحقیقاتی کمیٹی کے بارے میں لکھا گیا تھا۔ اخبار لکھتا ہے کہ ”قدیم ہندوستان میں سود کی شرح کے متعلق حکومت نے قوانین بنائے جب کہ اسلام میں سود لینا صریحاً ممنوع ہے، لیکن مسلم دور میں ہندوستان کی مسلم حکومتوں نے سود پر کوئی پابندیاں عائد نہیں کیں“ اس لئے میں ہندوستان اور اسلام کی فلاح و بہبود کے لئے ایک متحدہ مسلم ریاست کے قیام کا مطالبہ کر رہا ہوں۔ اس سے ہندوستان کے اندر توازن قوت کی بدولت امن و امان قائم ہو جائے گا اور اسلام کے لئے ایک موقع فراہم کرے گا کہ وہ ان اثرات سے آزاد ہو جائے جو عربی شہنشاہیت نے اس پر ڈال دیے تھے اور اپنے قوانین، اپنی تعلیم اور اپنی ثقافت کو حرکت میں لا کر ان کی اصل روح اور عصر جدید کی روح سے رابطہ قائم کر سکے۔

وفاقی ریاستیں

اس طرح یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ چونکہ ہندوستان میں آب و ہوا، نسلوں، زبانوں، عقاید اور معاشرتی نظاموں کے کثیر اختلافات موجود ہیں، اس لئے ایسی خود مختار ریاستوں کا قیام جن کی بنیاد

اندر رہتے ہوئے اگر انھیں نشو و نما کا پورا موقع دیا گیا تو شمال مغربی ہندوستان کے مسلمان بیرونی حملوں کے خلاف، خواہ وہ سنگینوں سے کیے جائیں یا افکار سے، ہندوستان کے بہترین محافظ ثابت ہوں گے۔ پنجاب میں مسلمانوں کی آبادی ۵۶ فیصد ہے، لیکن ہندوستان کی پوری فوج میں ان کا تناسب ۵۴ فی صد ہے۔ اگر انیس ہزار گورکھوں کو جو نیپال کی آزاد ریاست سے بھرتی کیے جاتے ہیں، نکال دیا جائے تو فوج میں پنجاب کا تناسب ۶۲ فی صد ہو جائے گا۔ اس اندازے میں وہ چھ ہزار جنگ جو شامل نہیں جو شمال مغربی سرحدی صوبہ اور بلوچستان سے بھرتی کیے جاتے ہیں۔ اس سے آپ ان تمام امکانات کا اندازہ لگا سکتے ہیں جو غیر ملکی جارحیت کے خلاف ہندوستان کے دفاع کے سلسلے میں شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں میں پائے جاتے ہیں۔ عزت (مآب) جناب سری نواس شاستری[۳۱۱] کا خیال ہے کہ شمال مغربی سرحد کے ساتھ ساتھ خود مختار مسلم ریاستوں کے قیام کے لئے مسلمانوں کا مطالبہ اس خواہش سے پیدا ہوا ہے کہ ضرورت پیش آئے تو حکومت ہند

۳۱۱- سری نواس شاستری (۱۸۶۹ء-۱۹۴۶ء) ہندوستان کا ایک ممتاز سماجی اور سیاسی راہنما تھا جس نے ہندو سیاست کے معتدل رویوں کی نمائندگی کی۔ اس نے اپنی عملی زندگی کا آغاز سکول ماسٹر کی حیثیت سے کیا۔ ۱۹۰۷ء میں وہ سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی میں شامل ہوا جسے گوپال کرشنا گھوکھلے نے جون ۱۹۰۵ء میں ہندوستان کی سماجی خدمت کے لئے قائم کیا۔ شاستری جلد ہی سوسائٹی کا ایک ممتاز رکن بن گیا اور گھوکھلے کے دست راست کی حیثیت سے ملک کی معتدل سیاست میں حصہ لینے لگا۔ ۱۹۱۳ء میں وہ مدراس قانون ساز اسمبلی کا رکن منتخب ہوا۔ ۱۹۲۰ء میں وہ کونسل آف سٹیٹ کا رکن بنا اور امپیریل کانفرنس اور لیگ آف نیشن کے اجلاسوں میں ہندوستان کی نمائندگی کی۔ اسی دور میں اس نے اپنی توجہ جنوبی افریقہ میں مقیم ہندوستانیوں کی حالت زار بہتر بنانے کی طرف مرکوز کی اور اس ضمن میں کئی بار جنوبی افریقہ کا دورہ کیا۔ بعد میں اسے جنوبی افریقہ میں ہندوستان کا ایجنٹ جنرل بھی مقرر کیا گیا۔ ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۰ء تک وہ اینملائی یونیورسٹی کا وائس چانسلر رہا۔ اس نے ۱۹۴۶ء میں وفات پائی۔ شاستری ایک کامیاب مصنف بھی تھا اور اس نے اہم سیاسی اور سماجی موضوعات پر کئی کتب تحریر کیں۔ ان میں گوپال کرشنا گھوکھلے کی سوانح عمری، ہندوستان میں حکومت خود اختیاری کا قیام اور ہندو لڑکیوں کی کم عمری میں ہونے والی شادیوں پر لکھی جانے والی کتابیں نمایاں ہیں۔ یہاں علامہ اقبال شاستری کے ایک بیان کا حوالہ دے رہے ہیں جو اس نے شمال مغربی سرحد کے ساتھ ساتھ خود مختار مسلم ریاستوں کے قیام کے سلسلے میں دیا تھا۔

ہے اس کے تحت ضروری ہے کہ مرکزی قانون ساز اسمبلی کو عوام کی منتخب کردہ اسمبلی کی حیثیت سے ختم کر دیا جائے اور اسے وفاقی ریاستوں کے نمائندوں پر مشتمل اسمبلی کی صورت دی جائے۔ 'سائمن رپورٹ' میں یہ بھی مطالبہ کیا گیا ہے کہ ان ہی اُصولوں پر جن کا میں نے ذکر کیا ہے، صوبوں کی از سر نو تقسیم ہونی چاہیے اور 'رپورٹ' میں دونوں (تجاویز) کی سفارش کی گئی ہے۔ میں اس نقطہ نظر کی دل سے تائید کرتا ہوں بلکہ یہ تجویز پیش کروں گا کہ 'سائمن رپورٹ' کی سفارش کے مطابق صوبوں کی از سر نو تقسیم کرتے وقت دو شرطوں کو پورا کرنا ضروری ہے۔ (اولاً) یہ تقسیم نئے دستور کے اجرا سے پہلے عمل میں آنی چاہیے اور (دوم) یہ اس طرح ہونی چاہیے کہ فرقہ وارانہ مسئلہ ہمیشہ کے لئے طے ہو جائے۔ صوبوں کی مناسب تقسیم سے مخلوط اور جداگانہ انتخاب کا مسئلہ ہندوستان کے آئین کے بارے میں نزاع کو خود بخود ختم کر دے گا۔ اس نزاع کا باعث بڑی حد تک صوبوں کی موجودہ تقسیم ہے۔ ہندو کا خیال ہے کہ جداگانہ انتخاب قومیت کے منافی ہے کیونکہ

سائمن رپورٹ میں مستقبل بعید میں بھی ہندوستان کے لئے درجہ نو آبادیات اور انتقال اقتدار کے امکانات کو مسترد کر دیا گیا۔ مرکز کو مقننہ کے سامنے جواب دہ بنانے کی تجویز نا قابل عمل قرار دی گئی۔ مرکزی مجلس قانون ساز کے لئے بالواسطہ طرز انتخاب تجویز کیا گیا۔ دفاع کو قانون سازی کے دائرے سے باہر رکھا گیا اور فوج میں ہندوستانی عنصر کو بڑھانے کے مطالبہ کی طرف بھی کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ اسی طرح برطانوی حکومت کی حکومت ہند پر سخت گرفت بھی جوں کی توں برقرار رکھی گئی اور سیکرٹری آف سٹیٹ برائے ہندوستان کی انڈیا کونسل کو برقرار رکھنے کی سفارش کی گئی، سائمن افسر شاہی کی انتظامی اُمور میں بالادستی کو قائم رکھا گیا، صوبائی خود مختاری کے مطالبہ کو رد کرتے ہوئے مرکز کو مالی اُمور میں خصوصی اختیارات دیئے گئے اور گورنر حضرات کو وہ قانونی مسودے منظور کرنے اور مالی امدادیں بھی بحال کرنے کا اختیار دیا گیا جن کو صوبائی مقننہ رد کر چکی ہو۔ مزید برآں بہت سے موضوعات پر بحث اور رائے شماری کی سرے سے ممانعت کر دی گئی۔ سائمن رپورٹ کی اس تنگ نظری کی بدولت نہ صرف ہندوستانی حلقوں نے اس کی سفارشات کو مسترد کر دیا بلکہ خود لارڈ ارون نے اسے 'تخیل سے خالی' قرار دیا۔ آل پارٹیز کانفرنس کی طرف سے نہرو رپورٹ منظور کیے جانے اور وائسرائے کے اعلان مورخہ ۳۱ راکتوبر ۱۹۲۹ء کے بعد 'کہ ہندوستان کا آئینی مستقبل درجہ نو آبادیات کا حصول ہے' سائمن کمیشن کی سفارشات کی اہمیت یکسر ختم ہو گئی اور اسے جلد ہی بھلا دیا گیا۔ یہاں علامہ اقبال سائمن رپورٹ میں پیش کردہ تصور وفاق کا حوالہ دے رہے ہیں۔

زبان، نسل، تاریخ، مذہب کی یکسانیت اور اقتصادی مفاد کے اشتراک پر ہو، ہندوستان میں ایک مستحکم آئینی نظام حاصل کرنے کا واحد راستہ ہے۔ سائمن رپورٹ[۳۱۲] میں وفاق کا جو تصور پیش کیا گیا

۳۱۲- ۱۹۱۹ء میں نافذ کی جانے والی مانٹیگو چمسفورڈ اصلاحات کی شق ۸۴ا الف میں یہ بیان کیا گیا تھا کہ ان اصلاحات کے نفاذ کے دس سال بعد ایک شاہی کمیشن مقرر کیا جائے گا جو ہندوستان میں آئینی اصلاحات کی کارکردگی کے بارے میں جائزہ لے گا۔ اس طرح مجوزہ شاہی کمیشن کا تقرر دسمبر ۱۹۲۹ء میں ہونا تھا مگر ہندوستانی سیاست میں بڑھتے ہوئے قوم پرستانہ جذبات اور ۱۹۲۶ء کے صوبائی کونسلوں کے انتخابات میں انڈین نیشنل کانگریس کی کامیابی نے برطانوی حکومت پر ہندوستان میں مزید دستوری اصلاحات کرنے کی ضرورت کو ظاہر کر دیا۔ چنانچہ مقررہ مدت کے دو سال قبل ہی ۸ر نومبر ۱۹۲۷ء کو سر جان سائمن کی قیادت میں ایک شاہی کمیشن کا تقرر عمل میں لایا گیا جس کو ہندوستان میں قائم شدہ آئینی اداروں کی کارکردگی، مزید آئینی اصلاحات کی ضرورت اور تعلیمی نظام میں بہتری کے بارے میں سفارشات پیش کرنے کا کام سونپا گیا۔ اس امر کی وضاحت کر دی گئی تھی کہ شاہی کمیشن کی رپورٹ کو برطانوی پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کے اراکین پر مشتمل ایک منتخبہ کمیٹی کے سپرد کیا جائے گا جو ہندوستانی زعماء اور قانون ساز اداروں کے اراکین کو مشورہ کے لئے طلب کر سکے گی۔ شاہی کمیشن سر جان سائمن کے علاوہ چھ اراکین پر مشتمل تھا جن میں چار کنزرویٹو، دو لیبر اور ایک لبرل ممبران پارلیمنٹ تھے۔ ان میں سے وسکاؤنٹ برن ہیم اور بیرون سٹر پھٹہ کون ہاؤس آف لارڈز کے ممبر تھے جب کہ جارج فاکس، ایڈورڈ کیہ ڈوگان اور کلیمنٹ ایٹلی ہاؤس آف کامنز کے نمائندے تھے۔ چھٹا ممبر ورنان ہرٹ شورن نامی ایک سکاٹش سوشلسٹ اور کان کن راہنما تھا۔ انڈین سول سروس کے دو ممبران جے ایچ بورئے اور ایس ایف سٹیورڈ کمیشن کے سیکرٹری مقرر کئے گئے۔ کمیشن میں کوئی ہندوستانی رکن شامل نہ تھا کیونکہ برطانوی عہدے داروں کا خیال تھا کہ کمیشن میں متحارب ہندوستانی آراء کی موجودگی کسی متفقہ نتیجہ تک پہنچنے میں حائل ہوگی۔ سائمن کمیشن کی ہیت ترکیبی ہندوستانی راہنماؤں کے لئے شدید غم وغصہ کا باعث بن گئی۔ چنانچہ اپنی تقریروں، بیانات اور قراردادوں کے ذریعے تمام بڑی ہندوستانی سیاسی جماعتوں بشمول انڈین نیشنل کانگریس، آل انڈیا لبرل فیڈریشن، آل انڈیا مسلم لیگ (جناح گروپ) اور ہندومہاسبھا وغیرہ نے اس فیصلہ کی مذمت کرتے ہوئے کمیشن سے کسی طرح کے تعاون سے انکار کر دیا جب کہ مسلم لیگ (شفیع گروپ)، یورپین تجارتی برادری، اینگلو انڈین کمیونٹی اور پس ماندہ طبقات کے نمائندوں نے کمیشن سے تعاون کیا۔ سائمن کمیشن فروری ۱۹۲۸ء میں ہندوستان آیا اور اس نے عمومی مطالعے اور عدم تعاون کی فضا میں اپنا کام مکمل کیا اور وسط ۱۹۳۰ء میں اپنی رپورٹ، جو سائمن رپورٹ کے نام سے مشہور ہوئی، جاری کی۔ یہ رپورٹ ہندوستان کے کسی بھی سیاسی طبقے کو مطمئن کرنے میں ناکام رہی اور اس کو ہر مکتب فکر نے مسترد کر دیا۔

قیمت ہے وہ اس سے بالکل مختلف ہے جو مسلم ہندوستان کے پیش نظر ہے۔ مسلمان وفاقی طرز حکومت کا مطالبہ اس لئے کرتے ہیں کہ یہ ہندوستان کے سب سے مشکل مسئلہ یعنی فرقہ وارانہ مسئلہ کا حل ہے۔ وفاق کے بارے میں شاہی کمیشن [۳۱۴] کا نقطہ نگاہ اگرچہ اُصولاً درست ہے، لیکن اس سے وفاقی ریاستوں میں ذمہ دارانہ حکومت کا قیام مقصود نہیں ہے۔ اس کا مدعا بجز اس کے کچھ نہیں کہ ہندوستان میں جمہوریت کے نفاذ سے انگریزوں کے لئے جو صورت حال پیدا ہو گئی ہے اس سے کسی طرح فرار حاصل کیا جائے اور فرقہ وارانہ مسئلے کا یا تو بالکل اس میں خیال ہی نہیں کیا گیا یا اسے ویسے ہی چھوڑ دیا ہے۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ جہاں تک حقیقی وفاق کا تعلق ہے 'سائمن رپورٹ' نے وفاق کے اُصول کی فی الواقع نفی کر دی ہے۔ 'نہرو رپورٹ' نے یہ دیکھتے ہوئے کہ مرکزی اسمبلی میں ہندوؤں کی اکثریت ہے، وحدانی حکومت کی سفارش کی کیونکہ اس سے تمام ہندوستان میں ہندوؤں کا غلبہ ہو جائے گا۔ 'سائمن رپورٹ' ایک غیر حقیقی وفاق کے باریک پردے میں موجودہ برطانوی اقتدار کو قائم رکھنا چاہتی ہے۔ اس کی وجہ کچھ تو یہ ہے کہ قدرتی طور پر برطانیہ اس اقتدار کو چھوڑنا نہیں چاہتا جو اب تک اسے حاصل رہا ہے اور کچھ اس لئے کہ اگر فرقہ وارانہ مسئلے کا فیصلہ نہ ہوا تو پھر اقتدار اپنے قبضے میں رکھنے کے لئے برطانیہ کو اچھا بہانہ مل جائے گا۔ میں خود مختار ہندوستان میں وحدانی حکومت کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ جنھیں 'باقی ماندہ اختیارات' کہا جاتا ہے وہ خود مختار ریاستوں کو ملنے چاہئیں۔ مرکزی وفاقی ریاست کے پاس صرف ایسے اختیارات ہونے چاہئیں جو وفاق تشکیل کرنے والی ریاستیں اپنی رضا مندی سے واضح طور پر اس کے سپرد کریں۔ میں ہندوستان کے مسلمانوں کو کبھی یہ مشورہ نہیں دوں گا کہ کسی ایسے نظام حکومت پر خواہ وہ برطانوی ہو یا ہندوستان میں وضع کیا گیا ہو، اظہار رضا مندی کریں جو حقیقی وفاق کے اُصول کی نفی کرے یا ان کے جداگانہ سیاسی وجود کو تسلیم نہ کرے۔

۳۱۴- شاہی کمیشن سے مراد سائمن کمیشن ہے جسے اس کے سربراہ سر جان سائمن کی وجہ سے سائمن کمیشن کہا جاتا ہے۔ یہاں علامہ اقبال اس کمیشن کی رپورٹ میں ہندوستان کے لئے وفاقی نظام حکومت تجویز کرنے کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔

اس کے خیال میں لفظ قوم کا مفہوم یہ ہے کہ ہندوستان کے تمام باشندے باہم اس طرح خلط ملط ہو جائیں کہ ان کے اندر کسی مخصوص ملت کا انفرادی وجود باقی نہ رہے، لیکن صورت حال ایسی نہیں ہے اور نہ ہی ہم چاہتے ہیں کہ ایسی ہو۔ ہندوستان میں مختلف مذاہب اور نسلیں موجود ہیں۔ اس کے ساتھ ہی مسلمانوں کی عام معاشی پستی، ان کی بے حد مقروضیت خصوصاً پنجاب میں، اور صوبوں کی موجودہ تقسیم کے مطابق بعض صوبوں میں ان کی ناکافی اکثریت کو مدنظر رکھیے تو آپ پر روشن ہو جائے گا کہ مسلمان جداگانہ انتخاب کے لئے کیوں مضطرب ہیں۔ ایسے ملک اور ان حالات میں علاقہ وارانہ انتخاب سے تمام مفادات کی مکمل نمائندگی ممکن نہیں ہے۔ اس کا نتیجہ صرف یہ ہوگا کہ ایک گروہ کا غلبہ قائم ہو جائے گا۔ اگر صوبوں کی تقسیم اس طور پر ہو جائے کہ ہر صوبے میں کم وبیش ایسے گروہ بستے ہوں جن میں لسانی، نسلی، تمدنی اور مذہبی اتحاد پایا جاتا ہے تو مسلمانوں کو علاقہ وارانہ انتخاب پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔

'سائمن رپورٹ' اور وفاق

لیکن جہاں تک مرکزی وفاقی ریاست کے اختیارات کا تعلق ہے انگلستان اور ہندوستان کے پنڈتوں کے تجویز کردہ دساتیر میں جو باریک اختلاف ہے، اس سے دونوں کی نیتوں کا اظہار ہو جاتا ہے۔ ہندوستان کے پنڈت مرکزی حکومت کے موجودہ اختیارات میں کوئی تبدیلی نہیں چاہتے۔ ان کی صرف یہ خواہش ہے کہ یہ حکومت پوری طرح مرکزی مقنّنہ کے سامنے جواب دہ ہو، جس میں ان کی اکثریت اس وقت اور بھی زیادہ طاقت ور ہو جائے گی جب نامزد اراکین کا طریقہ ختم ہو جائے گا۔ اس کے برعکس انگلستان کے پنڈتوں نے یہ محسوس کرتے ہوئے کہ اگر جمہوریت کا اطلاق مرکز میں کیا گیا تو یہ ان کے مفاد کے خلاف ہوگا اور ذمہ دارانہ طرز حکومت کی جانب پیش قدمی کی صورت میں تمام اختیارات ان کے ہاتھوں سے نکل جائیں گے۔ اس لئے انھوں نے مرکز کی بجائے صوبوں میں جمہوریت کا تجربہ منتقل کر دیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انھوں نے وفاق کے اُصول کو رائج کیا ہے اور اس کے متعلق کچھ تجاویز پیش کر کے بظاہر آغاز کر دیا ہے لیکن ان کی سوچ کے مطابق اس اُصول کی جو قدر و

ریاست کی شرکت ضروری ہے۔ ہندوستان کے لوگوں، بالخصوص اقلیتوں کو اس سے ایک نوع کی حیرت ہوئی کہ والیان ریاست نے گول میز کانفرنس میں ڈرامائی طور پر یہ اعلان کر دیا کہ وہ کل ہند وفاق میں شامل ہونے کو تیار ہیں۔ ان کے اس اعلان کے بعد ہندو مندوبین نے جواب تک وحدانی طرز حکومت کے زبردست حامی تھے چپکے سے وفاق کی سکیم کو منظور کر لیا۔ ابھی تھوڑے

ریاستیں بھی شریک ہوں گی۔ نیز برطانوی حکومت نے یہ مطالبہ بھی مان لیا کہ ہندوستان کے مستقبل کے آئینی ڈھانچے میں مرکزی اور صوبائی انتظامیہ متعلقہ قانون ساز اداروں کے سامنے جواب دہ ہوں گی۔ بشرطیکہ ہندوستان میں وفاقی نظام رائج کیا جائے۔

دوسری گول میز کانفرنس ۷ ستمبر ۱۹۳۱ء کو شروع ہوئی اور یکم دسمبر ۱۹۳۱ء تک جاری رہی۔ اس کے ممتاز شرکاء میں علامہ محمد اقبال، گاندھی، پنڈت مدن موہن مالویہ، مسز سروجنی نائیڈو، سر علی امام، ڈاکٹر ایس کے ڈاٹا اور جی ڈی برلا شامل تھے۔ اس کانفرنس میں ہندوستان کی وفاقی عدلیہ کا ڈھانچہ طے پا گیا اور صوبوں اور مرکز کے درمیان اختیارات کی تقسیم کے معاملے میں تفصیل سے بحث کی گئی مگر وفاقی مقننہ کی ہیت اور ہندوستانی ریاستوں کی وفاق میں نمائندگی کے سوال تشنہ طلب رہ گئے اور اقلیتوں خصوصاً مسلمانوں کی نمائندگی کے بارے میں بھی کوئی اطمینان بخش تصفیہ نہ طے پا سکا۔ فرقہ وارانہ نمائندگی کے سوال پر کسی باہمی سمجھوتہ کی عدم موجودگی میں برطانوی وزیر اعظم نے 'کیمونل ایوارڈ' کے ذریعے اقلیتوں کے لئے چند تحفظات کا اعلان کیا جس کی رو سے مسلمان اور دیگر اقلیتوں کے ساتھ ساتھ ہندو پس ماندہ طبقات کو بھی علیحدہ نمائندگی دے دی گئی۔ اس فیصلے پر ہندو جاتی میں کھلبلی مچ گئی اور گاندھی نے اچھوتوں کو علیحدہ نمائندگی دینے کے خلاف مرن برت رکھ لیا جس پر ان کی علیحدہ نمائندگی پونا سمجھوتہ کے ذریعے واپس لے لی گئی مگر مسلمانوں کی علیحدہ نمائندگی برقرار رکھی گئی۔

تیسری گول میز کانفرنس جو ۱۹۳۲ء میں منعقد ہوئی، رسمی نوعیت کی تھی۔ اس میں مستقبل کے آئینی خاکے کے چند عمومی اُصولوں پر اتفاق رائے ہو گیا جس کو بعد میں مارچ ۱۹۳۳ء میں قرطاس ابیض کی شکل میں شائع کر دیا گیا۔ اس قرطاس ابیض کو مزید چھان بین کے لئے پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کے نمائندوں پر مشتمل مشترکہ منتخبہ کمیٹی کے پاس بھیج دیا گیا۔ اس کمیٹی نے تفصیلی جانچ پڑتال کے بعد اپنی حتمی رپورٹ حکومت برطانیہ کو پیش کی جس کے نتیجے میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء نافذ کیا گیا۔ یہاں علامہ اقبال پہلی گول میز کانفرنس کے انعقاد کے بارے میں انگریزوں کی پالیسی کا حوالہ دے رہے ہیں۔

گول میز کانفرنس اور وفاق

مرکزی حکومت کے نظام میں تبدیلی رائج کرنے سے قبل انگریزوں نے بہت پہلے اس کے بارے میں سوچ لیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آخرکار یہ اعلان کیا گیا کہ گول میز کانفرنس[۳۱۴] میں والیان

۳۱۴۔ ہندوستان کے آئینی مسائل کے حل کے لئے اس وقت کی برطانیہ میں حکمران جماعت، لیبر پارٹی نے لندن میں گول میز کانفرنس منعقد کرانے کا فیصلہ کیا جس میں برطانوی زعما، ہندوستانی ریاستوں کے نمائندے اور ہندوستان کے نمایاں سیاسی گروہوں کے اراکین شریک ہوئے۔ گول میز کانفرنس کے تین دور ۱۹۳۰ء، ۱۹۳۱ء اور ۱۹۳۲ء میں منعقد ہوئے اور ان میں طے پانے والے اُصولوں کی بنیاد پر گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ، ۱۹۳۵ء منظور کیا گیا۔ گول میز کانفرنس کا پہلا اجلاس ۱۲ر نومبر ۱۹۳۰ء کو ہاؤس آف لارڈز کی شاہی گیلری میں منعقد ہوا۔ اس کے دیگر اجلاس ۱۹ر جنوری ۱۹۳۱ء تک جاری رہے۔ برطانوی نقطہ نظر کی ترجمانی تینوں بڑی سیاسی جماعتوں یعنی لیبر، کنزرویٹو اور لبرل پارٹیوں کے سولہ اراکین نے کی۔ برطانوی ہند میں گورنر جنرل کی طرف سے نامزد کردہ ۵۷ افراد شریک ہوئے جب کہ ہندوستانی ریاستوں کی طرف سے سولہ نمائندے موجود تھے۔ اس طرح پہلی گول میز کانفرنس کے کل شرکاء کی تعداد ۸۹ تک جا پہنچی۔ پہلی گول میز کانفرنس میں انڈین نیشنل کانگریس کا کوئی نمائندہ شریک نہ ہوا کیونکہ کانگریسی رہنماؤں اور برطانوی حکومت کے درمیان کانفرنس کے مقاصد کے بارے میں اختلاف رائے پیدا ہو گیا تھا۔ نتیجتاً کانگریس نے اپنے دسمبر ۱۹۲۹ء کو لاہور میں ہونے والے سالانہ اجلاس میں گول میز کانفرنس کا مقاطعہ کرنے کے ساتھ مکمل آزادی کے حصول کو ہندوستان کا سیاسی مستقبل قرار دے دیا۔ کانگریس کی عدم موجودگی میں ہندو نقطہ نظر کی نمائندگی سر تیج بہادر سپرو، سی نواس شاستری، ایم ار جیا کار اور ممتاز صحافی و لے چنتا مانی نے کی۔ مسلمانوں کے نمایاں شرکاء میں سر آغا خان، سر محمد شفیع، مولانا محمد علی جوہر، اے کے فضل الحق اور قائداعظم محمد علی جناح شامل تھے۔ سکھوں کی طرف سے سمپورن سنگھ، ہندو مہا سبھا کی طرف سے ڈاکٹر بی ایس مونجے، اور پس ماندہ طبقات کی جانب سے ڈاکٹر بی۔ آر اُمیدکر شریک تھے۔ کے۔ ٹی پال نے ہندوستانی عیسائیوں کی نمائندگی کی جبکہ سر ہبرٹ وتیج اور اے جے گڈنی برطانوی تجارتی برادری اور اینگلو انڈین کمیونٹی کی طرف سے شامل اجلاس تھے۔ ہندوستانی ریاستوں کی طرف سے الور، برودا، بھوپال، بیکانیر، کشمیر، پٹیالہ اور چند دوسری چھوٹی ریاستوں کے حکمران بذات خود گول میز کانفرنس میں شریک ہوئے جب کہ سر اکبر حیدری، سر محمد اسمٰعیل، اور کرنل کے این ہکسر نے بالترتیب ریاست حیدر آباد، میسور اور گوالیار کی نمائندگی کی۔ پہلی گول میز کانفرنس میں آٹھ سب کمیٹیاں تشکیل دی گئیں جن کے ذمہ مرکزی ڈھانچے، صوبائی آئین ساز اداروں، رائے دہی کے معیار، علیحدگی سندھ، صوبہ سرحد میں آئینی اصلاحات کا نفاذ، دفاع، سرکاری ملازمتوں میں ہندوستانیوں کی نمائندگی اور اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کے بارے میں سفارشات پیش کرنے کا کام سونپا گیا۔ اس کانفرنس کی سب سے نمایاں بات برطانوی وزیراعظم کا یہ اعلان تھا کہ ہندوستان میں وفاقی طرز حکومت کو رائج کیا جائے گا جس میں صوبوں کے ساتھ

ابتدا ایا جلاس میں اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا جس سے انگلستان کے وزیر اعظم[۷] اسکو موقع ملا کہ

۳۱۷- جیمز ریمزے میکڈونلڈ (۱۸۶۶ء۔۱۹۳۷ء) برطانیہ کا پہلا لیبر وزیر اعظم تھا جس نے ایڈون سموئیل مانٹیگو (۱۸۷۹ء۔۱۹۲۴ء) کی طرح ہندوستان کی جدوجہد آزادی پر گہرے اثرات مرتب کئے۔ وہ نہ صرف ہندوستان کو درجہ نوآبادیات دینے کا حامی تھا بلکہ اس نے گول میز کانفرنس کے انعقاد کے ذریعے اس سلسلے میں عملی قدم بھی اُٹھایا۔ میکڈونلڈ ۱۸۶۶ء میں سکاٹ لینڈ میں پیدا ہوا۔ اس کی ابتدائی تعلیم قدرے بے قاعدہ رہی اور وہ رسمی تعلیم سے زیادہ بہرہ مند نہ ہوسکا۔ ابتدا ہی سے وہ سوشلسٹ طرز سیاست کا حامی اور مزدور حقوق کے حصول کے لئے جدوجہد کرتا رہا۔ ۱۸۹۳ء میں اس نے لیبر پارٹی میں شمولیت اختیار کی اور ۱۸۹۶ء میں پارٹی کی قومی انتظامی کونسل کا ممبر مقرر ہوا۔ ۱۹۰۰ء میں وہ پارٹی سیکرٹری منتخب ہوا اور ۱۹۱۱ء تک یہ فرائض انجام دیتا رہا۔ ۱۹۰۶ء میں وہ برطانوی پارلیمنٹ کا رکن منتخب ہوا اور ۱۹۲۲ء میں اپوزیشن لیڈر مقرر کیا گیا۔ ۱۹۲۳ء کے عام انتخابات میں لیبر پارٹی نے ۱۹۱ نشستیں حاصل کر کے لبرل ووٹوں کی حمایت سے پہلی دفعہ اپنی حکومت بنائی جس کا سربراہ میکڈونلڈ کو مقرر کیا گیا۔ اس طرح اسے پہلے لیبر وزیر اعظم ہونے کا اعزاز حاصل ہوا۔ ۱۹۲۸ء میں لیبر پارٹی نے ۲۶۷ نشستیں جیت کر میکڈونلڈ کی قیادت میں دوسری دفعہ حکومت بنائی۔ ۱۹۳۱ء کی معاشی بدحالی نے اسے قومی حکومت بنانے پر مجبور کیا جس کا وہ ۱۹۳۵ء تک سربراہ رہا۔ ۱۹۳۵ء سے لے کر ۱۹۳۷ء تک وہ لارڈ پریذیڈنٹ رہا۔ اس نے ۱۹۳۷ء میں انتقال کیا۔ میکڈونلڈ کی ہندوستانی سیاست سے دلچسپی کا آغاز ۱۹۱۵ء میں ہوا جب اس گوپال کرشنا گوکھلے (۱۸۶۶ء-۱۹۱۵ء) کے ہمراہ سرکاری ملازمتوں کے بارے میں شاہی کمیشن کا رکن مقرر کیا گیا۔ اس تقرری کے دوران اسے ہندوستانی جذبات کے مشاہدہ کا براہ راست موقعہ ملا اور وہ ہندوستان کے لئے مزید آزادی اور خودمختاری کا حامی ہوگیا۔ ۱۹۲۴ء میں جب وہ پہلی دفعہ وزیر اعظم بنا تو اس نے اعلان کیا کہ ہندوستان کو درجہ نوآبادیات دلوانا لیبر حکومت کا مطمح نظر ہے۔ ۱۹۲۸ء میں منعقدہ دولت مشترکہ کی لیبر کانفرنس میں میکڈونلڈ نے ہندوستان کو برابری کی سطح پر دولت مشترکہ میں شامل کرنے پر زور دیا۔ جب لیبر پارٹی اس کی قیادت میں دوسری مرتبہ برسر اقتدار آئی تو اس نے پہلی گول میز کانفرنس منعقد کرائی تاکہ ہندوستان کے آئینی مسائل کا کوئی متفقہ حل تلاش کیا جا سکے۔ اس طرح اس نے گاندھی۔ اروِن معاہدہ طے پا جانے میں بھی کلیدی کردار ادا کیا جس کی وجہ سے کانگریس دوسری گول میز کانفرنس میں شریک ہوسکی۔ اس طرح میکڈونلڈ نے برصغیر پاک و ہند کی جدوجہد آزادی میں ہمدردانہ رویہ اختیار کر کے ہندوستانی تحریک آزادی پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ بہرحال یہ امر ملحوظ خاطر رہے کہ اس نے ہمیشہ کانگریس کا ساتھ دیا اور مسلمانوں کے جائز مطالبات کو بھی درخور اعتنا نہ سمجھا جس کی بنا پر مولانا محمد علی جوہر اسے 'رام جی مکدونل' کہہ کر پکارتے تھے۔ یہاں علامہ اقبال پہلی گول میز کانفرنس میں اس کی جانب سے کی جانے والی اختتامی تقریر کا حوالہ دے رہے ہیں۔

ہی دن ہوئے جناب شاستری[315] نے سر جان سائمن[316] کو ہندوستان کے لئے وفاق کی سکیم کی سفارش کرنے پر ہدفِ تنقید بنایا، لیکن دفعتاً وہ بھی وفاق پر رضامند ہو گئے اور کانفرنس کے

۳۱۵- شاستری سے مراد سری نواس شاستری ہے جس کے بارے میں معلومات اوپر دے دی گئی ہیں یہاں علامہ اقبال سائمن کمیشن رپورٹ کے بارے میں شاستری کے تاثرات کا حوالہ دے رہے ہیں۔

۳۱۶- سر جان البروگ سائمن (۱۸۷۳ء-۱۹۵۴ء) ممتاز برطانوی قانون دان اور مدبر تھا جس نے کئی حکومتی اور سیاسی عہدوں پر خدمات انجام دیں۔ وہ برطانیہ میں باتھ کے مقام پر ۱۸۷۳ء میں پیدا ہوا اور رفتس کالج ایڈنبرا اور واڈھام کالج آکسفورڈ میں تعلیم پائی۔ اس نے اپنی عملی زندگی کا آغاز بطور وکیل کیا اور جلد ہی اس کا شمار اس پیشے سے وابستہ نمایاں افراد میں ہونے لگا۔ الاسکا سرحدی ثالثی میں اس نے برطانوی حکومت کے جونیئر کونسل کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ ۱۹۰۶ء میں وہ ممبر پارلیمنٹ منتخب ہوا اور ۱۹۲۰ء میں اسے سر کا خطاب دیا گیا۔ ۱۹۱۳ء سے ۱۹۱۵ء تک وہ اٹارنی جنرل کی حیثیت سے خدمات انجام دیتا رہا اور ۱۹۱۵ء سے ۱۹۱۶ء تک برطانیہ کا ہوم سیکرٹری رہا۔ ۱۹۱۶ء میں پہلی جنگ عظیم میں عام لام بندی کے خلاف بطور احتجاج وہ مستعفی ہو گیا مگر محاذ جنگ پر ۱۹۱۷ء-۱۹۱۸ء کے دوران ذاتی طور پر جنگی خدمات انجام دیں۔ جنگ عظیم اول کے خاتمے پر اس نے ایک بار پھر وکالت کے پیشے کو اختیار کیا اور اپنی ذہانت اور محنت شاقہ کی بدولت اس کا شمار اس شعبے کے امیر ترین افراد میں ہونے لگا۔ ۱۹۲۶ء میں اسے ہندوستان میں آئینی اصلاحات کے نفاذ کے لئے قائم کئے جانے والے شاہی کمیشن کا سربراہ مقرر کیا گیا جو سائمن کمیشن کے نام سے مشہور ہوا۔ ۱۹۳۱ء میں اس نے اپنی جماعت لبرل پارٹی کی پالیسیوں سے اختلاف کرتے ہوئے لیبر وزیر اعظم میکڈونلڈ کی مشترکہ حکومت کی حمایت کی اور اس دور میں سیکرٹری خارجہ کی حیثیت سے خدمات انجام دیتا رہا۔ ۱۹۳۲ء میں اس نے تیسری گول میز کانفرنس میں برطانوی مندوب کی حیثیت سے شرکت کی اور ۱۹۳۴ء میں ہندوستان میں آئینی اصلاحات کے لئے بنائی جانے والی مشترکہ پارلیمانی کمیٹی کا رکن منتخب ہوا۔ ۱۹۳۵ء سے ۱۹۳۷ء تک اس نے ہوم سیکرٹری کے فرائض انجام دیئے اور ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۰ء تک وہ شاہی خزانے کا نگران رہا۔ ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۵ء تک وہ چرچل کی جنگی کابینہ میں لارڈ چانسلر رہا۔ اس نے طویل سیاسی زندگی کے اختتام پر ۱۹۵۴ء میں وفات پائی۔ یہاں علامہ اقبال سر جان سائمن کی سربراہی میں کام کرنے والے شاہی کمیشن کی رپورٹ کا حوالہ دے رہے ہیں۔

ہے۔ یہ جماعت برطانیہ کے قدیم روایات کی بقا کے لیے کوشاں رہتی ہے اور ماضی کے ورثے اور اداروں پر فخر کرتی ہے۔ ٹوری کی اصطلاح ایک آئرش لفظ Toraidhe سے مشتق ہے جس کے معنی جلا وطن اور قانون کی حمایت سے محروم شخص کے ہیں۔ اس اصطلاح کو انگلستان کے ایک دوسرے قدیم سیاسی گروہ وھگز نے تحقیراً ان لوگوں کے لیے استعمال کیا جو ان کی سیاسی مخالفت پر کمر بند تھے۔ ٹوریوں نے ابتدا میں 'پرشکوہ انقلاب' لانے والوں کے ساتھ تعاون کیا مگر بعد میں جیکو بایٹ باغیوں سے مل گئے جس کے نتیجے میں وہ جارج سوم کے عہد تک حکومتی اُمور سے الگ کر دیے گئے۔ اس تلخ تجربے کے بعد پٹ دی ینگر کی قیادت میں ایک نئی ٹوری پارٹی نے جنم لیا جس نے بلا شرکت غیرے ۱۷۸۳ء سے لے کر ۱۸۳۰ء تک حکومت کی۔ ٹوری نقلاب فرانس کے مخالف تھے اور نپولین کے ساتھ جنگوں کے سخت دور کے بعد لارڈ لیور پول کی قیادت میں ظلم وستم پر اتر آئے اور لفظ ٹوری ردعمل کے مترادف سمجھا جانے لگا۔ اس صورت حال میں نمایاں تبدیلی جارج لینگ کے دور میں آئی اور ۱۸۲۰ء میں یہ جماعت معتدل اور دائیں بازو کے عناصر میں بٹ کر رہ گئی۔ ٹوریوں نے سر رابرٹ پیل کی قیادت میں جو ۱۸۳۴ء-۳۵ اور ۱۸۴۱ء-۴۶ کے دوران برطانیہ کا وزیر اعظم رہا، اپنا نام کنزرویٹو پارٹی رکھ لیا اور اس فلسفے کا پرچار کیا کہ حکومتی اُمور میں بتدریج اصلاح کا رویہ اپنایا جائے اور تمام تر اصلاح موجودہ اداروں اور روایات کے دائرہ کار میں رہ کر ہی کی جائے۔ اس وقت سے لے کر آج تک کنزرویٹو پارٹی برطانوی سیاست کا ایک اہم کردار ہے اور وقتاً فوقتاً اپنی مخالف پارٹیوں کو شکست دے کر حکومتیں بناتی رہی ہے۔

یہاں علامہ اقبال برطانیہ کی سیاست میں سامراجی نقطہ نظر رکھنے والے سیاست دانوں کے ضمن میں ٹوری پارٹی کا ذکر کر رہے ہیں۔

۳۱۹- لیبر پارٹی برطانیہ کی ایک اہم سیاسی جماعت ہے جو بیسویں صدی کے آغاز میں وجود میں آئی۔ یہ جماعت ارتقائی سوشلزم نافذ کرنے کی موید ہے اور اس امر کی قائل ہے کہ تمام گروہوں کو ترقی کے یکساں مواقع فراہم کیے جائیں۔ برطانوی پارلیمنٹ میں ۱۸۹۲ء سے ہی کیر ہارڈی جیسے چند آزاد مزدور راہنما موجود تھے مگر وہ ایک مشترکہ پلیٹ فارم سے محروم تھے۔ ۱۸۵۹ء میں لندن میں منعقد ہونے والی ٹریڈ یونین کانگریس میں منظور کی جانے والی ایک قرارداد میں محنت کش طبقے کی آزادانہ سیاسی تنظیم کی تشکیل پر زور دیا گیا۔ ۱۹۰۰ء کے عام انتخابات میں جب بارہ مزدور رہنما ممبر پارلیمنٹ منتخب ہوئے تو ان کی سرگرمیوں کو منضبط کرنے کے لئے مزدور نمائندہ کمیٹی کا قیام عمل میں لایا گیا۔ ۱۹۰۶ء کے عام انتخابات میں مزدور نمائندہ کمیٹی نے پچاس اُمیدواروں کی حمایت کی جس میں سے انتیس افراد کامیاب ہو گئے۔ جیسے ہی پارلیمنٹ کا پہلا اجلاس منعقد ہوا، مزدور نمائندہ کمیٹی نے اپنا نام بدل کر لیبر پارٹی رکھ لیا اور اس کے اراکین پارلیمنٹ میں نئی جماعت کی نمائندگی کرنے لگے۔ ۱۹۱۰ء میں ہونے والے انتخابات میں لیبر پارٹی کے منتخب شدہ اراکین کی تعداد چالیس اور بیالیس ہو گئی مگر اس کو حقیقی کامیابی اس وقت حاصل ہوئی جب ۱۹۲۲ء کے عام انتخابات میں اس نے ۱۴۲ نشستیں حاصل کر کے سب سے بڑی اپوزیشن پارٹی ہونے کا اعزاز حاصل کر لیا۔ ریمزے میکڈونلڈ کی قیادت میں لیبر پارٹی نے ۱۹۲۴ء اور ۱۹۲۸ء سے ۱۹۳۰ء تک اقتدار سنبھالا۔ لیبر پارٹی دوسری جنگ عظیم کے دوران بنائے جانے والی مشترکہ قومی حکومتوں میں بھی شریک رہی۔ ۱۹۴۵ء میں منعقدہ عام انتخابات میں کلیمنٹ اٹیلی کی قیادت میں لیبر پارٹی نے ۱۴۶

وہ اپنی اختتامی تقریر میں چند نہایت ہی برجستہ اشارات کر سکیں۔ یہ تمام باتیں انگریزوں کے لئے بھی ایک خاص مفہوم رکھتی ہیں جو وفاق میں والیان ریاست کی شرکت کے خواہاں تھے اور ہندوؤں کے لئے بھی جنھوں نے بلا تامل کل ہند وفاق کے قیام کو منظور کر لیا۔ حقیقت یہ ہے کہ وفاق کی سکیم میں والیان ریاست کی شرکت سے، جن میں مسلمانوں کی تعداد بہت کم ہے، دو مقصد حاصل ہوتے ہیں۔ ایک طرف تو اہم ترین مقصد ہے کہ ہندوستان میں برطانوی اقتدار تقریباً اسی طرح قائم رہے گا جیسے اب ہے اور دوسری طرف کل ہند وفاقی اسمبلی میں اس سے ہندوؤں کو بڑی بھاری اکثریت حاصل ہو جائے گی۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرکزی حکومت کی آخری شکل کے بارے میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں جو اختلاف موجود ہے برطانوی سیاست دان والیان ریاست کے ذریعے نہایت چالاکی کے ساتھ اس سے فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔ خود والیان ریاست کو اس سکیم میں اپنی مستبدانہ حکومت کا تحفظ نظر آتا ہے۔ اگر مسلمانوں نے خاموشی کے ساتھ اس قسم کی سکیم کو منظور کر لیا تو ہندوسان میں ان کا سیاسی وجود بہت جلد ختم ہو جائے گا۔ اس طرح ہندوستانی وفاق کی پالیسی ہندو والیان ریاست کے ہاتھوں میں ہوگی جن کی مرکزی وفاقی اسمبلی میں اکثریت ہوگی۔ دولت برطانیہ کے مفاد کے معاملات میں وہ ہمیشہ انگریزوں کا ساتھ دیں گے اور جہاں تک مملکت کے اندرونی نظم ونسق کا تعلق ہے وہ ہندوؤں کے تسلط اور اقتدار کو قائم رکھنے اور مضبوط کرنے میں مدد دیں گے۔ بالفاظ دیگر یہ سکیم برطانوی سامراج اور ہندو ہندوستان کے درمیان ایک قسم کی مفاہمت ہے یعنی اگر تم میرا اقتدار ہندوستان میں قائم رکھو تو میں اس کے بدلے میں ایسی ہندو حکومت قائم کرنے دوں گا جو دوسرے ہندوستانی فرقوں پر دوامی تسلط رکھے گی۔ اس لئے اگر برطانوی ہندوستان کے صوبوں کو حقیقی خود مختار ریاستوں میں تبدیل نہ کیا گیا تو وفاق میں والیان ریاست کی شمولیت کا مطلب صرف یہی لیا جا سکتا ہے کہ برطانوی سیاست دانوں نے اپنے اختیارات سے دست بردار ہوئے بغیر نہایت چالاکی سے تمام جماعتوں کو خوش کرنے کی کوشش کی ہے، مسلمانوں کو لفظ وفاق، ہندوؤں کو مرکز میں اکثریت دے کر اور برطانوی سامراجیوں کو (خواہ وہ ٹوری پارٹی[۳۱۸] سے ہو یا لیبر پارٹی[۳۱۹] سے) حقیقی اختیارات کی قوت سے۔

۳۱۸- ٹوری پارٹی برطانوی سیاست میں مصروف عمل ایک قدیم سیاسی گروہ ہے جو ۱۶۸۰ء میں سیاسی افق پر نمودار ہوا اور ۱۸۳۰ء میں کنزرویٹو پارٹی کا نام اختیار کر گیا۔ کنزرویٹو پارٹی آج بھی برطانیہ کی اہم سیاسی جماعتوں میں شمار ہوتی ہے اور مختلف ادوار میں زمام اقتدار سنبھالتی رہی ہے۔ اس کے منشور کا بنیادی محور اصلاح کی طرف ایک محتاط رویہ، ذاتی ملکیت کی حوصلہ افزائی اور حکومتی اُمور کے بارے میں نظریاتی طرز عمل کی بجائے عملیت پسند رویہ اختیار کرنا

میرے خیال میں سب سے بہتر طریقہ یہ تھا کہ ابتدا صرف ہندوستان کے وفاق سے کی جاتی۔ جو وفاقی سکیم جمہوریت اور استبداد کے ناپاک اتحاد سے پیدا ہوگی، اس کا نتیجہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہوگا کہ برطانوی ہندوستان بدستور وحدانی مرکزی حکومت کے خطرناک چکر میں پھنسا رہے گا۔ اس قسم کی وحدانی حکومت انگریزوں، والیان ریاست اور ہندوستان کے اکثریتی فرقے کے لئے تو بے حد مفید ہوسکتی ہے لیکن مسلمانوں کے لئے بے فائدہ ہے، جب تک کہ انھیں ہندوستان کے گیارہ میں سے پانچ صوبوں میں اکثریتی حقوق مع 'باقی ماندہ اختیارات' کے حاصل نہ ہوں اور مرکزی اسمبلی کی کل تعداد میں انھیں ۳۳ فی صد نشستیں حاصل نہ ہو جائیں۔ جہاں تک برطانوی ہندوستان کے صوبوں میں حاکمانہ اختیارات کے حصول کا تعلق ہے ہز ہائی نس نواب بھوپال[۳۲۱] سر اکبر حیدری[۳۲۲] اور جناح صاحب[۳۲۳] کا رویہ بالکل حق بجانب ہے۔ چونکہ اب والیان ریاست بھی وفاق میں شریک ہورہے ہیں لہٰذا اب سوال برطانوی ہندستان کی اسمبلی میں مسلمانوں کے تناسب کا نہیں رہا بلکہ یہ مسئلہ کل ہند وفاقی اسمبلی میں مسلمانوں کی نمائندگی کا ہے۔ ہمارا مطالبہ یہ ہونا چاہیے کہ مسلم ریاستوں کے علاوہ جو وفاق میں شریک ہوں ہمیں کل ہند وفاقی اسمبلی میں ۳۳ فی صد نشستیں حاصل ہوں۔

اور نیوزی لینڈ کے نمایاں اشاعتی ادارے شامل ہیں۔ آج رائٹر کے نمائندے تمام دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں اور ایجنسی براہ راست یا قومی خبر رساں اداروں کے ذریعے دنیا کے تمام بڑے اخبارات اور ریڈیو اور ٹیلی ویژن مراکز کو اپنی خدمات فراہم کررہی ہے۔ یہاں علامہ اقبال پہلی گول میز کانفرنس کے بارے میں رائٹر کی ارسال کردہ ایک خبر کا حوالہ دے رہے ہیں۔

۳۲۱- نواب محمد حمید اللہ خان (۱۸۹۴ء-۱۹۶۰ء) ریاست بھوپال کے آخری فرماں روا تھے جنھوں نے ۱۹۲۶ء میں زمام حکومت سنبھالی اور ۱۹۴۸ء تک اس عہدے پر فائز رہے۔ بھوپال برطانوی ہندوستان کی نمایاں ترین ریاستوں میں شمار ہوتی تھی اور ریاست حیدرآباد کے بعد مسلمانوں کے علوم وفنون اور ثقافتی ورثے کی سب سے بڑی محافظ تھی۔ اس کا رقبہ سات ہزار مربع میل تھا اور چالیس کی دہائی میں اس کی آبادی آٹھ لاکھ سے زیادہ تھی۔ ریاست بھوپال زرعی طور پر خوشحال ہونے کے علاوہ معدنیات کی دولت سے بھی مالا مال تھی اور اس میں لوہے، بکسایٹ، مانیکا اور دوسری قیمتی دھاتوں کے بکثرت ذخائر دریافت ہوئے تھے۔

ہندوستان میں ہندو ریاستوں کی تعداد مسلم ریاستوں سے کہیں زیادہ ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ مسلمانوں کا یہ مطالبہ کہ انھیں مرکزی وفاقی اسمبلی میں ۳۳ فی صد نشستیں حاصل ہوں ایسے ایوان یا ایوانات میں کیوں کر پورا کیا جائے گا جو برطانوی ہندوستان اور ریاستوں کے نمائندوں پر مشتمل ہوں گے۔ مجھے اُمید ہے کہ مسلمان مندوبین وفاق کی سکیم کے منشا کو، جس پر گول میز کانفرنس میں بحث ہوئی ہے، خوب اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ مجوزہ کل ہند وفاق میں مسلمانوں کی نیابت کا مسئلہ ابھی زیر بحث نہیں آیا۔ رائٹر[۳۲۰] کی مختصر اطلاع میں بتایا گیا ہے کہ ''عبوری رپورٹ کے مطابق وفاقی مقنّنہ کے دو ایوان تجویز کیے گئے ہیں، جن میں برطانوی ہندوستان اور ریاستوں کے نمائندے شریک ہوں گے لیکن ان کی تعداد کے تناسب پر بعد میں غور کیا جائے گا جب کمیٹی ان عنوانات پر غور کرے گی جن کو ابھی سب کمیٹی کے سپرد نہیں کیا گیا''۔ میری رائے میں تناسب کا سوال نہایت اہم ہے اور اسمبلی کی ہیئت ترکیبی پر بحث کے ساتھ ساتھ ہی اس موضوع پر بحث ہونی چاہیے تھی۔

نشستوں کی اکثریت حاصل کر لی۔ لیبر ۱۹۵۱ء کے انتخابات ہار گئے مگر ۱۹۶۴ء-۱۹۷۰ اور ۱۹۷۴ء-۱۹۷۹ء میں دوبارہ برسر اقتدار آئے۔ آج بھی لیبر پارٹی برطانیہ کی اہم سیاسی جماعتوں میں شمار ہوتی ہے اور اس کے اراکین قومی سیاست میں نمایاں کردار ادا کر رہے ہیں۔ یہاں علامہ اقبال برطانوی سیاست میں سرگرم عمل جماعتوں کے ضمن میں لیبر پارٹی کا ذکر کر رہے ہیں۔

۳۲۰- رائٹر مشہور بین الاقوامی خبر رساں ادارہ ہے جسے ۱۸۵۱ء میں قائم کیا گیا۔ اس کا بانی ایک جرمن نژاد یہودی پال جولیس فری ہر رائٹر تھا جو ۲۱ جولائی ۱۸۱۶ء کو جرمنی میں کیل کے مقام پر پیدا ہوا اور فرانس کے شہر نیس میں ۲۵ رفروری ۱۸۹۹ء کو فوت ہوا۔ رائٹر کا اصلی نام اسرائیل بیر جوف تھا مگر اس نے ۱۸۴۴ء میں عیسائیت قبول کر کے رائٹر کا نام اختیار کر لیا۔ رائٹر نے عملی زندگی کا آغاز ایک بنک کلرک کی حیثیت سے کیا اور بعد میں ایک اشاعتی ادارے میں شراکت داری اختیار کر لی۔ ۱۸۴۹ء میں اس نے پیرس سے ایک خبر رساں ادارے کا آغاز کیا جس میں برقی تار کے ساتھ ساتھ کبوتروں کا بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ ۱۸۵۱ء میں وہ برطانیہ منتقل ہو گیا اور رائٹر ٹیلی گرام کمپنی کے نام سے ایک نئے خبر رساں ادارے کی بنیاد رکھی۔ ابتداء میں رائٹر صرف معاشی اور کاروباری موضوعات کا احاطہ کرتی تھی مگر آہستہ آہستہ اس کا دائرہ کار وسیع ہونے لگا اور کئی اخبارات اس کی خدمات سے استفادہ کرنے لگے۔ رائٹر نے خبروں کی ترسیل میں ٹیلی گراف کے امکانات کو بھانپتے ہوئے اپنے نامہ نگاروں کا جال پوری دنیا میں پھیلا دیا جس سے ادارے کو عالمی حیثیت حاصل ہو گئی۔ ابتداً رائٹر نیوز ایجنسی نجی ملکیت میں رہی مگر ۱۹۲۵ء میں پریس ایسوسی ایشن (پی اے) نے اس کے حصص کے بڑے حصے کی ملکیت حاصل کر لی۔ ۱۹۴۱ء میں رائٹر نیوز ایجنسی کے مکمل حصص پی اے نے حاصل کر لیے۔ اس کے موجودہ مالکان میں برطانیہ، آسٹریلیا

۳۲۲- سر اکبر حیدری (۱۸۶۹ء-۱۹۴۲ء) کا اصل نام محمد اکبر نذر علی حیدری اور خطاب نواب حیدر نواز جنگ تھا۔ وہ ۸ نومبر ۱۸۶۹ء میں بمبئی میں پیدا ہوئے۔ ابتدا ہی سے وہ تعلیمی میدان میں ہونہار تھے اور سولہ سال کی عمر میں میٹرک کرنے کے بعد صرف سترہ سال کی عمر میں امتیازی حیثیت سے گریجویشن کر لی۔ بی اے کرنے کے بعد ۱۸۸۸ء میں سر اکبر حیدری نے محکمہ مالیات ہند میں ملازمت اختیار کی اور چھوٹے عہدوں سے ترقی کرتے ہوئے صوبجات متحدہ کے اسسٹنٹ اکاؤنٹنٹ جنرل مقرر ہو گئے۔ بعد میں بمبئی اور مدراس میں ڈپٹی اکاؤنٹنٹ جنرل اور کنٹرولر خزانہ کے عہدوں پر بھی فائز رہے۔ ان کی مالی معاملات میں سمجھ بوجھ کی بنا پر اکتوبر ۱۹۰۵ء میں ریاست حیدر آباد نے ان کی خدمات حکومت ہند سے مستعار لے لیں اور انھیں ریاست کا اکاؤنٹنٹ جنرل مقرر کیا گیا۔ بعد میں انھیں معتمد مالیات بنا دیا گیا۔ سر اکبر حیدری نے حیدر آباد میں پندرہ سال ملازمت کی اور صدر محاسب، سیکرٹری عدالت و تعلیمات، مذہبی اُمور، صنعت و حرفت اور داخلہ کے طور پر فرائض انجام دیئے۔ اس عرصے میں سر اکبر حیدری نے ریاست حیدر آباد کے معاملات میں گہری دلچسپی لی۔ انھوں نے ریاست میں پہلی دفعہ دستوری اصلاحات نافذ کرنے کے ساتھ محکمہ آثار قدیمہ بھی قائم کیا جس کے سبب ریاست کے تاریخی مقامات کی حفاظت ممکن ہو سکی۔ فروری ۱۹۲۰ء میں سر اکبر حیدری حکومت ہند کی ملازمت میں واپس چلے گئے اور بمبئی کے اکاؤنٹنٹ جنرل کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے۔ مگر ریاست حیدر آباد نے جون ۱۹۲۱ء میں ان کی خدمات دوبارہ مستعار لے لیں اور انھیں مشیر مال مقرر کر دیا گیا۔ ۳۰-۱۹۳۲ء میں سر اکبر حیدری نے گول میز کانفرنس کے مختلف اجلاسوں میں ریاست حیدر آباد کی نمائندگی کی۔ ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۱ء تک وہ ریاست کے وزیر اعظم رہے۔ اس مدت میں ان کا سب سے نمایاں کارنامہ جامعہ عثمانیہ کا قیام تھا جس میں تمام علوم و فنون کی تعلیم اُردو میں دی جاتی تھی۔ ۱۹۴۱ء میں انھیں وائسرائے ہند کی مجلس عاملہ میں وزیر اطلاعات و نشریات مقرر کیا گیا۔ اس حیثیت ہی میں انھوں نے اپنی جان، جان آفرین کے سپرد کی۔ یہاں علامہ اقبال سر اکبر حیدری کی جانب سے برطانوی ہندوستان کے صوبوں میں حاکمانہ اختیارات کے حصول کے لئے گول میز کانفرنس میں اُٹھائی جانے والی آواز کا حوالہ دے رہے ہیں۔

۳۲۳- قائد اعظم محمد علی جناح (۱۸۷۶ء-۱۹۴۸ء) ۲۵ دسمبر ۱۸۷۶ء کو کراچی میں پیدا ہوئے۔ وہ اپنے والد جناح بھائی پونجا اور والدہ مٹھی بائی کے سب سے بڑے فرزند تھے۔ ان کے والدین کا تعلق اسماعیلی خوجہ فرقے سے تھا۔ قائد اعظم نے ابتدائی تعلیم سندھ مدرسۃ الاسلام میں حاصل کی۔ سولہ سال کی عمر میں وہ اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلستان چلے گئے جہاں سے انھوں نے لنکن ان سے بار ایٹ لاء کیا۔ ۱۸۹۶ء میں وہ ہندوستان واپس آئے اور بمبئی میں قانون کی پریکٹس کا آغاز کیا۔ قائد اعظم اپنے زمانہ طالب علمی سے ہی ہندوستانی سیاست میں گہری دلچسپی لیتے تھے اور گلیڈ سٹون، گھوکھلے اور دادا

نواب حمید اللہ ۹ ر ستمبر ۱۸۹۴ء میں بھوپال کے شاہی خانوادہ میں پیدا ہوئے۔ ابتداء ہی سے ان کی والدہ حضرت علیہ سلطان جہاں بیگم، جو ریاست بھوپال کی فرماں روا بھی تھیں، نے ان کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دی۔ ابتدائی تعلیم ریاست میں حاصل کرنے کے بعد نواب حمید اللہ ۱۹۱۰ء میں ایم اے او کالج علی گڑھ میں داخل ہوگئے جہاں سے انھوں نے ۱۹۱۱ء میں میٹرک اور ۱۹۱۵ء میں بی اے کا امتحان پاس کیا اور اس طرح ہندوستانی ریاستی حکمرانوں میں پہلے گریجویٹ ہونے کا اعزاز حاصل کیا۔ اس کے بعد انھوں نے سال بھر قانون کی تعلیم پائی مگر کوئی رسمی ڈگری حاصل نہ کی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد نواب حمید اللہ نے ریاستی اُمور اور مسلمانانِ ہند کی سیاسی و سماجی بہبود کے کاموں میں نمایاں دلچسپی لینا شروع کر دی۔ ۱۹۱۵ء میں وہ بھوپال میونسپل بورڈ کے صدر مقرر ہوئے اور ۱۹۱۶ء میں اپنی والدہ کے چیف سیکرٹری مقرر ہوئے۔ اس کے علاوہ وہ ریاست کے ممبر فنانس اور ممبر قانون کے عہدوں پر بھی فائز رہے۔ اس عرصے میں وہ علی گڑھ یونیورسٹی کے ٹرسٹی بھی مقرر ہوئے۔ بعد ازاں پیرانہ سالی کی بدولت ان کی والدہ ان کے حق میں تخت سے دستبردار ہوگئیں اور ۹ ر جون ۱۹۲۶ء کو نواب حمید اللہ نے عنانِ حکومت سنبھالی۔

ریاست بھوپال کا حکمران مقرر ہونے کے بعد نواب حمید اللہ نے ہندوستانی سیاست میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا شروع کر دیا۔ ۱۹۲۶ء سے ۱۹۳۱ء تک وہ چیمبر آف پرنسز کی اسٹینڈنگ کمیٹی کے رکن رہے۔ ۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۱ء میں منعقد ہونے والی گول میز کانفرنسوں میں انھوں نے ہندوستانی ریاستوں کی نمائندگی کی۔ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۵ء تک وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے چانسلر رہے اور مسلم نوجوانوں کی فلاح و بہبود میں گہری دلچسپی لی۔ اس تمام عرصے میں وہ ہندو مسلم مفاہمت کے لئے بھی کوشاں رہے اور مسلم رہنماؤں پر بھی متفقہ قومی موقف اختیار کرنے پر زور دیا۔ ان کی ہردلعزیز شخصیت کی بنا پر انھیں دو دفعہ چیمبر آف پرنسز کا چانسلر مقرر کیا گیا اور وہ ۳۱-۱۹۳۲ء اور ۴۴-۱۹۴۷ء تک اس عہدے پر فائز رہے۔ داخلی طور پر بھی نواب حمید اللہ کا دورِ حکومت ریاست بھوپال کی تعمیر و ترقی کا سنہرا دور تھا۔ انھوں نے بدلتے ہوئے حالات کے پیشِ نظر ریاستی اُمور میں انقلابی اصلاحات کیں۔ چنانچہ ۱۹۲۷ء ہی میں ریاست میں قانون ساز اسمبلی قائم کر دی گئی۔ اس طرح ریاست میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے حمیدیہ ڈگری کالج ۱۹۴۶ء میں قائم کیا گیا۔ اس کے علاوہ ان کے دربار سے علماء، فضلاء اور ادباء کی ہمیشہ حوصلہ افزائی کی جاتی رہی۔ انتقالِ اقتدار کے موقع پر انھوں نے ہر ممکن کوشش کی کہ آزاد ہندوستان میں دیسی ریاستوں کی وہی حیثیت برقرار رہے جو انھیں برطانوی دور میں حاصل تھی مگر اس کوشش میں ناکامی کے بعد انھوں نے ۳۰ ر اپریل ۱۹۴۸ء کو ریاست بھوپال ہندوستان میں ضم کر دی۔ نواب حمید اللہ نے ۴ ر فروری ۱۹۶۰ء کو بھوپال میں انتقال کیا۔

یہاں علامہ اقبال پہلی گول میز کانفرنس کے دوران ہندوستانی ریاستوں اور مسلم حقوق کے تحفظ کے لئے نواب حمید اللہ کے اختیار کئے جانے والے موقف کی وضاحت کر رہے ہیں۔

دفاع کا مسئلہ

ہندوستان میں وفاقی طرزِ حکومت کی کامیاب کارکردگی کے سلسلے میں دوسرا مشکل مسئلہ ہندوستان کے دفاع کا مسئلہ ہے۔ شاہی کمیشن کے اراکین نے اس مسئلے پر بحث کرتے ہوئے ہندوستان کی تمام کمزوریوں کا ذکر کیا ہے تاکہ فوج کا نظم ونسق برطانوی حکومت کے ہاتھ میں رہے۔ کمیشن کے اراکین نے لکھا ہے کہ ''ہندوستان اور برطانیہ کا تعلق کچھ ایسا ہے کہ ہندوستان کے دفاع کا مسئلہ نہ اس وقت اور نہ مستقبل قریب میں محض ہندوستانی مسئلہ تصور کیا جا سکتا ہے۔ فوج کا نظم ونسق برطانوی حکومت کے نمائندوں کے ہاتھ میں رہنا چاہیے۔'' کیا اس کا لازمی مطلب یہ نہیں ہے کہ جب تک برطانوی افواج اور برطانوی افسروں کی مدد کے بغیر دفاع کے اُمور کو بہتر طور پر سرانجام دینے کی صلاحیت پیدا نہ ہو جائے، برطانوی ہندوستان میں ذمہ دارانہ حکومت کے قیام میں مزید پیش رفت نہیں ہو سکتی؟ موجودہ صورت آئینی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ 'نہرو رپورٹ' میں جس رویے کا اظہار کیا گیا ہے کہ آئندہ جو بھی تبدیلی ہوگی اس میں فوج کا نظم ونسق ایک منتخب اسمبلی کے ماتحت ہو تو اس بات کی تمام اُمیدیں نامعلوم مدت تک کے لئے خطرے میں پڑ جائیں گی کہ مرکزی حکومت اس آخری منزل کی طرف ترقی کرے جو ۲۰/اگست ۱۹۱۷ء[۳۲۴] کے اعلان میں تجویز کی گئی تھی۔

۳۲۴- ۲۰/اگست ۱۹۱۷ء کو وزیرِ اُمورِ ہند ایڈون سموئیل مانٹیگو (۱۹۲۴ء-۱۸۷۹ء) نے برطانوی دارالعوام میں اعلان کیا کہ برطانوی حکومت کی پالیسی جس سے حکومتِ ہند مکمل طور پر متفق ہے، یہ ہے کہ ہندوستانی انتظامیہ کے ہر شعبے میں اہلِ ہند کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں شریک کیا جائے اور حکومت خود اختیاری کے اداروں کو بتدریج ترقی دی جائے تاکہ برطانوی سلطنت کے جزو لاینفک کی حیثیت سے ہندوستان میں بتدریج ذمہ دار حکومت قائم کی جا سکے۔ یہ اعلان تاریخ پاک وہند میں اہم مقام رکھتا ہے کیونکہ اس کے ذریعے ہندوستانیوں کو پہلی دفعہ حکومت خود اختیاری کے قیام کا مژدہ سنایا گیا تھا۔ ورنہ اس سے پہلے منٹو مارلے اصلاحات میں انھیں انگریزوں کے ماتحت اور معاونین کی حیثیت سے ہی حکومتی معاملات میں شریک کیا گیا تھا۔

اس تاریخی تبدیلی کا پس منظر یہ تھا کہ بیسویں صدی کے آغاز سے ہندوستانی قوم پرستی کے بڑھتے ہوئے رجحانات اور ہوم رول لیگ کی روز افزوں مقبولیت کے باعث انگریزی اقتدار کی بنیادیں ہلنے لگی تھیں۔ پہلی جنگ عظیم میں ہندوستانی حمایت اور پرجوش قومی خدمات کے پیش نظر حکومت ہند بھی

بھائی نورو جی جیسے معتدل رہنما ان کے لئے مثالیہ کا درجہ رکھتے تھے۔ ابتداً انھوں نے انڈین نیشنل کانگریس میں شمولیت اختیار کی اور ۱۹۰۶ء میں کلکتہ میں ہونے والے کانگریس کے سالانہ اجلاس میں کانگریس کے صدر دادا بھائی نورو جی کے ذاتی معاون کی حیثیت سے حصہ لیا۔ ۱۹۱۳ء میں جب آل انڈیا مسلم لیگ نے حکومت خوداختیاری کو اپنا نصب العین قرار دیا تو وہ بھی اس میں شامل ہو گئے۔ قائد اعظم کی شروع ہی سے خواہش تھی کہ ہندوستان کی دونوں بڑی قومیں آزادی کیلئے مشترکہ جدوجہد کریں۔ چنانچہ ان کی مخلصانہ کوششوں کی بدولت ۱۹۱۶ء میں میثاق لکھنؤ منظر عام پر آیا جس پر انھیں 'ہندو مسلم اتحاد کا سفیر' کا خطاب دیا گیا۔ قائداعظم ابتداء ہی سے دستوری جدوجہد کے قائل تھے اور انھوں نے ہمیشہ انسانی حقوق کی سربلندی کو اپنا نصب العین گردانا۔ مارچ ۱۹۱۹ء میں انھوں نے رولٹ ایکٹ جیسے جابرانہ قانون کی منظوری کے خلاف امپیریل لیجسلیٹو اسمبلی کی نشست سے استعفیٰ دے دیا۔ وہ گاندھی کی ستیہ گرہ کی مہم اور ہوم رول لیگ کے دستور میں تبدیلی جیسے بنیادی اُمور پر مفاہمت نہ کر سکے اور جب کانگریس نے دسمبر ۱۹۲۰ء میں گاندھی کی تجویز کردہ عدم تشدد کی حکمت عملی اختیار کی تو قائد اعظم نے کانگریس سے استعفیٰ دے دیا مگر انھوں نے ہندو مسلم اختلافات کو مشہور زمانہ چودہ نکات پیش کر کے طے کرنے کی کوشش کی۔ وہ ان مفاہمتی کاوشوں میں ناکامی کے باعث ہندوستانی رہنماؤں کی کوتاہ نظری سے سخت دل برداشتہ ہوئے اور سیاست سے وقتی کنارہ کشی کر کے لندن میں مقیم ہو گئے۔ وہ ۱۹۳۳-۳۰ء کے درمیانی عرصہ میں پریوی کونسل میں وکالت کرتے رہے۔ ان کی عدم موجودگی میں ۶ر مارچ ۱۹۳۴ء کو انھیں آل انڈیا مسلم لیگ کا صدر منتخب کیا گیا اور انھوں نے وطن واپس آ کر مسلم قوم کی فلاح و بہبود میں اپنے شب و روز صرف کرنے شروع کر دیئے۔ قائداعظم کی قیادت میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ مارچ ۱۹۴۰ء میں ایک علیحدہ آزاد مسلم مملکت قائم کرنے کی تجویز پیش کی گئی اور صرف سات سال کی قلیل مدت میں پاکستان حاصل کر لیا گیا۔ حصول آزادی کے بعد وہ پاکستان کے پہلے گورنر جنرل مقرر ہوئے مگر گزشتہ سالوں کی شب و روز محنت کی وجہ سے ان کی صحت گرتی چلی گئی اور ۱۱ر ستمبر ۱۹۴۸ء کو کراچی میں انھوں نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ یہاں علامہ اقبال پہلی گول میز کانفرنس میں صوبائی خودمختاری کے بارے میں قائداعظم کے اختیار کردہ موقف کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔

ان پہلوؤں پر زور دینے کا مقصد یہ ہے کہ برطانیہ صرف بیرونی خطرات سے ہندوستان کی حفاظت نہیں کر رہا بلکہ امن وامان کا بھی 'غیر جانبدار محافظ' ہے۔ تاہم وفاق کا جو تصور میرے ذہن میں ہے (اس کے مطابق) وفاق ہند میں مسئلے کا ایک پہلو یعنی بیرونی دفاع باقی رہ جائے گا۔ صوبائی افواج کے علاوہ جو اندرونی امن و امان قائم رکھنے کے لئے ضروری ہیں، ہندوستان کی وفاقی کانگریس شمال مغربی سرحد پر ایک طاقتور سرحدی فوج متعین کر سکتی ہے۔ جس میں ہر صوبے کے سپاہی شامل ہوں اور جس کی قیادت ہر فرقے کے لائق اور تجربہ کار افسروں کے ہاتھ میں ہو۔ مجھے معلوم ہے کہ ہندوستان میں لائق افسر نہیں ہیں اور اسی کو عذر بنا کر شاہی کمیشن کے اراکین کہتے ہیں کہ افواج کا انتظام دولت برطانیہ کے پاس رہے، لیکن میں اسی 'رپورٹ' کا ایک اور اقتباس پیش کئے بغیر نہیں رہ سکتا جو میرے خیال میں کمیشن کے اراکین کے دعوے کے خلاف بہترین دلیل ہے۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے ''اس وقت کوئی ہندوستانی جسے بادشاہ کی طرف سے کمیشن ملا ہے کپتان سے زیادہ اونچے عہدے پر فائز نہیں ہے۔ ہمارے خیال میں کپتانوں کی مکمل تعداد انتالیس ہے جن میں سے پچیس معمولی رجمنٹوں میں تعینات ہیں۔ ان میں سے بعض کی عمر اس قدر زیادہ ہے کہ اگر وہ ریٹائرمنٹ سے پہلے ضروری امتحانات پاس بھی کرلیں تو بہت زیادہ اونچے عہدے حاصل نہیں کر سکیں گے۔ ان میں سے اکثر سینڈ ہرسٹ[۳۲۵] نہیں گئے بلکہ انھیں جنگ عظیم میں کمیشن ملا تھا۔'' اب یہ خواہش کتنی ہی سچی اور صورت حال میں تبدیلی کی کوشش

۳۲۵- سینڈھرسٹ برطانیہ کی کاؤنٹی برک شایئر کے ڈسٹرکٹ بریکنل میں واقع ایک قصبہ ہے جو لندن سے ۴۸ کلومیٹر کی مسافت پر ہے۔ ۱۹۸۱ء میں اس قصبے کی آبادی ۱۴،۰۰۰ نفوس پر مشتمل تھی۔ اس قصبہ کے مضافات میں رائل ملٹری اکیڈمی ہے جس کو سینڈھرسٹ بھی کہا جاتا ہے۔ اس اکیڈمی میں برطانوی فوج کے ممکنہ افسر عمومی اور فوجی تعلیم کے ایک لازمی کورس میں شرکت کرتے ہیں۔ ۱۹۳۹ء تک برطانوی فوجی افسران کی تربیت دو مختلف اداروں میں ہوتی تھی۔ آرٹیلری، انجینئرنگ اور مواصلات کے شعبوں کو اختیار کرنے والے وول وچ، لندن میں واقع رائل ملٹری اکیڈمی میں تربیت پاتے تھے جب کہ رسالہ اور پیادہ کے افسران سینڈھرسٹ میں واقع رائل ملٹری کالج میں زیر تربیت رہتے۔ تمام باقاعدہ فوجی افسران کو یکساں معیار کی تعلیم و تربیت دینے کے لئے ۱۹۴۰ء میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ رائل ملٹری اکیڈمی وول وچ اور رائل ملٹری اکیڈمی سینڈھرسٹ کو باہم مدغم کر دیا جائے۔ دوسری جنگ عظیم شروع ہونے کی وجہ سے اس فیصلے پر فوری عمل درآمد نہ ہو سکا اور انجام کار ۱۹۴۷ء میں موجودہ رائل ملٹری اکیڈمی وجود میں آئی۔ آج کل زیادہ تر کیڈٹ اٹھارہ انیس سال کی عمر میں داخلے کا امتحان پاس کر کے اکیڈمی میں شامل ہوتے ہیں۔ طلباء کی کچھ تعداد سابقہ برطانوی مقبوضات سے بھی تعلق رکھتی ہے۔ کورس عموماً بارہ تیرہ ہفتوں پر محیط ہوتا ہے

اپنی دلیل کو اور وہ مضبوط بنانے کے لئے وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ مختلف مذاہب اور متصادم نسلوں میں، جن کی صلاحیتیں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں، مقابلے کی دوڑ ہے، اور یہ کہہ کر اس مسئلے کو ناقابل حل بنانے کی کوشش کی ہے کہ ''ہندوستان اس طرح کی ایک قوم نہیں جس طرح قدرتی طور پر قومیں ہوتی ہیں اور مروجہ اصطلاح میں مراد لی جاتی ہیں۔ یہ بات اور بھی واضح ہو جاتی ہے جب ہم ہندوستان کی جنگ جو نسلوں اور بقیہ لوگوں میں فرق دیکھتے ہیں۔'' مسئلے کے

چند سیاسی مراعات دینے کے حق میں تھی تا کہ معتدل رائے عامہ کو حکومت کی حمایت کرنے میں آسانی ہو۔ ان محرکات کے پس منظر میں ۱۹۱۵ء میں آسٹن چمبرلین، وزیر اُمور ہند نے اس وقت کے ہندوستان کے گورنر جنرل چارلس ہارڈنگ کو ہدایت کی کہ ہندوستان میں سیاسی اصلاحات کے نفاذ کے بارے میں ایک یادداشت تیار کرائے جسے جنگ عظیم اول کے خاتمے کے بعد نافذ کیا جا سکے۔ اکتوبر ۱۹۱۵ء میں اس یادداشت کی وصولی کے بعد چمبرلین نے اسے برطانوی کابینہ کے سپرد کیا تا کہ اس پر مزید غور وخوض کیا جا سکے۔ دریں اثناء لارڈ چمسفورڈ، جو ہارڈنگ کی جگہ ہندوستان کا گورنر جنرل مقرر ہوا تھا، نے اپنے ایک مراسلے میں تجویز پیش کی کہ ہندوستانیوں کو ملک کے انتظامی اُمور میں بتدریج شریک کیا جائے اور ہندوستان کو سلطنت برطانیہ کا حصہ بنا کر اسے بتدریج خود مختاری دی جائے۔ ان تجاویز کی جانچ پڑتال انڈیا آفس کی ایک کمیٹی نے کی جس نے اپنی رپورٹ ۱۶/ مارچ ۱۹۱۶ء کو پیش کر دی۔ مزید برآں اسی سال کے آغاز میں ایک راؤنڈ ٹیبل گروپ نے بھی ہندوستان میں آئینی ترقی کے لئے تجاویز جاری کی تھیں۔ اس کے ساتھ ساتھ امپیریل وار کانفرنس اور امپیریل وار کیبنٹ کے ہندوستانی اراکین نے بھی اپنے ملک میں مزید آئینی اصلاحات نافذ کرنے کی ضرورت پر گاہے بہ گاہے زور دیا تھا۔ جولائی ۱۹۱۷ء میں جب چمبرلین کی جگہ مانٹیگو وزیر اُمور ہند مقرر ہوا تو ہندوستان میں آئینی اصلاحات کے نفاذ کے کام کو مزید تیزی ملی۔ اس سلسلے میں مانٹیگو نے ایک یادداشت کابینہ کو ۳۰/ جولائی ۱۹۱۷ء کو پیش کی جس میں کابینہ کی توجہ ہندوستان کی بگڑتی ہوئی سیاسی صورت حال، ہندوستان میں آئینی اصلاحات کی ضرورت اور اس ضمن میں وائسرائے اور صوبائی حکومتوں کے بڑھتے ہوئے اصرار پر دلائی گئی تھی۔ مانٹیگو کی ذاتی تگ و دو کے نتیجے میں برطانوی کابینہ نے ۱۴/ اگست ۱۹۱۷ء کو اس اعلان کی منظوری دے دی جس کو اس نے ۲۰/ اگست ۱۹۱۷ء کو برطانوی دارالعوام میں پڑھ کر سنایا۔ اعلان اگست میں ہر چند کوئی واضح نظام اوقات نہیں دیا گیا تھا بلکہ واضح کر دیا گیا تھا کہ اس پروگرام پر عمل وقفوں میں کیا جائے گا جس کا تعین اور طریقہ کار حکومت ہند اور حکومت برطانیہ ہی طے کریں گی مگر اس اعلان نے برطانوی سلطنت کے پرانے دور کا خاتمہ کر کے آزادی ہند کی طرف پہلا قدم ضرور بڑھا دیا۔ یہاں علامہ اقبال ۲۰/ اگست ۱۹۱۷ء کے اعلان میں وعدہ کی گئی ذمہ دار حکومت کے قیام کی طرف متوجہ کرا رہے ہیں۔

وجہ ہماری جنگ جو قوموں کی کوئی فطری کمزوری ہے یا فوجی تربیت کی سست رفتاری ہے؟ ہماری جنگ جو قوموں کی فوجی صلاحیتوں سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ فوجی تربیت کی رفتار دوسری قسم کی تربیتوں کے مقابلہ میں سست ہو سکتی ہے۔ میں اس معاملے کا فیصلہ کرنے کے لئے فوجی ماہر نہیں ہوں لیکن ایک عام آدمی کی حیثیت سے کہہ سکتا ہوں کہ اس دلیل کو جس انداز سے پیش کیا گیا ہے اس سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ سلسلہ لامتناہی ہے۔ اس کا مطلب ہندوستان کی مستقل غلامی ہے۔ لہٰذا یہ اور بھی ضروری ہے کہ 'نہرو رپورٹ' کی تجویز کے مطابق سرحدی فوج کا نظم ونسق ایک دفاعی کمیٹی کے سپرد کر دیا جائے جس کے ارکان کا فیصلہ باہمی تصفیہ سے ہو۔

ایک اہم بات یہ ہے کہ 'سائمن رپورٹ' میں بری سرحدوں کو غیر معمولی اہمیت دی گئی ہے لیکن اس کی بحری صورت حال کے متعلق صرف سرسری اشارے کئے گئے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ہندوستان کو ہمیشہ بری سرحدوں کی طرف سے آنے والے حملوں کا مقابلہ کرنا پڑا ہے، لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ اس کے موجودہ حاکم اس کے غیر محفوظ ساحلوں کی وجہ سے قابض ہوئے تھے۔ ایک خود مختار اور آزاد ہندوستان کو بری سرحدوں کے مقابلے میں اپنے ساحلوں کی زیادہ حفاظت کرنی ہوگی۔

مجھے اس بات میں شبہ نہیں ہے کہ اگر وفاق قائم ہو جاتا ہے تو مسلم وفاقی ریاستیں ہندوستان کے دفاع کی خاطر غیر جانب دار ہندوستانی بری اور بحری افواج کے قیام پر خوشی سے رضامند ہو جائیں گی۔ مغلوں کے دور حکومت میں ہندوستان کے دفاع کے لئے اس قسم کی غیر جانب دار فوج واقعتاً موجود تھی، بلکہ اکبر کے زمانے میں سرحدی فوج تمام کی تمام ہندو جرنیلوں پر مشتمل تھی۔ مجھے پکا یقین ہے کہ وفاق ہندوستان میں ایک غیر جانب دار فوج کی سکیم سے مسلمانوں کے حب الوطنی کے جذبات اور زیادہ مضبوط ہو جائیں گے اور اگر کوئی ایسی بدگمانی ہے کہ ہندوستانی مسلمان سرحد پار سے آنے والے مسلمان حملہ آوروں کے ساتھ مل جائیں گے تو وہ ہمیشہ کے لئے دور ہو جائے گی۔

کتنی ہی مخلصانہ کیوں نہ ہو، اسکین کمیٹی[۳۲۶] (جس کے صدر اور فوجی سیکرٹری کے علاوہ تمام اراکین ہندوستانی تھے) نے نہایت مؤثر طریق پر ان الفاظ میں اظہار کیا ہے:

''ترقی کا انحصار اس پر ہے کہ ہر مرحلے پر کامیابی حاصل کی جائے اور جنگی قابلیت کو قائم رکھا جائے۔ گو یہ صورت بہر حال تدریجی اور سست ہوگی۔ موجودہ ہندوستانی افسروں کو جو جونیئر عہدوں پر ہیں اور محدود تجربہ رکھتے ہیں قلیل مدت میں اعلیٰ کمان کے لائق بنانا مشکل کام ہے۔ جب تک افسری کے ہندوستانی اُمیدواروں کی مختصر سی تعداد میں بہت زیادہ اضافہ نہ ہو جائے، اور ہم اس اضافے کے خواہش مند ہیں، جب تک ہندوستانیوں کی کافی تعداد اس قدر تجربہ اور مہارت حاصل نہ کر لے جس سے وہ کچھ ہندوستانی رجمنٹوں کی افسری سنبھال سکیں، جب تک یہ رجمنٹیں عملاً اس آزمائش میں کامیاب نہ ہو جائیں جس سے ان کی قابلیت کا اندازہ ہو سکے اور جب تک ہندوستانی افسر کامیاب فوجی ملازمت میں اعلیٰ کمان حاصل کرنے کے قابل نہ ہو جائیں، اس وقت تک یہ ممکن نہ ہوگا کہ فوج کے نظم و نسق کو ہندوستانیوں کے ہاتھ میں دینے کی پالیسی اس حد تک کامیاب ہو جائے کہ پوری فوج ہندوستانی ہو جائے۔ اس طرح بھی اس کام کی تکمیل میں برسوں لگیں گے۔''

اب میں اس سوال کی جراُت کرتا ہوں کہ اس صورت حال کا ذمہ دار کون ہے؟ کیا اس کی

اور اس میں کامیابی کے بعد طلباء کو فوج کے مختلف شعبوں میں کمیشن دیا جاتا ہے۔ چرچل، جنرل منٹگمری اور جنرل ایوب خان سینڈھرسٹ کے فارغ التحصیل ہیں۔ یہاں علامہ اقبال سنیڈھرسٹ میں تربیت حاصل کرنے والے ہندوستانی کیڈٹوں کی ناکافی تعداد کی طرف اشارہ کر رہے ہیں کیونکہ ۱۹۳۰ء تک چند ہی ہندوستانی وہاں بھیجے گئے تھے۔

۳۲۶- بیسویں صدی کے آغاز ہی سے ہندی رہنما ہندوستانی افواج کے اعلیٰ عہدوں پر ہندوستانیوں کی زیادہ نمائندگی کا مطالبہ کر رہے تھے۔ پہلی جنگ عظیم میں ہندوستانی یونٹوں کی اعلیٰ کارکردگی کے باعث اس مطالبے میں مزید وزن پیدا ہوگیا تھا۔ چنانچہ ۱۹۲۵ء میں حکومت ہند نے ہندوستانی فوج کے چیف آف دی جنرل سٹاف سر اینڈریو اسکین کی سربراہی میں ایک کمیٹی قائم کی کہ اس مطالبہ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اپنی سفارشات پیش کرے۔ اسکین کمیٹی، جس کے صدر اور معتمد کے سوا تمام اراکین مقامی تھے، نے اس امر کی سفارش کی کہ فوج میں ہندوستانی افسروں کی تعیناتی کے لئے سینڈھرسٹ کی طرز پر ہندوستان میں ایک فوجی تعلیم و تربیت کا ادارہ قائم کیا جائے۔ چنانچہ اس کمیٹی کی سفارشات کی روشنی میں ڈیرہ دون (یوپی) میں فوجی تعلیم و تربیت کے لئے ایک کالج قائم کیا گیا جسے ہندوستان میں فوجی افسران کی تربیت کا پہلا ادارہ ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ یہاں علامہ اقبال اسکین کمیٹی کی رپورٹ کے مندرجات کا حوالہ دے رہے ہیں۔

مسلمانوں کو بالترتیب ۵۰% اور ۴۰% نشستیں ملیں، یو پی میں ۱۴% مسلم آبادی کے عوض ان کو ۳۰% نمائندگی دی گئی، بہار میں ۱۳% آبادی کے بدلے میں ۲۵% نشستیں حاصل ہوئیں، سی پی اور مدراس جہاں ۴% اور ۷% مسلم آبادی تھی وہاں انھیں ۱۵% نشستیں دے دی گئیں اور بمبئی کی ۲۰% مسلم آبادی کو ۳/۱ ۳۳ فی صد نشستیں ملیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ خصوصی مفادات کی حامل نشستوں کے علاوہ کوئی مسلمان عام نشستوں سے انتخابات کے لئے کھڑا نہیں ہوگا۔

۴) کسی صوبائی یا مرکزی کونسل میں کوئی ایسا آئینی مسودہ یا قرارداد پیش نہیں کی جائے گی جس کی اس سے متعلقہ قوم کے ۴/۳ ممبران مخالفت کر دیں۔

۵) انتخابات کے لئے زیادہ وسیع رائے دہندگی کا انتظام کیا جائے گا۔

۶) صوبوں کو زیادہ مالی آزادی دی جائے گی۔

۷) انتظامیہ قانون ساز اداروں کے سامنے جواب دہ ہوگی مگر گورنر کو حق استرداد حاصل ہوگا۔

۸) وائسرائے کی انتظامی کونسل میں ہندوستانی ممبران کی تعداد نصف تک کر دی جائے گی۔

۹) مرکزی قانون ساز اسمبلی میں مسلمانوں کو ایک تہائی نشستیں دی جائیں گی اور ان میں سے ۸۰ فی صد افراد منتخب ہوں گے۔

۱۰) بجٹ پر بحث اور منظوری کے اختیارات کونسلوں کو دیئے جائیں گے۔

۱۱) عدلیہ کو انتظامیہ سے الگ کیا جائے گا۔

۱۲) ہر ہندوستانی کو دفاعی افواج میں بھرتی کا حق ہوگا۔

۱۳) لندن میں قائم شدہ انڈین کونسل ختم کر دی جائے گی اور حکومت ہند قانون سازی اور انتظامی اُمور میں سیکرٹری آف سٹیٹ کی مداخلت سے آزاد ہوگی۔

۱۴) آئندہ انتخابات جداگانہ بنیادوں پر منعقد ہوں گے۔

میثاق لکھنؤ کے ذریعے کانگریس نے پہلی دفعہ مسلمانوں کے لئے جداگانہ انتخابات کے حق کو تسلیم کر لیا اور اس کا دائرہ کار پنجاب اور یو پی تک بڑھا دیا گیا جہاں یہ پہلے رائج نہیں تھے۔ اس طرح مسلمان پنجاب اور بنگال میں اپنی اکثریت سے تو دستبردار ہو گئے مگر آل انڈیا مسلم لیگ کو ان کی نمائندہ جماعت اور مسلمانوں کو الگ قوم تسلیم کر لیا گیا۔ ان سفارشات کی اکثریت کو بعد میں مانٹیگو چمسفورڈ اصلاحات (۱۹۱۹ء) میں شامل کر لیا گیا۔ یہ معاہدہ انجام کار مسلمانوں کے لئے انتہائی نقصان دہ ثابت ہوا کیونکہ اقلیتی صوبوں میں حاصل کردہ اضافی نشستیں ان کے کسی کام نہ آسکیں اور وہ ان صوبوں کی سیاست میں کوئی موثر کردار ادا کرنے میں ناکام رہے۔ جب کہ وہ پنجاب اور بنگال کے مسلم اکثریتی صوبوں میں بھی اقلیت بن گئے اور وہاں سیاسی اقتدار حاصل کرنے سے محروم ہو گئے۔ یہ حقیقت اس وقت اور بھی تلخ ہو جاتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ سرحد اور بلوچستان آئینی اصلاحات سے محروم تھے اور سندھ احاطہ بمبئی کا حصہ تھا۔ چنانچہ ہندوستان کے کسی بھی صوبے میں مسلمان برسر اقتدار نہ آسکتے تھے۔ علامہ اقبال اسی تکلیف دہ صورت حال کی طرف اشارہ کر رہے ہیں جو میثاق لکھنؤ طے پانے کی صورت میں پیدا ہوئی۔

دوسری شکل

میں نے مختصراً اس طریق کار کی نشان دہی کر دی ہے جس کی روشنی میں مسلمانان ہند کو ہندوستان کے دو اہم ترین دستوری مسائل کو دیکھنا چاہیے۔ مسلمانان ہند کا سب سے بڑا مطالبہ یہ ہے کہ فرقہ وارانہ مسئلے کے مستقل تصفیے کے لئے برطانوی ہندوستان کی از سر نو تقسیم کی جائے۔ لیکن اگر فرقہ وارانہ مسئلے کا علاقائی حل نظر انداز کر دیا جاتا ہے تو پھر نہایت شد و مد سے مسلمانوں کے ان مطالبات کی تائید کروں گا جس پر آل انڈیا مسلم لیگ اور آل انڈیا مسلم کانفرنس نے بار بار زور دیا ہے۔ ہندوستان کے مسلمان کبھی ایسی دستوری تبدیلی پر رضا مند نہیں ہوں گے جس سے پنجاب اور بنگال میں ان کے اکثریتی حقوق پر اثر پڑے جو جداگانہ انتخاب کے ذریعے حاصل کئے جائیں گے یا مرکزی اسمبلی میں ان کی ۳۳ فی صد نمائندگی کی ضمانت نہ دی جائے۔ مسلمان سیاسی لیڈر دو گڑھوں میں گر چکے ہیں۔ پہلا گڑھا مسترد شدہ 'میثاق لکھنؤ'[۳۲۷] تھا جو ہندوستانی قومیت کے غلط

۳۲۷- دسمبر ۱۹۱۶ء کو لکھنؤ میں آل انڈیا مسلم لیگ اور انڈین نیشنل کانگریس کے مابین مستقبل کی آئینی اصلاحات سے متعلق ایک سمجھوتہ طے پایا جس کو میثاق لکھنؤ کے نام سے شہرت ملی۔ یہ معاہدہ ہندو مسلم اتحاد کا نقطہ عروج اور ملک کی دونوں بڑی جماعتوں کے درمیان اتفاق رائے کا واحد مظاہرہ تھا۔ بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں پے در پے ایسے واقعات پیش آئے جنھوں نے ہندی مسلمانوں کو انگریزوں سے متنفر کر دیا۔ مزید برآں گاندھی اور قائداعظم کی صورت میں ہندوسان کو ایسے رہنما بھی میسر آ گئے جو غیر ملکی تسلط کے خاتمے کے لئے مشترکہ جدو جہد کرنے کے حامی تھے۔ ان دونوں کی مساعی سے ۱۹۱۵ء میں کانگریس اور لیگ دونوں کے اجلاس بمبئی میں منعقد ہوئے جس میں دونوں جماعتوں نے حکومت خود اختیاری کے قیام کو اپنا نصب العین قرار دیا۔ دونوں جماعتوں نے علیحدہ علیحدہ کمیٹیاں بھی قائم کیں جن کو متنازعہ اُمور پر اتفاق رائے تلاش کرنے کا کام سونپا گیا۔ اکتوبر ۱۹۱۶ء کو کلکتہ میں دونوں جماعتوں کے نمائندوں نے ایک مشترکہ اجلاس کے ذریعے میثاق لکھنؤ کے بنیادی اُصول طے کئے اور دسمبر ۱۹۱۶ء میں مسلم لیگ اور کانگریس نے اپنے اپنے سالانہ اجلاسوں میں ان کی توثیق کر دی۔ معاہدہ لکھنؤ کے ذریعے مندرجہ ذیل اُمور طے پائے:

۱) ہندوستان میں پارلیمانی نظام حکومت رائج کیا جائے۔

۲) جنگ عظیم اول کے خاتمے پر لیگ و کانگریس کے مشترکہ وفود انگلستان بھیجے جائیں تاکہ ہندوستان کے سیاسی مطالبات کو ہم آہنگی کے ساتھ پیش کیا جا سکے۔

۳) مسلم اقلیتی صوبوں میں مسلمانوں کو آبادی کے تناسب سے زیادہ نشستیں دے دی گئیں جب کہ بنگال اور پنجاب میں مسلمانوں کو ان کی آبادی سے کم نمائندگی دی گئی۔ چنانچہ پنجاب اور بنگال میں

ممبر دو تہائی اکثریت سے بالاتفاق جداگانہ انتخاب سے دست بردار ہونے کو تیار نہ ہو جائیں۔لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مسلمانوں کی شکایات کو بجا سمجھنے کے باجود حکومت ہند کو اتنی جرأت کیوں نہ ہوئی کہ وہ پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کے لئے آئینی اکثریت کی سفارش کرتی؟

ہندوستان کے مسلمان کسی ایسی تبدیلی پر رضامند نہیں ہوں گے جس کے تحت سندھ کو علیحدہ صوبہ نہ بنایا جائے اور شمال مغربی سرحدی صوبہ کو سیاسی حیثیت سے کم تر درجہ دیا جائے۔میرے خیال میں کوئی وجہ نہیں کہ سندھ کو بلوچستان سے ملا کر کیوں نہ ایک الگ صوبہ بنا دیا جائے۔احاطہ بمبئی اور سندھ میں کوئی چیز بھی تو مشترک نہیں۔شاہی کمیشن کی رائے میں زندگی اور تمدن کے لحاظ سے سندھ ہندوستان کے مقابلے میں عراق اور عرب سے زیادہ ملتا جلتا ہے۔عرصہ ہوا مسلمان

سٹیٹ برائے مقبوضات رہا اور ۲۴-۱۹۲۵ء کے دوران وہ سیکرٹری آف سٹیٹ برائے زراعت رہا۔۱۹۲۵ء میں اسے پہلے بیرن ارون کا خطاب ملا۔نومبر ۱۹۲۵ء میں اسے برطانوی بادشاہ کنگ جارج پنجم کے ایما پر ہندوستان کا گورنر جنرل مقرر کر دیا۔اس عہدے پر وہ مارچ ۱۹۳۱ء تک براجمان رہا۔ارون کی وائسرائے شپ کا زمانہ ہندوستان میں شدید سیاسی بدامنی کا دور تھا۔عدم تعاون کی مہم جو ۱۹۲۰ء میں شروع ہوئی ابھی تک جاری تھی۔سائمن کمیشن میں کسی ہندوستانی کی عدم موجودگی کے باعث جو ملک گیر ہنگامے شروع ہوئے وہ عرصہ دراز تک جاری رہے۔اپریل ۱۹۳۰ء میں کانگریس نے گاندھی کی قیادت میں سول نافرمانی کی مہم شروع کر دی جو گاندھی - ارون معاہدے کی تکمیل تک جاری رہی۔اس معاہدے کے طے پانے کے ایک مہینے بعد لارڈ ارون انگلستان واپس چلا آیا جہاں نئی ذمہ داریاں اس کا انتظار کر رہی تھیں۔۱۹۳۱ء میں ارون کو نایٹ آف گارٹر بنایا گیا۔۱۹۳۲ء میں اسے بورڈ آف ایجوکیشن کا صدر بنایا گیا۔۱۹۳۳ء میں اسے بلا مقابلہ آکسفورڈ یونیورسٹی کا چانسلر مقرر کیا گیا۔۱۹۳۴ء میں اسے اپنے والد کی وفات پر وس کاونٹ ہیلی فکس بنایا گیا۔۱۹۳۵ء میں وہ سیکرٹری آف سٹیٹ برائے جنگ رہا۔۳۸-۱۹۳۷ء کے دوران وہ لارڈ پریوی سیل رہا۔۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۰ء تک وہ سیکرٹری آف سٹیٹ برائے اُمور خارجہ رہا۔۱۹۴۱ء میں اسے امریکہ میں برطانوی سفیر مقرر کیا گیا اور وہ ۱۹۴۶ء تک یہ ذمہ داریاں سنبھالتا رہا۔دریں اثنا اسے ۱۹۴۳ء میں چانسلر آف دی آرڈر کا خطاب بھی دیا گیا۔وطن واپسی پر اسے ۱۹۴۷ء میں شیفلڈ یونیورسٹی کا چانسلر مقرر کیا گیا۔ارون نے مختصر علالت کے بعد ۲۳ر دسمبر ۱۹۵۹ء کو انتقال کیا۔یہاں علامہ اقبال لارڈ ارون کی ہندوستان میں گورنر شپ کے دوران اس کے جداگانہ انتخابات کے بارے میں اختیار کئے گئے موقف کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔

تصور کی پیداوار تھا۔ اس سے مسلمان ہندوستان میں سیاسی اقتدار حاصل کرنے کے تمام مواقع سے محروم ہو گئے۔ دوسرا اگر ڈھا پنجاب کی نام نہاد دیہاتی آبادی کی خاطر اسلامی اتحاد کی عاقبت نااندیشانہ قربانی تھی جس کا اظہار ایک ایسی تجویز میں ہوا جس سے پنجاب کے مسلمان اقلیت میں رہ جاتے ہیں۔ مسلم لیگ کا فرض ہے کہ وہ میثاق اور تجویز دونوں کی مذمت کرے۔

'سائمن رپورٹ' نے مسلمانوں کے لئے پنجاب اور بنگال میں آئینی اکثریت کی سفارش نہ کر کے بہت بڑی ناانصافی کی ہے۔ اس طرح یا تو مسلمان 'میثاق لکھنؤ' کے پابند رہیں یا مخلوط انتخاب کی سکیم کو اختیار کر لیں۔ 'سائمن رپورٹ' کے متعلق حکومت ہند کے مراسلے میں اس امر کا اعتراف کیا گیا ہے کہ اس دستاویز کی اشاعت کے بعد مسلم قوم نے 'رپورٹ' میں تجویز کردہ کسی ایک کو بھی پسند نہیں کیا ہے۔ مراسلے میں تسلیم کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کی یہ شکایت بجا ہو سکتی ہے کہ پنجاب اور بنگال کی کونسلوں میں آبادی کے تناسب کے مطابق انھیں نمائندگی سے اس لئے محروم کر دیا گیا کہ دوسرے صوبوں میں مسلم اقلیتوں کو پاسنگ دیا گیا ہے، لیکن حکومت ہند کے مراسلے میں 'سائمن رپورٹ' کی اس ناانصافی کی تلافی نہیں کی گئی۔ جہاں تک پنجاب کا تعلق ہے اور یہ اہم نکتہ ہے، رپورٹ اس نام نہاد 'محتاط و متوازن سکیم' کی تائید کرتی ہے جو پنجاب کی حکومت کے سرکاری ممبروں نے تیار کی ہے، جس کے مطابق مسلمانان پنجاب کو ہندو اور سکھ اراکین کی مجموعی تعداد پر صرف دو کی اکثریت حاصل ہوتی ہے اور پورے ایوان میں ان کا تناسب ۴۹ فی صد ہوگا۔ یہ ظاہر ہے کہ پنجاب کے مسلمان پورے ایوان میں واضح اکثریت سے کم پر مطمئن نہیں ہوں گے۔ بہر حال لارڈ ارون[۳۲۸] اور ان کی حکومت یہ تسلیم کرتی ہے کہ فرقہ وارانہ انتخابات کو اس وقت تک ختم نہ کیا جائے جب تک رائے دہندگی کا حق اتنا وسیع نہ ہو جائے کہ ہر قوم کا تناسب آبادی واضح طور پر اس کے نمائندوں سے ظاہر ہو سکے اور جب تک صوبائی کونسلوں کے مسلمان

۳۲۸- لارڈ ارون (۱۸۸۱ء-۱۹۵۹ء) کا اصل نام ایڈورڈ فریڈرک لینڈ ے وڈ تھا۔ وہ ۱۸۸۱ء میں ایک ممتاز برطانوی خاندان میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ سیکنڈ وسکاؤنٹ ہیلی فکس تھا۔ اس نے ایٹن اور کرایسٹ چرچ کالج آکسفورڈ میں تعلیم پائی جہاں سے اس نے ۱۹۰۳ء میں تاریخ میں فرسٹ کلاس حاصل کی۔ ۱۹۱۰ء-۱۹۲۵ء تک وہ کنزرویٹو ممبر کی حیثیت سے ایوان زیریں کا رکن رہا۔ ۱۹۱۴ء میں اس نے فوج میں شمولیت اختیار کر لی اور فرانس میں داد شجاعت دیتا رہا۔ ۱۹۲۱ء-۱۹۲۲ء میں وہ انڈر سیکرٹری آف

کے متعلق قول ہے کہ ''مصر کی پشت افریقہ کی جانب ہے اور چہرہ عرب کی جانب'' مناسب رد و بدل کے ساتھ یہی کچھ سندھ کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ اس کی پشت ہندوستان کی طرف ہے اور چہرہ وسط ایشیا کی طرف ہے۔ علاوہ ازیں اگر سندھ کے زرعی مسائل کی نوعیت کو مدنظر رکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ بمبئی کی حکومت کو اپنے لامحدود تجارتی امکانات کو دیکھتے ہوئے اس سے کوئی ہمدردی نہیں ہے اور اس بات کے پیش نظر کہ کراچی بڑھتے بڑھتے لازماً ہندوستان کا دوسرا سب سے بڑا شہر ہوگا تو میرے خیال میں یہ مصلحت کے خلاف ہے کہ اسے احاطہ بمبئی سے ملحق رکھا جائے۔ بے شک آج اس کا رویہ دوستانہ ہے لیکن تھوڑے ہی عرصہ کے بعد حریفانہ ہو جائے گا۔ ہم سے کہا جاتا

افریقہ کے ساحلی علاقوں میں اسلام کی سربلندی کا علم بلند ہوا۔ حضرت علیؓ کے دور خلافت میں ایک معاہدے کی رو سے ملک شام حضرت امیر معاویہؓ کے زیر نگیں تسلیم کر لیا گیا اور عراق پر دانش حیدری کی حکمرانی ہو گئی۔ حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد حضرت امام حسنؓ نے چند شرائط کے عوض زمام حکومت چھوڑ دی اور اس طرح حضرت امیر معاویہؓ بلاشرکت غیرے تمام بلاد اسلامیہ کے حکمران بن گئے۔ انھوں نے مسند خلافت پر متمکن ہوتے ہی سب سے پہلے ممالک اسلامیہ میں امن وامان کی بحالی اور نظام حکومت کی استواری پر اپنی توجہ مرکوز کر دی اور جلد ہی خارجیوں اور دیگر فتنہ پرور عناصر کی سرکوبی کر کے تمام اطراف میں امن و آشتی کی فضا پیدا کر دی۔ اس کے بعد وہ توسیع سلطنت کی طرف متوجہ ہوئے اور بلخ، ہرات، کابل، بست، طخارستان، سجستان، غزنہ، بخارا، سمرقند، مکران، قندھار وغیرہ کو اسلامی قلمرو میں شامل کر لیا۔ عہد معاویہؓ کا اہم پہلو ان کی عظیم بحری فتوحات ہیں۔ رومیوں سے کامیاب بحری معرکوں کے علاوہ قسطنطنیہ پر بحری حملہ اور جزیرہ رودس پر مسلمانوں کا قبضہ اس دور کی نمایاں کامیابیاں ہیں۔ اس کے علاوہ اسلامی بیڑے کو جدید ترین خطوط پر استوار کیا گیا۔ مصر و شام کے ساحلی علاقوں میں جہاز سازی کے کارخانے قائم ہوئے اور اہم مقامات پر قلعے، چھاؤنیاں اور نئے شہر آباد کیے گئے۔ ملک گیری کے علاوہ حضرت امیر معاویہؓ نے اس وسیع خطے کا احسن طریقے سے انتظام چلایا۔ انھوں نے خبر رسانی کے لئے سرکاری ڈاک کا محکمہ قائم کیا۔ فرامین سلطانی میں رد و بدل کے انسداد کے لئے دیوان خاتمہ تشکیل دیا گیا جہاں سرکاری احکام کی نقول محفوظ کر لی جاتی تھیں۔ رفاہ عامہ کے کاموں پر خصوصی توجہ دی گئی۔ زراعت کی ترقی کے لئے جابجا نہریں نکالی گئیں جن سے نہ صرف قحط کے خطرہ کا سدباب ہوا بلکہ زرعی پیداوار میں خاطر خواہ اضافہ بھی ہوا۔ اس کے علاوہ اشاعت اسلام کی طرف بھی خصوصی توجہ دی گئی جس کے نتیجے میں ہزاروں بربر اور رومی مشرف بہ اسلام ہوئے۔ ذاتی طور پر امیر معاویہؓ ایک بلند پایہ خطیب، سخن فہم، فقیہہ اور تاریخ عالم کے مطالعے میں گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ انھوں نے ۶۸۰ء میں وفات پائی۔ یہاں علامہ اقبال مصر کے بارے میں ان کے ایک قول کا حوالہ دے رہے ہیں۔

جغرافیہ دان مسعودی[۳۲۹] نے اس مشابہت کو دیکھتے ہوئے لکھا کہ:
''سندھ وہ ملک ہے جو بلاد اسلامیہ سے قریب تر ہے۔'' پہلے اموی حکمران[۳۳۰] کا مصر

۳۲۹- ابوالحسن علی بن الحسین المسعودی، چوتھی صدی ہجری کا نامور عرب مورخ، جغرافیہ دان، سیاح اور مصنف تھا۔ الفہرست کے مصنف کے خیال میں وہ المغرب کا رہنے والا تھا مگر اس کے اپنے قول کے مطابق اس کا تعلق بغداد میں مقیم ایک عرب خاندان سے تھا۔ اس نے اپنے شہرہ آفاق اسفار کا آغاز ایران سے کیا اور ۹۱۷ء کا کچھ حصہ اصطخر میں بسر کیا۔ اگلے سال اس نے برصغیر پاک و ہند کا قصد کیا اور ملتان اور منصورہ کی سیر و سیاحت کی۔ اس کے بعد وہ کھمبایت اور میسور کے راستے لنکا پہنچا۔ پھر بعض سوداگروں کے ہمراہ چین کا سفر کیا اور واپسی پر زنجبار سے ہوتا ہوا عمان چلا آیا۔ المسعودی کی مضطرب روح نے جلدی ہی دوبارہ رخت سفر باندھا اور بحیرہ خزر کے جنوبی ساحل سے ہوتا ہوا ۹۲۶ء میں فلسطین پہنچا۔ ۹۳۳ء میں اس نے انطاکیہ اور ملک شام کے سرحدی شہروں کی سیاحت کی اور چند روز اپنے آبائی وطن میں قیام کر کے ۹۴۵ء میں دمشق چلا آیا اور آئندہ کئی سال مصر اور شام میں سفر کرتے اور مختلف جگہوں پر قیام کرتے ہوئے گزار دیئے۔ ۹۵۵ء میں وہ مصر کے شہر الفسطاط پہنچا جہاں اگلے سال ۹۵۶ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔ المسعودی نے اپنے مشاہدات کی بنا پر کئی کتب تحریر کیں جن میں مروج الذھب و معاون الجواھر بڑی مشہور ہے۔ بدقسمتی سے اس کی زیادہ تر تصانیف ضائع ہو چکی ہیں کیونکہ وہ عام مذاق سے بالاتر تھیں۔ متاخرین کی دلچسپی المسعودی کی تاریخ نگاری سے ہے جس کے نمونے تمام دنیا میں مختلف کتب خانوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ اس کی تحریروں میں ہمیں اسلامی ممالک اور ان کی طرز معاشرت کے بارے میں نہایت اہم معلومات ملتی ہیں کیونکہ اس کی دلچسپیاں اس کی ذات کی طرح متنوع اور ہمہ گیر ہیں۔ چنانچہ اس نے اپنے زمانے کے تمام اہم موضوعات مثلاً لسانیات، دینیات، طبیعات، اخلاقیات اور سیاسیات وغیرہ سے بحث کی ہے اور اس طرح ہمیں ہمہ گیر معلومات سے نوازا ہے۔ المسعودی نے اپنی تحریروں میں سندھ کے جغرافیائی حالات اور نومسلم باشندوں کے دینی شغف کا بھی تفصیلی ذکر کیا ہے اور یوں اس کا سفر نامہ سندھ اس علاقے کے بارے میں اہم تاریخی ماخذ کا درجہ رکھتا ہے۔ یہاں علامہ اقبال المسعودی کے سندھ کے جغرافیائی حالات کے بارے میں بیان کردہ مشاہدات کا حوالہ دے رہے ہیں۔

۳۳۰- حضرت امیر معاویہؓ ایک نامور صحابی اور خلافت بنوامیہ کے بانی تھے۔ وہ ۶۶۱ء سے ۶۸۰ء تک بلاد اسلامیہ کے متعدبہ حصے پر حکمران رہے۔ ان کا تعلق خاندان بنوامیہ سے تھا جو زمانہ جاہلیت سے ہی قریش میں معزز و محترم متصور ہوتا تھا۔ قبول اسلام کے بعد حضرت امیر معاویہؓ نے حنین اور طائف کے غزوات میں داد شجاعت دی۔ وہ کتابت وحی کے مقدس فریضے کو بھی سرانجام دیتے رہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے زمانہ خلافت میں انھوں نے شام اور اس کے ملحقہ علاقوں میں سطوت اسلامی کا جھنڈا لہرانے میں اہم کردار ادا کیا۔ حضرت عمرؓ کے عہد مبارک میں قساریہ کی فتح کی مہم بھی انھی کے ہاتھوں سر ہوئی۔ حضرت عثمانؓ نے ان کی قائدانہ صلاحیتوں کے اعتراف میں انھیں ملک شام کا والی مقرر کر دیا۔ اس دور میں ان کی زیر قیادت طرابلس، عوریہ، شمشاطہ اور فلیطہ کے مقامات فتح ہوئے۔ مشہور جزیرہ قبرص مسلمانوں کے زیر نگیں آیا اور

حق محض اس لئے سلب کر لیا گیا ہے کہ وہ بارود خانے میں رہتے ہیں۔ شاہی کمیشن کے اراکین کی یہ لطیف دلیل خوش کن تو ہے، لیکن تسلی بخش نہیں ہے۔ سیاسی اصلاح آگ نہیں روشنی ہے اور ہر شخص کو خواہ وہ بارود خانے میں رہتا ہو یا کوئلے کی کان میں، روشنی حاصل کرنے کا حق حاصل ہے۔ افغان بہادر اور ذہین ہیں اور اپنے جائز مقاصد کے لئے تکلیف برداشت کر سکتے ہیں۔ وہ ہر ایسی کوشش کی مزاحمت کریں گے جو ان کو آزادانہ ترقی کے مواقع سے محروم کرے گی۔ ایسے لوگوں کو مطمئن رکھنا ہندوستان اور انگلستان دونوں کے لئے مفید ہے۔ حال ہی میں [۳۳۳] اس بدقسمت صوبے میں جو کچھ ہوا ہے وہ محض یہاں کے باشندوں کے ساتھ سوتیلی ماں کے سے سلوک کا نتیجہ ہے جو بقیہ ہندوستان میں حکومت خود اختیاری کے اُصول کو نافذ کرنے کے بعد شروع ہوا۔ مجھے اُمید ہے کہ برطانوی مدبرین اس صورت حال سے آنکھیں بند کر کے اپنے آپ کو اس فریب میں مبتلا نہ ہونے دیں گے کہ صوبے میں جو بے چینی ہے وہ خارجی اثرات کا نتیجہ ہے۔

حکومت ہند کے مراسلے میں شمال مغربی سرحدی صوبے کے لئے جن اصلاحات کے نفاذ کی سفارش کی گئی ہے وہ بھی تسلی بخش نہیں ہے۔ بے شک یہ مراسلہ 'سائمن رپورٹ' سے ایک قدم آگے ہے کیونکہ اس میں ایک طرح کی نمائندہ کونسل اور نیم منتخب کابینہ کی سفارش کی گئی ہے، لیکن اس مراسلے میں اس اہم صوبے کو دوسرے ہندوستانی صوبوں کے برابر درجہ دینے کا ذکر نہیں ہے، حالانکہ افغان فطری طور پر ہندوستان کے دوسرے لوگوں کے مقابلے میں جمہوری اداروں کے زیادہ اہل ہیں۔

۳۳۳- یہاں ۲۳ر اپریل ۱۹۳۰ء کے شہدائے قصہ خوانی بازار کی طرف اشارہ ہے۔ اس دور میں اپنے مطالبات کی منظوری کے لئے صوبہ سرحد کے سیاسی کارکن پر امن احتجاج کر رہے تھے۔ اس سلسلے میں جب انھوں نے شراب خانوں کے خلاف مظاہرہ کرنے کا ارادہ کیا تو حکومت نے ایک رات پہلے تمام نمایاں قائدین کو گرفتار کر لیا۔ ان گرفتاریوں کے خلاف اگلے دن یعنی ۲۳ر اپریل ۱۹۳۰ء کو جب قصہ خوانی بازار میں پر امن احتجاج کا آغاز ہوا، تو حکومت نے بلاکسی اشتعال سینکڑوں افراد کو گولیوں کا نشانہ بنا دیا اور پورے صوبے میں دہشت اور جبر و استبداد کا بازار گرم کر دیا۔ اس واقعہ نے شمال مغربی سرحدی صوبہ کی سیاست میں استعمار دشمنی کا نیا باب رقم کیا اور پٹھانوں کے جذبہ حریت کو مزید مہمیز دی۔ علامہ اقبال یہاں اسی سانحے کا ذکر کر رہے ہیں۔

ہے کہ مالی مشکلات اس کی علیحدگی کے راستے میں حائل ہیں۔اس کے متعلق کوئی مستند بیان میری نظر سے نہیں گزرا، لیکن یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ ایسی مشکلات موجود ہیں، کوئی وجہ نہیں ہے کہ حکومت ہند اُمید افزا صوبے کو اپنی آزادانہ ترقی کی جدوجہد کے لئے مالی امداد نہ دے۔

جہاں تک شمال مغربی سرحدی صوبے کا تعلق ہے، یہ امر تکلیف دہ ہے کہ شاہی کمیشن کے اراکین نے (اس بات سے) عملاً انکار کر دیا ہے کہ اس صوبے کے باشندوں کو اصلاحات کا حق حاصل ہے۔ان کی سفارشات برے کمیٹی[۳۳۱] سے بھی کم ہیں اور ان کی تجویز کردہ کونسل چیف کمشنر کی مطلق العنانی کے لئے محض آڑ کا کام دے گی۔افغانوں[۳۳۲] سے سگریٹ جلانے کا پیدائشی

۳۳۱- ۱۹۰۱ء میں پنجاب کے سرحدی اضلاع کو علیحدہ صوبے کی شکل دے دی گئی اور اس کا نام شمال مغربی سرحدی صوبہ رکھا گیا۔سیاسی طور پر یہ صوبہ ہزارہ، پشاور، کوہاٹ، بنوں اور ڈیرہ اسماعیل خان کے آباد علاقوں اور مالاکنڈ، خیبر، کرم، ٹوچی اور وانا پر مشتمل ایجنسیوں پر محیط تھا۔اس صوبے کا انتظامی سربراہ چیف کمشنر کہلاتا تھا۔اس کے علاوہ ریونیو اور جوڈیشنل کمشنر اس کی معاونت کرتے تھے۔صوبہ سرحد میں ہمیشہ انگریزوں کی حکومت کے خلاف کسی نہ کسی صورت میں مسلح جدوجہد جاری رہی جس میں ۵-۱۹۰۸ء میں آفریدیوں کی عام بغاوت اور ۱۸۱۸ء میں وانا کے وزیر اور محسود قبائل کی مسلح شورشیں نمایاں ہیں۔اس کے علاوہ تیسری اینگلو افغان جنگ میں بھی صوبہ سرحد کے قبائل نے کھل کر افغان حکمرانوں کا ساتھ دیا۔انگریزوں نے بھی اس صوبہ کا نظم ونسق جنگی بنیادوں پر چلایا اور ہندوستان میں نافذ کی جانے والی مختلف آئینی اصلاحات سے اسے ہمیشہ محروم رکھا گیا۔چنانچہ ہندوستان کی تمام سیاسی جماعتیں صوبہ سرحد کو بھی آئینی مراعات دینے پر اصرار کرتی رہیں۔۱۹۲۲ء میں صوبہ سرحد میں آئینی اصلاحات کے نفاذ کا جائزہ لینے کے لئے ایک سرکاری تحقیقاتی کمیٹی سر ڈینس برے، سیکرٹری اُمور خارجہ حکومت ہند کی سربراہی میں قائم کی گئی جس کی سفارشات مارچ ۱۹۲۴ء میں شائع ہوئیں۔اس کمیٹی نے صوبہ سرحد میں ایک مجلس آئین ساز کے قیام کی ضرورت کو برحق قرار دیتے ہوئے صوبہ میں آئینی اصلاحات کے نفاذ کی سفارش کی اور صوبہ سرحد کے باشندوں کی قابلیت واہلیت اور معاملہ فہمی کی بھی تعریف کی۔

یہاں علامہ اقبال سائمن کمیشن کی رپورٹ میں صوبہ سرحد کے لئے تجویز کردہ کونسل کے قیام کو ناکافی قرار دے کر برے کمیٹی کی رپورٹ کا حوالہ دے رہے ہیں جس میں صوبہ سرحد کے لئے ایک مجلس آئین ساز کے قیام کی سفارش کی گئی تھی۔

۳۳۲- افغانوں سے یہاں مراد شمال مغربی سرحدی صوبہ کے باشندے ہیں۔عرصہ دراز تک ہندی مسلمانوں کو ترک اور صوبہ سرحد کے پٹھانوں کو افغان کہا جاتا رہا۔علامہ اقبال اسی تناظر میں صوبہ سرحد کے باسیوں کو افغان کہہ رہے ہیں۔

اصرار بالکل بجا ہے کہ مرکزی حکومت میں ذمہ داری کا مسئلہ طے کرنے سے پہلے فرقہ وارانہ مسئلے کا تصفیہ ضروری ہے۔ کسی مسلمان سیاسی راہنما کو 'فرقہ پرستی' کے طعن آمیز پروپیگنڈے کا خیال نہیں کرنا چاہیے، اس لئے کہ یہ اصطلاح، بقول وزیراعظم، برطانوی جمہوریت پسندی کے جذبات سے باقاعدہ فائدہ اُٹھانے کے لئے وضع کی گئی ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ انگلستان ایک ایسی صورت حال کو تسلیم کرے جو واقعتاً ہندوستان میں موجود ہی نہیں ہے۔ بہت بڑے مفادات خطرے میں پڑے ہوئے ہیں۔ ہم سات کروڑ ہیں اور ہندوستان کے دوسرے باشندوں کے مقابلے میں ہم میں سب سے زیادہ ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ حقیقتاً ہندوستان کے صرف مسلمان باشندوں ہی کو جدید اصطلاح میں صحیح طور پر ایک قوم کہا جا سکتا ہے۔ اگرچہ ہندو تقریباً تمام معاملات میں ہم سے آگے ہیں، لیکن انھوں نے وہ ہم آہنگی حاصل نہیں کی جو ایک قوم بننے کے لیے ضروری ہے۔ جو اسلام کا آپ کو بلا قیمت عطیہ ہے۔ بے شک وہ ایک قوم بننے کے لیے مضطرب ہیں، لیکن ایک قوم بننے میں بڑی مشکلات پیش آتی ہیں اور جہاں تک ہندوستان کے ہندوؤں کا سوال ہے ان کے سماجی ڈھانچے کو یکسر تبدیل کرنے کی ضرورت ہے۔ مسلمان راہ نماؤں اور سیاست دانوں کو اس باریک لیکن مغالطہ انگیز دلیل سے متاثر نہیں ہونا چاہئے کہ ترکی، ایران اور دوسرے مسلم ممالک بھی علاقائی قومیت کے اُصولوں پر آگے بڑھ رہے ہیں۔ ہندوستان کے مسلمان ان سے بالکل مختلف حالت میں ہیں۔ ہندوستان کے علاوہ اسلامی ممالک کی ساری آبادی مسلمانوں کی ہے۔ وہاں کی اقلیتیں قرآن کے الفاظ میں ''اہل کتاب'' میں سے ہیں۔ کسی یہودی، عیسائی یا زرتشتی کے چھونے سے مسلمان کا کھانا ناپاک نہیں ہوتا اور اسلامی قانون اہل کتاب کے ساتھ مناکحت کی اجازت دیتا ہے۔ حقیقت میں اسلام نے جو پہلا قدم انسانیت کے اتحاد کی طرف اُٹھایا، وہ یہی تھا کہ جن لوگوں کا اخلاقی نصب العین ایک سا تھا انھیں اتحاد و اتفاق کی دعوت دی۔ قرآن پاک کا ارشاد ہے: "یَا اَھْلَ الْکِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمْ"[۳۳۴] مسلمانوں اور عیسائیوں کی جنگوں اور اس کے بعد مختلف صورتوں سے یورپ کی جارحیت کے باعث دنیائے اسلام میں اس آیت کے لامحدود معنوں میں عمل نہ ہوسکا۔ آج بلاد اسلامیہ میں یہ مقصد مسلم قومیت کی شکل میں بتدریج پورا ہو رہا ہے۔

۳۳۴- یہ قرآن پاک کی سورہ آل عمران کی چونسٹھویں آیت کا جزو ہے۔ اس کا ترجمہ ہے کہ ''اے اہل کتاب! آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان (مسلم ہونے میں) برابر ہے۔''

گول میز کانفرنس

میرا خیال ہے کہ اب مجھے گول میز کانفرنس کے متعلق کچھ کہنا چاہیے۔ ذاتی طور پر مجھے اس کانفرنس کے نتائج سے زیادہ اُمید نہیں ہے۔ خیال یہ تھا کہ فرقہ وارانہ رزم گاہ سے دور اور ایک بدلی ہوئی فضا میں ہوش مندی سے کام لیا جائے گا اور ہندوستان کے دو بڑے فرقوں کے درمیان حقیقی صلح و صفائی کے بعد ہندوستان کی آزادی کی صورت نکل آئے گی۔ لیکن واقعات اس کے برعکس ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ لندن میں فرقہ وارانہ سوال پر بحث میں پہلے سے زیادہ واضح ہو گیا ہے کہ ہندوستان کی دو بڑی تہذیبی اکائیوں میں کتنا گہرا اختلاف ہے، لیکن انگلستان کے وزیر اعظم بظاہر اس امر سے انکار کرتے ہیں کہ ہندوستان کا مسئلہ قومی نہیں بلکہ بین الاقوامی ہے۔ انھوں نے کہا ہے ''میری حکومت کے لئے یہ مشکل ہے کہ پارلیمنٹ میں جداگانہ انتخابات کو برقرار رکھنے کی سفارش کرے کیوں کہ مخلوط انتخابات برطانوی جمہوریت پسندی کے جذبات سے زیادہ مطابقت رکھتے ہیں۔'' بظاہر انھیں یہ بات نظر نہیں آتی کہ برطانوی جمہوریت کی مثال ایسے ملک میں فائدہ مند ثابت نہیں ہو سکتی جہاں بہت سی قومیں آباد ہوں اور جداگانہ انتخاب کا طریقہ مسئلے کے جغرافیائی حل کا صرف ایک گھٹیا بدل ہے۔ نہ ہی یہ اُمید ہے کہ اقلیتوں کی سب کمیٹی کسی تسلی بخش تصفیے پر پہنچے گی۔ یہ سارا معاملہ برطانوی پارلیمنٹ میں پیش کرنا پڑے گا اور ہمیں اُمید رکھنی چاہیے کہ برطانوی قوم کے بالغ نظر نمائندے اکثر ہندوستانی سیاست دانوں کے برعکس حالات کی تہہ تک پہنچ جائیں گے اور ہندوستان جیسے ملک میں امن و سلامتی کے مسئلے کی اصل بنیاد کو دیکھ لیں گے۔ اس نظریے پر مبنی دستور بنانا کہ ہندوستان میں ایک قوم بستی ہے یا برطانوی طرز کی جمہوریت کے اُصولوں کا ہندوستان پر اطلاق کرنا دراصل نادانستہ طور پر ہندوستان کو خانہ جنگی کے لئے تیار کرنا ہے۔ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں ملک میں اس وقت تک امن نہیں ہو سکتا جب تک کہ ہندوستان کی تمام قوموں کو اپنے ماضی سے یکا یک رشتہ منقطع کئے بغیر جدید اُصولوں پر آزادانہ ترقی کے مواقع فراہم نہ کئے جائیں۔

مجھے یہ کہتے ہوئے مسرت حاصل ہوتی ہے کہ ہمارے مسلمان مندوبین کو اس مسئلے کے صحیح حل کی اہمیت کا پورا پورا احساس ہے، جسے میں ہندوستان کا بین الاقوامی مسئلہ کہتا ہوں۔ ان کا یہ

بالکل صحیح تھی جب انھوں نے علی گڑھ یونیورسٹی میں کہا کہ قوم راہ نما پیدا کرنے میں ناکام رہی ہے۔ راہ نماؤں سے میری مراد ایسے افراد ہیں جو اعانت ایزدی یا اپنے وسیع تجربے کی بدولت اسلام کی روح اور تقدیر کے بارے میں گہرا ادراک رکھتے ہوں اور اس کے ساتھ ساتھ جدید تاریخ کے رجحانات سے بھی پورے واقف ہوں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن پر عوام الناس کی ہمت اور قوت عمل کا انحصار ہوتا ہے اور یہ بنائے نہیں جاتے بلکہ خدا کی طرف سے عطیہ ہوتے ہیں۔ دوسرا مرض جس میں ہندوستان کے مسلمان مبتلا ہیں وہ یہ ہے کہ قوم جذب باہم کے جذبے سے محروم ہے۔ اسی وجہ سے بعض افراد اور گروہ الگ الگ راہ پر گامزن ہیں اور قوم کی اجتماعی سوچوں اور سرگرمیوں میں شریک نہیں ہیں۔ ہم سیاست کے میدان میں وہی کچھ کررہے ہیں جو ہم صدیوں سے مذہب کے میدان میں کرتے چلے آئے ہیں، لیکن مذہبی گروہ بندیوں سے ہمارے اتحاد کو اتنا زیادہ نقصان نہیں پہنچا۔ اس سے کم از کم اتنا تو ظاہر ہوا کہ ہمیں اس اُصول سے جس پر قوم کی تعمیر و ترکیب کا انحصار ہے دلچسپی ہے۔ مزید برآں یہ اُصول اس قدر وسیع ہے کہ کوئی ایک گروہ اس حد تک باغی نہیں ہوا کہ وہ جسد اسلامی سے قطعی طور پر علیحدہ ہو جائے، لیکن ایسے وقت میں جب کہ قوم کے مفاد کی خاطر اتحاد عمل کی ضرورت ہو تو سیاسی عمل میں اختلاف ہلاکت خیز ثابت ہو سکتا ہے۔ پھر ان دونوں امراض کے علاج کی کیا صورت ہے؟ پہلے مرض کا علاج ہمارے ہاتھ میں نہیں ہے۔ جہاں تک دوسرے مرض کا تعلق ہے، میرے خیال میں اس کا علاج ممکن ہے۔ اس موضوع پر میرا مخصوص نقطہ نظر ہے، لیکن میرے خیال میں بہتر ہو گا کہ اس اظہار کو اس وقت تک ملتوی رکھا جائے جب تک ایسی صورت حال پیدا نہ ہو جائے جس کا خطرہ ہے۔ اگر ایسی صورت حال پیدا ہو جائے تو ہر مکتب فکر کے سربرآوردہ مسلمان باہم متحد ہو کر صرف قراردادیں منظور نہ کریں بلکہ حقیقی مقصد کے حصول کے لئے مسلمانوں کا رویہ متعین کریں اور انھیں راستہ دکھائیں۔ اس تقریر میں میں نے اس امر کا تذکرہ محض اس لئے کیا ہے کہ یہ بات آپ کے ذہن میں رہے اور آپ اس دوران میں نہایت سنجیدگی سے اس پر غور کریں۔

مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ہمارے مندوبین کی کامیابی کا اندازہ صرف اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ کانفرنس کے غیر مسلم مندوبین سے قرارداد دہلی کے مطالبات کہاں تک منوا لیتے ہیں۔ اگر یہ مطالبات تسلیم نہیں کیے جاتے تو ہمارے لئے ایک بڑا دوررس نتائج کا حامل مسئلہ پیدا ہو جائے گا۔ اس وقت وہ لمحہ آئے گا جب ہندوستان کے مسلمانوں کو آزادانہ اور باہم متحد ہو کر سیاسی قدم اٹھانا پڑے گا۔ اگر آپ اپنے مقاصد اور نصب العین کے بارے میں واقعی سنجیدہ ہیں تو آپ کو اس قسم کے عمل کے لئے تیار رہنا چاہیے۔ ہمارے سربرآوردہ لوگوں نے سیاسی مسائل پر کافی غور وخوض کیا ہے۔ ان کے غور وفکر سے ہم کسی حد تک ان قوتوں سے آشنا ہوئے ہیں جو ہندوستان اور اس کے باہر اقوام کی قسمتوں کی تشکیل کر رہی ہیں۔ لیکن میں پوچھتا ہوں کہ آیا اس غور وفکر نے ہمیں اس قابل بنا دیا ہے کہ مستقبل قریب میں جو صورت حال پیدا ہو ہم اس کے مقابلے کے لئے تیار ہوں۔ مجھے بلا تکلف کہنے دیجئے کہ اس وقت ہندوستان کے مسلمان دو امراض میں مبتلا ہیں: اوّل، ان میں قحط الرجال ہے۔ سر میلکم ہیلی[۳۳۵] اور لارڈ ارون کی تشخیص

۳۳۵- سر ولیم مالکم ہیلی (۱۸۷۲ء-۱۹۶۲ء) انڈین سول سروس کا ممتاز رکن تھا۔ اس نے ہندوستان کے مختلف علاقوں میں کئی حیثیتوں سے خدمات انجام دیں۔ وہ ۱۸۷۲ء میں انگلستان میں پیدا ہوا۔ اس نے ابتدائی تعلیم مرچنٹ ٹیلرز سکول میں حاصل کی اور ثانوی تعلیم آکسفورڈ یونیورسٹی سے مکمل کی۔ ۱۸۹۲ء میں وہ انڈین سول سروس کے لئے منتخب ہوا اور لازمی تربیت حاصل کرنے کے بعد ۶ر دسمبر ۱۸۹۵ء کو ہندوستان وارد ہوا۔ اس نے اپنی ملازمت کا آغاز صوبہ پنجاب سے کیا اور یہاں اسسٹنٹ کمشنر، سیکرٹری برائے جوڈیشنل کمشنر، سیٹلمنٹ آفیسر اور جہلم نہر کے کولونائزیشن آفیسر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ دسمبر ۱۹۰۵ء میں ہیلی نے ڈپٹی کمشنر کے عہدے پر ترقی پائی۔ ۱۹۰۷ء میں اسے حکومت پنجاب میں سیکرٹری بنا دیا گیا۔ ۱۹۱۱ء میں اسے دہلی کا پہلا چیف کمشنر مقرر کیا گیا۔ نومبر ۱۹۱۸ء میں ان کی خدمات اصلاحات کمیٹی کے سپرد کر دی گئیں۔ دسمبر ۱۹۱۹ء میں اس کو وائسرائے کی انتظامی کونسل میں ممبر فنانس مقرر کر دیا گیا۔ ۱۹۲۴ء میں اسے پنجاب کا گورنر بنایا گیا اور اگلے چار سال تک وہ اسی عہدے پر کام کرتا رہا۔ ۱۹۲۸ء میں اسے یوپی کا گورنر مقرر کیا گیا اور آئندہ چھ سال تک وہ اس عہدے پر فائز رہا۔ ۱۹۳۴ء میں وہ اپنی مدت ملازمت مکمل کر کے برطانیہ لوٹ گیا۔ ہندی سیاست و ثقافت کے گہرے ادراک کی بنا پر اس کو ۱۹۴۱ء میں اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن سٹڈیز کی مجلس عامہ کا صدر مقرر کیا گیا اور وہ سات برس تک یہ فریضہ احسن طریق سے انجام دیتا رہا۔ ۱۹۴۸ء میں اسے پریوی کونسلر مقرر کیا گیا۔ ۱۹۵۶ء میں اسے آرڈر آف میرٹ دیا گیا۔ ہیلی نے ۱۹۶۲ء میں وفات پائی۔ یہاں علامہ اقبال سر مالکم ہیلی کی اس تقریر کی طرف اشارہ کر رہے ہیں جو اس نے یوپی کے گورنر کی حیثیت سے علی گڑھ یونیورسٹی میں کی تھی۔

ہے، وحدت ہے، مسلمانوں کی تاریخ سے میں نے ایک سبق سیکھا ہے کہ آڑے وقتوں میں مسلمانوں کو اسلام نے بچایا ہے، مسلمانوں نے اسلام کی حفاظت نہیں کی۔ اگر آج آپ اپنی نظریں اسلام پر جما دیں اور اس کے زندگی بخش تخیل سے متاثر ہوں تو آپ اپنی پراگندہ قوتوں کو از سر نو جمع کر لیں گے اور اپنی صلابت کردار کو دوبارہ حاصل کر لیں گے۔ اس طرح آپ اپنے آپ کو مکمل تباہی سے بچا لیں گے۔ قرآن مجید کی ایک نہایت معنی خیز آیت[۳۳۶] یہ ہے کہ پوری انسانیت کی موت وحیات بھی فرد واحدہ کی موت وحیات کی طرح ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ آپ جو سب سے پہلے انسانیت کے اس بلند وارفع تصور پر عمل پیرا ہوئے، اسی اُصول پر جئیں اور آگے بڑھیں اور اپنے آپ کو ایک نفس واحد کی طرح رکھیں۔ میں جب یہ کہتا ہوں کہ ہندوستان کی حالت وہ نہیں ہے جو بظاہر نظر آتی ہے تو میرا مقصد کسی کو حیرت میں ڈالنا نہیں ہے۔ بہر حال اس کے صحیح معنی آپ پر اس وقت آشکارا ہو جائیں گے جب آپ ان کے مشاہدے کے لئے ایک صحیح اجتماعی خودی پیدا کر لیں گے۔ قرآن کے الفاظ ہیں: عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ لَا یَضُرُّکُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اھْتَدَیْتُمْ.[۳۳۷]

۳۳۶- یہاں علامہ اقبال سورہ لقمان کی اٹھائیسویں آیت کے ایک حصے کا حوالہ دے رہے ہیں ''مَا خَلْقُکُمْ وَلَا بَعْثُکُمْ اِلَّا کَنَفْسٍ وَّاحِدَۃٍ''۔ اس کا ترجمہ ہے ''تم سب کا پیدا کرنا اور زندہ کرنا بس ایسا ہی ہے جیسا ایک شخص (کا)۔''

۳۳۷- یہ سورہ المائدہ کی ایک سو پانچویں آیت کا حصہ ہے جس کا ترجمہ ہے ''تم پر لازم ہے فکر اپنی جان کا، تمہارا کچھ نہیں بگاڑتا جو کوئی گمراہ ہوا جبکہ تم ہوئے راہ پر''۔

اختتامیہ

حضرات! میری تقریر ختم ہوئی۔ آخیر میں میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ تاریخ ہندوستان کے موجودہ نازک دور میں مسلمانوں کو مکمل تنظیم اور اتحاد عزائم و مقاصد کی ضرورت ہے جو بحیثیت قوم آپ کے اور ہندوستان کے مجموعی مفاد کے لئے ضروری ہے۔ ہندوستان کی سیاسی غلامی پورے ایشیا کے لئے لا متناہی مصائب کا سرچشمہ تھی اور اب بھی ہے۔ اس نے مشرق کی روح کو کچل ڈالا ہے اور اس اظہار ذات کی مسرت سے پوری طرح محروم کر دیا ہے جس کی بدولت کبھی ایک بڑا اور شان دار تمدن پیدا ہوا تھا۔ ہم پر ہندوستان کی طرف سے بھی ایک فرض عائد ہوتا ہے، جہاں جینا اور مرنا ہمارا مقدر ہے۔ ہم پر ایشیا بالخصوص مسلم ایشیا کی طرف سے بھی ایک فرض عائد ہوتا ہے۔ ایک ہی ملک میں سات کروڑ مسلمانوں کی موجودگی تمام مسلم ایشیا کے مسلمانوں کے مقابلے میں اسلام کے لئے ایک قیمتی سرمایہ ہے۔ ہمیں ہندوستان کے مسئلے پر صرف مسلمانوں کے نقطہ نگاہ سے ہی نہیں ہندوستانی مسلمانوں کے نقطہ نگاہ سے بھی دیکھنا چاہیے۔ ایشیا اور ہندوستان کی طرف سے عائد شدہ فرض ہم اس وقت تک وفاداری کے ساتھ ادا نہیں کر سکتے جب تک ہم ایک مخصوص مقصد کے لئے منظم عزم نہ کر لیں۔ اگر آپ ہندوستان کی دوسری سیاسی جماعتوں میں اپنا ایک سیاسی وجود برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو آپ کے لئے اس قسم کا بندوبست قطعی ضروری ہے۔ ہماری منتشر حالت کے باعث ایسے سیاسی مصالح الجھ گئے ہیں جو کہ ہماری ملی زندگی کے لئے ناگزیر ہیں۔ میں فرقہ وارانہ تصفیے سے مایوس نہیں ہوں، لیکن میں اپنا یہ احساس آپ سے پوشیدہ نہیں رکھ سکتا کہ موجودہ بحران سے نبٹنے کے لئے ہماری ملت کو مستقبل قریب میں ایک آزادانہ راہ عمل اختیار کرنی پڑے گی اور آزادانہ سیاسی راہ عمل ایسے نازک وقت میں صرف ان لوگوں کے لئے ہی ممکن ہے جو عزم کے مالک ہوں اور جن کی قوت ارادی ایک مقصد پر مرکوز ہو۔ کیا آپ کے لیے یہ ممکن ہے کہ متحدہ عزم کے لئے منظم کاملیت حاصل کر لیں؟ بے شک یہ ممکن ہے۔ فرقہ بندی اور نفسانیت کی قیود سے آزاد ہو جایئے۔ اپنے انفرادی اور اجتماعی اعمال کی قدر و قیمت کا اندازہ کیجئے خواہ وہ مادی اغراض ہی سے متعلق کیوں نہ ہوں۔ اس نصب العین کی روشنی میں، جس کی آپ نمائندگی کر رہے ہیں، مادہ سے گزر کر روحانیت کی طرف آیئے۔ مادہ کثرت ہے۔ روح نور ہے، حیات

دستاویزات

۳۰۴- دین الٰہی سے مراد وہ مذہبی عقیدہ ہے جس کو ہندوستان میں تیسرے مغل بادشاہ اکبر نے اپنی سرپرستی میں رائج کیا۔ یہ بنیادی طور پر ایک اخلاقی اور اصلاحی نظام فکر تھا جس کی تشکیل و ترتیب میں مختلف مذاہب اور فلسفیانہ نظاموں سے مدد لی گئی تھی جن میں ہندومت کا عقیدہ اہنسا، کیتھولک عیسائیوں کی تجرد پسندی اور ہندو، زرتشی اور مسلم صوفیانہ علامتیں نمایاں تھیں۔ دین الٰہی کے پیروکاروں پر لازم تھا کہ مختلف معاشرتی برائیوں مثلاً نفس پرستی، غبن، فریب، غیبت، جبر و تشدد، تعدی اور تکبر سے اجتناب کریں۔ اس کے علاوہ انھیں کشادہ نظری، راست گوئی، حلم، سادگی، پرہیزگاری، تقویٰ، زہد، اور شفقت کی ترغیب دی جاتی تھی۔ دین الٰہی کا مرکزی خیال بادشاہ کی ذات سے اندھی عقیدت اور اس پر جاں نثاری تھی۔ اس کی مختلف رسوم کے پیش نظر بادشاہ کو خدا کے درجہ پر فائز کر دیا گیا تھا چنانچہ اس کے پیروکار آپس میں ملاقات کے وقت 'اللہ اکبر' اور 'جل جلالہٗ' کہہ کر سلام کرتے تھے۔ دین اسلام سے مجازی و تقلیدی علیحدگی کے اعلان کے ساتھ دین الٰہی کے پیروکاروں کو نئے کلمہ 'لا الٰہ الا اللہ' اکبر خلیفہ اللہ کا اقرار کرنا ہوتا۔ بادشاہ کی طرف سے انھیں زنار اور انگوٹھی جس پر اللہ اکبر کندہ ہوتا اور شجرہ کے طور پر بادشاہ کی تصویر دی جاتی جس کو دین الٰہی کے پیروکار مرصع غلاف میں رکھ کر دستار میں لگاتے تھے۔ دین الٰہی کی دوسری رسومات بھی ان مل بے جوڑ تھیں جن میں مختلف ادیان کا رنگ غالب تھا۔ اکبر نے دین الٰہی کی ترویج میں تو زیادہ دلچسپی نہ لی مگر شریعت اسلامیہ کی مخالفت پر کمر باندھ لی۔ وہ نہ صرف واضح قرآنی احکامات کا منکر ہو گیا بلکہ مسلمہ اسلامی عقائد مثلاً وحی، حیات بعد الموت اور روز جزا کی تکذیب کرنے لگا۔ صوم و صلوٰۃ اور مناسک حج کی ادائیگی کی حوصلہ شکنی کی جانے لگی اور اسلامی کیلنڈر کی بجائے ایک نئی تقویم موسوم بہ 'ماہ و سال' رائج کی گئی۔ اس کے ساتھ ساتھ شراب نوشی، حرام گوشت خوری، سود، اور جوئے کا اذن عام مل گیا۔ مزید برآں کئی ہندوانہ رسوم مثلاً آفتاب پرستی اور مسئلہ تناسخ کو شاہی سرپرستی حاصل ہوئی اور دربار میں حاضری کے وقت سجدہ تعظیمی پر زور دیا جانے لگا۔ اکبر کی اس اسلام دشمنی کے سبب ہندوؤں نے بھی علی الاعلان شعائر اسلام کی بے حرمتی کو اپنا معمول بنا لیا۔ وہ خود تو 'صلح کل' کی آڑ میں رمضان کا احترام نہ کرتے مگر جب ہندو تہواروں پر برت رکھا جاتا تو مسلمانوں کو خورد و نوش سے روکا جاتا۔ بعض مقامات پر گاؤ کشی کے مسئلے پر کئی مسلمانوں کی جان لے لی گئی اور کچھ جگہوں پر مساجد کو شہید کر کے مندروں میں بدل دیا گیا۔ اس بے راہ روی نے ملک میں لادینیت کی ایک نئی روش کو جنم دیا جس نے ہندوستانی معاشرے میں اسلامی برتری کو شدید ضعف پہنچایا۔ ہر چند حضرت شیخ احمد سرہندی اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی مخلصانہ کوششوں کی بدولت عوام الناس اس گمراہی سے دور رہے مگر حکومتی رویوں نے ان کے احساس برتری اور نفسیاتی بالادستی کو کافی مجروح کیا۔ اکبر کی تمام تر سرپرستی کے باوجود اس کے عہد میں دین الٰہی کے پیروکاروں کی تعداد انیس سے زیادہ نہ ہو سکی۔ ۱۰۰۱ھ میں شیخ مبارک اور ۱۰۰۴ھ میں فیضی کے انتقال کے بعد دین الٰہی کی نشر و اشاعت میں تعطل پیدا ہو گیا۔ جب ۱۰۰۷ھ میں ابوالفضل کو دکن پر لشکر کشی کے لئے بھیجا گیا تو دربار میں اس کے پرچاروں کی تعداد مزید کم ہو گئی۔ انجام کار اکبر کی ۱۶۰۵ء میں وفات کے ساتھ اس کا خود ساختہ دین بھی اپنی موت آپ مر گیا۔ یہاں علامہ اقبال ہندوستان میں دین الٰہی کے پرچار میں ناکامی کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔

آل انڈیا مسلم لیگ

کے سالانہ اجلاس ۱۹۳۰ء سے متعلق

علامہ اقبال کی خط و کتابت

۱- مولوی محمد یعقوب کے نام علامہ اقبال کا خط، یکم اگست ۱۹۳۰ء*

مولوی محمد یعقوب کے نام ڈاکٹر سر محمد اقبال کے ٹی، ایم ایل سی خط مورخہ یکم اگست ۱۹۳۰ء کی نقل

آپ کے خط کا شکریہ جو مجھے چند دن پہلے موصول ہوا۔

ابھی تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ آیا لکھنؤ میں کوئی مجلس استقبالیہ بھی بن گئی ہے یا نہیں۔ ہمیں ابھی تک اس کی بابت کوئی اطلاع نہیں دی گئی اور لوگ ہر طرح کے استفسارات کر رہے ہیں۔ میں مزید سنتا ہوں کہ کانگریسی لوگ قوم پرست مسلمانوں کے ذریعے لیگ کے آنے والے اجلاس پر قبضہ کرنے کی سازشوں میں مصروف ہیں۔ یہ ہندوستان کے مسلمانوں کے بہترین مفاد میں ہے کہ جہاں تک ممکن ہو، لیگ کا یہ اجلاس پرامن رکھا جائے۔ ہندو پریس نے پہلے ہی یہ پروپیگنڈا شروع کر دیا ہے کہ مسلمان قوم پرست گروہ مسلمانوں میں سب سے زیادہ مقبول ہے۔ کسی بھی ممکنہ گڑبڑ کے پیش نظر ہر ممکن احتیاط بروئے کار لائی جائے، جو اِن عناصر کی طرف سے سوچی گئی ہو، جو، مجھے بتایا گیا ہے کہ آنے والے اجلاس کو درہم برہم کرنے کے منصوبے بنا رہے ہیں۔ اگر ضرورت ہو تو اجلاس کا مقام ہی تبدیل کر دیا جائے۔ اگر مندرجہ بالا خدشے کا موہوم سا امکان بھی ہو تو دہلی موزوں جگہ رہے گی۔ جلسے کو ۱۶ / یا ۱۷ / اگست کو منعقد کرنے کی بجائے ہم اسے ستمبر کے اوائل یا درمیان میں بھی منعقد کر سکتے ہیں۔ موسم بھی اس وقت تک پہلے سے کچھ بہتر ہو جائے گا اور میرے خیال میں پنجاب بھی ایک زیادہ طاقتور وفد بھیجنے پر قادر ہو جائے گا۔ براہ کرم مجھے یہ بھی بتایئے کہ خطبے کے کتنے نسخے چھپوائے جائیں۔ میں صرف ۵۰۰ نسخے چھپوانے کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ بے شک اگر لیگ چاہے تو وہ مزید نسخے بھی چھپوا سکتی ہے۔ امید ہے کہ آپ مع الخیر ہوں گے۔

[محمد اقبال]

---

* اے-ایف-ایم-جلد ۱۵۳، ص ۳۱

23

Copy of a letter from Doctor Sir Muhammad Iqbal, Kt., M.L.C dated the 1st August, 1930, to Maulvi Muhammad Yakub.

Thanks for your letter which I received a few days ago.

It is not yet known whether any Reception Committee has been formed at Lucknow. We have received no notice up to the present moment and people are making all sorts of inquiries. I further hear that the Congress People are busy intriging in order to capture the coming meeting of the League through Muslim Nationalists. It is in the highest interests of the Muslims of India that this meeting of the League should be as peaceful as possible. The Hindu Press has already begun the propaganda that the Nationalist Muslim Party in the most popular among Muslims. Every possible precaution should be taken against any possible disturbance that may have been comtemplated by those who, I am told, are making secret plans to upset the coming meeting. It need be even the venue of the meeting may be changed. Delhi would be much more suitable if there is even the slightest possibility of the kind mentioned above. Instead of holding the meeting on the 16th or 17th we can hold it in the begining or the middle of September. The weather will improve a bit by that time and the Punjab will, I think, be able to send a more powerful contingent. Please also let me know how many copies of the address should be printed. I am thinking of printing only 500 copies. The League can, of course, print more if they so desire.

Hoping you are well.

۲- مولوی محمد یعقوب کے نام علامہ اقبال کا خط، ۴ر اگست ۱۹۳۰ء*

Dr.Sir Muhammad Iqbal
M.L.C
Barrister-at-Law.

Lahore
...............19

۴ر اگست ۱۹۳۰ء

مائی ڈیر مولوی صاحب،

آپ کے خط کا شکریہ جو مجھے کل موصول ہوا۔ لکھنو سے بھی ایک خط ابھی آیا ہے جس میں لیگ کے اسسٹنٹ سکریٹری مسٹر شمس الحسن نے مجھے اطلاع دی ہے کہ استقبالیہ کمیٹی ہونے والے اجلاس کے لیے ضروری تیاریاں کر رہی ہے۔ انھوں نے مزید لکھا ہے کہ اس خبر میں بھی کچھ سچائی ہے جو میں اپنے پچھلے خط میں آپ کو لکھ چکا ہوں۔ سابقہ خط میں مذکورہ وجوہات کی بنا پر یہ مناسب ہوگا کہ اجلاس اکتوبر تک یعنی انتخابات کے مکمل ہونے تک ملتوی کر دیا جائے۔ اگر دلی مناسب جگہ نہ ہو تو ہم یہ اجلاس لاہور میں منعقد کر سکتے ہیں بشرطیکہ مسٹر فیروز خاں [نون] اور دوسرے حضرات اس معاملہ میں دلچسپی لیں۔ میرا خیال ہے کہ اس سے کچھ فرق نہیں پڑے گا اگر گول میز کانفرنس کے لیے ہمارے نمائندے اکتوبر کے پہلے ہفتہ میں لندن کے لیے روانہ ہو رہے ہیں۔ وہ اجلاس میں شامل نہ ہوں۔ ہماری قراردادیں ان کو بذریعہ تار بھیجی جا سکتی ہیں۔ مزید برآں یہ بھی ممکن ہے کہ گول میز کانفرنس ایک ہفتہ سے زائد کے لیے ملتوی ہو جائے۔ میں نے حال میں اس طرح کی چند افوائیں سنی ہیں لیکن آپ بہتر جانتے ہیں۔

آپ کا مخلص
محمد اقبال

* اے-ایف-ایم-جلد ۱۵۳، ص ۳۳

DR. SIR MUHAMMAD IQBAL, M.L.C.
BARRISTER-AT-LAW.

LAHORE.

.........................19

4th Aug. 1930

My dear Nairang Sahib,

Thanks for your letter which I recd. yesterday. I recd. a letter from Lucknow a moment ago. Mr. Shamsul Hasan Asst. Sec. of the League informs me that the Reception Committee is making necessary preparations for the coming session. He further informs that there is some truth in the information that I gave you in my last letter. For reasons mentioned in my last letter it is advisable to postpone the session till October, i.e., till after the elections are over. If Delhi is not suitable we may have the session at Lahore in case Mr. Feroz Khan & others take interest in the matter. I think it does not matter if our representatives on the R.T.C. have to start for London in the first week of Oct. They may not join the session. Our resolutions can be wired to them. Moreover it is possible that R.T.C. may be postponed for more than a week. I heard some such rumour the other day. But you know better.

Yours sincerely
Muhammad Iqbal

۳- مولوی محمد یعقوب کے نام علامہ اقبال کا خط،۴/اگست ۱۹۳۰ء*

Dr.Sir MuhammadIqbal		Lahore
M.L.C
Barrister-at-Law.		19

لاہور،۴/اگست ۱۹۳۰ء

جناب من! السلام علیکم

آپ کا والا نامہ مل گیا ہے۔ جن حضرات کے ناموں کی فہرست آپ نے ارسال فرمائی ہے ان کے نام علیحدہ علیحدہ تاکید[ی] خطوط لیگ کے دفتر کی طرف سے جانے چاہییے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین، سیکرٹری پراونشل مسلم لیگ، لاہور کے نام بھی تاکیدی خط لکھیے تا کہ لاہور سے بہت سے حضرات شریک اجلاس ہوں۔ ابھی تک یہ معلوم نہیں ہوا کہ باہر سے جانے والے لوگوں کے قیام کا کیا بندوبست لکھنؤ میں ہوگا۔ بہت سے لوگوں نے مجھ سے استفسار کیا ہے۔ ان تمام امور کے متعلق اطلاع مفصل شائع ہونا ضروری ہے۔ مہربانی کر کے ممبران استقبالیہ کمیٹی کی خدمت میں میری طرف سے عرض کیجیے کہ کسی قسم کے استقبال کی تیاری نہ کی جائے۔ میں اپنے پرانے دوست مسٹر محمد وسیم بیرسٹر کے ہاں قیام کروں گا۔ چونکہ مجھے استقبال کا اندیشہ تھا اس واسطے میں نے ان کو لکھا ہے کہ میرے لکھنؤ پہنچنے کے وقت سے کسی کو بھی آگاہ نہ کریں اور اسی شرط پر میں نے ان کے ہاں ٹھہرنا اور ان کا مہمان ہونا قبول کیا ہے۔ خطبہ صدارت قریباً تیار ہے۔ ایک ہزار کی تعداد میں چھپے گا۔ اردو ترجمہ کرنا اور اسے رسالے کی صورت میں شائع کرنا میرے بس کا کام نہیں۔ غالباً مدیر انقلاب اپنے اخبار کے لیے ترجمہ کریں گے جو اخبار ہی میں شائع ہوگا۔ اگر مسلم لیگ اردو ترجمہ شائع کرے، تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ فقط

مخلص

محمد اقبال

---

* اے-ایف-ایم-جلد ۱۵۳،ص ۳۴

26

DR. SIR MUHAMMAD IQBAL, M.L.C.
BARRISTER-AT-LAW.

LAHORE.
..................................19

لاہور ۔ ۱۴ر اگست ۳۰ء

جناب من ۔ السلام علیکم

آپ کا والا نامہ مل گیا ہے ۔ جن حضرات کے ناموں کی فہرست آپ نے ارسال فرمائی ہے ان کو تمام مطبوعہ
تاکیدی خطوط لکھ دیے گئے ہیں ۔ [illegible] اس سلسلہ میں ڈاکٹر [illegible] شاہ الہ آبادی سکرٹری ہیں اور مسلم لیگ لاہور
کے نام بھی تاکید خط لکھ دیا ہے کہ لاہور سے تمام حضرات شرکت کی امید رکھیں ۔ افسوس کہ یہ معلوم نہیں ہوا کہ باہر سے جانے والے
لوگوں کے قیام کا کیا بندوبست فکر میں ہوگا ۔ تمام لوگوں نے مجھ سے استفسار کیا ہے ۔ ان تمام امور کے متعلق اطلاع نہ ملنے کا
ہونا ضروری ہے ۔ بہرحال [illegible] ان اشتہارات کی دو نقلیں ارسال کیجیے جن میں یہ کہا ہو کہ استقبال کی تیاری نہ
کی جائے ۔ میرا یہ پرانے دوستوں سے مشورہ بھی ہے کہ میں وہاں قیام کروں گا ۔ چونکہ مجھے استقبال کا اندیشہ تھا
اس واسطے میں نے ان کو لکھا ہے کہ میرے پہنچنے کا وقت کسی کو معلوم نہ ہو اور نہ کریں اور اسی شرط پر میں نے الہ آباد
اور الٰہ آباد آنا قبول کیا ہے ۔ خطبہ صدارت تیار ہو رہا ہے ایک ہزار کی تعداد میں چھپے گا ۔ اردو ترجمہ کرا
اور [illegible] رسالہ کی صورت میں شائع کرنا مناسب [illegible] ہے ۔ [illegible] مدیر انقلاب نے اخبار کے لیے خطبہ کا مسودہ مانگا ہے جو
انقلاب میں شائع ہوگا ۔ اگر مسلم لیگ اردو ترجمہ شائع کرے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے ۔

مخلص محمد اقبال

۴- مولوی محمد یعقوب کے نام علامہ اقبال کا خط، ۹/اگست ۱۹۳۰ء*

Dr.Sir MuhammadIqbal M.L.C. Barrister-at-Law. Lahore 19

لاہور، ۹/اگست ۳۰ء

جناب من، السلام علیکم

آپ کا خط ابھی ملا ہے۔ استقبالیہ کمیٹی نے جو فیصلے کیے ہوں، آپ کو لازم ہے کہ ان کو صوبہ پنجاب اور دیگر صوبوں کے اخباروں میں شائع کریں تا کہ لوگوں کو ضروری اطلاعات مل جائیں۔ امید ہے کہ پنجاب سے خاصی تعداد میں لوگ آئیں گے۔ یہ بھی تحریر فرمایئے کہ لیگ کا اجلاس ۱۶/اگست کے روز کس وقت شروع ہوگا۔

ایڈریس کے اردو ترجمہ کے لیے اب نہ ہمت باقی ہے نہ وقت۔ کل ختم ہوگا اور دو تین روز میں طبع ہوگا۔ فقط

محمد اقبال

* اے-ایف-ایم-جلد ۱۵۳، ص ۱۷

DR. SIR MUHAMMAD IQBAL, M.L.C.

BARRISTER-AT-LAW.

LAHORE.

لاہور ۹ اگست ۳۰ء

جناب من — السلام علیکم

آپ کا خط ابھی ملا ہے — اشتہار کی کاپیاں جو بھیجی گئی ہیں آپ کو لازم ہے کہ ان کو صوبہ پنجاب اور دیگر صوبوں کے اخباروں میں شائع کرا دیں تاکہ لوگوں کو فوری اطلاعات مل جائیں — امید ہے کہ پنجاب سے کافی تعداد میں لوگ آ جائیں گے۔ یہ بھی تحریر فرمائیے کہ لیگ کا اجلاس ۲۹ اگست کو کس وقت شروع ہوگا — ایڈریس کا اردو ترجمہ کرنے کے لئے اب نہ بہت باقی ہے نہ وقت — کل ختم ہو گا اور دو تین روز میں طبع ہو گا۔ والسلام

محمد اقبال

۵- سیّد شمس الحسن کے نام علامہ اقبال کا تار، ۱۱/اگست ۱۹۳۰ء*

۱۱-۸-۱۹۳۰ء

لاہور

شمس الحسن

معرفت مولوی احتشام الدین [منشی احتشام علی]

خیالی گنج لکھنو

اگر لیگ کا اجلاس ملتوی ہو گیا ہے تو مجھے بذریعہ تار اطلاع کریں۔

محمد اقبال

* اے-ایف-ایم-جلد ۱۵۴، ص ۷

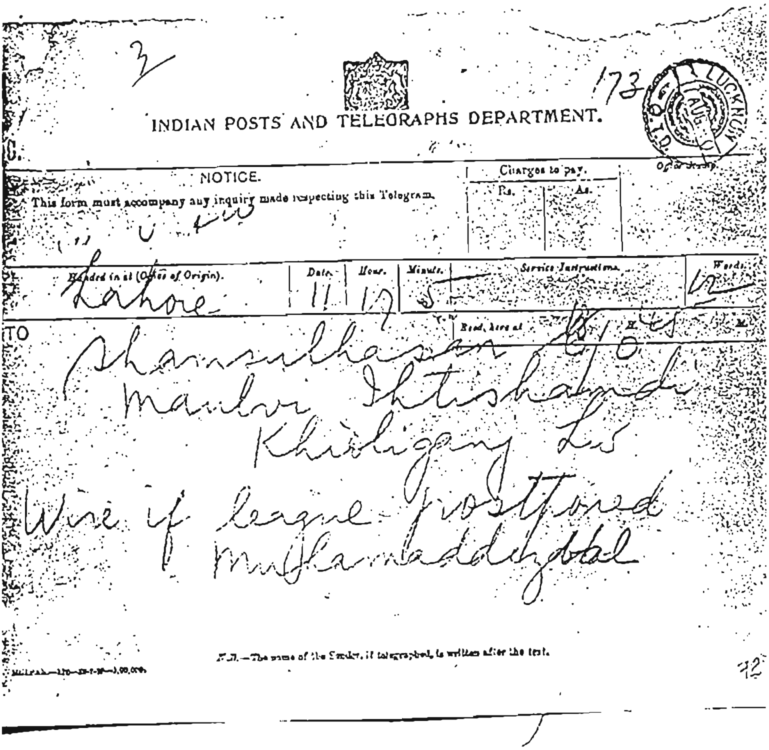

3

173

INDIAN POSTS AND TELEGRAPHS DEPARTMENT.

LUCKNOW

NOTICE.

This form must accompany any inquiry made respecting this Telegram.

Charges to pay.	
Rs.	As.

Handed in at (Office of Origin).	Date.	Hour.	Minute.	Service Instructions.	Words.
Lahore	11	17	5		12

Recd. here at

TO Shamsulhasan C/o Maulvi Ihtishamud[illegible] Khiyaliganj Lucknow

Wire if league postponed

Muhammadiqbal

N.B.—The name of the Sender, if telegraphed, is written after the text.

42

۶- سید شمس الحسن کے نام علامہ اقبال کا خط، ۲۹ راگست ۱۹۳۰ء*

Dr.Sir MuhammadIqbal M.L.C. Barrister-at-Law. Lahore 19

جناب شمس الحسن صاحب! السلام علیکم

آپ کا خط مجھے مل گیا تھا۔ لیگ کے آئندہ اجلاس کے متعلق آپ نے کچھ نہیں لکھا۔ اس بارے میں آپ مہربانی کر کے مجھے اطلاع دیں کہ ملتوی شدہ اجلاس کب ہوگا اور کہاں تاکہ اگر اجلاس ہو تو میں ایڈریس میں، جو اس وقت پروف شیٹ کی صورت میں ہے، ضروری ترمیم کرسکوں۔ فقط

محمد اقبال

لاہور،

۲۹ راگست ۳۰[۱۹]ء

* اے-ایف-ایم- جلد ۱۵۴، ص ۱۷

DR. SIR MUHAMMAD IQBAL, M.L.C.
BARRISTER-AT-LAW.

13

مائی ڈیر شمس الحسن صاحب السلام علیکم

آپ کا خط مجھے مل گیا تھا۔ لیکن آئندہ اجلاس کے متعلق جو نوٹس ہے وہ ہنوز نہیں ملا
اس بارے میں آپ سے استفسار کرتا ہوں۔ ابھی اطلاع دیں کہ ملتوی شدہ اجلاس کب ہوگا
اور کہاں ہوتا ہے۔ اس اجلاس سے قبل میں ایڈریس میں اس وقت جو حالات ہو رہے ہیں ان کی
صورت میں جو ضروری ترمیم کر سکوں۔

محمد اقبال لاہور ۲۶ اگست ۳۲ء

۷- سید شمس الحسن کے نام علامہ اقبال کا خط، یکم ستمبر ۱۹۳۰*

Dr.Sir MuhammadIqbal Lahore
M.L.C.
Barrister-at-Law. 19

لاہور، یکم ستمبر ۳۰[۱۹]ء

ضروری

جناب شمس الحسن صاحب- السلام علیکم

آپ کا خط ابھی ملا ہے۔ پراونشل لیگ کے متعلق جو خط و کتابت ضروری ہو، وہ خلیفہ شجاع الدین صاحب بیرسٹر ایٹ لا، لاہور سے ہونی چاہیے۔ فارم ممبری وغیرہ انھیں کے نام ارسال فرمایئے۔ ضروری اطلاعات وہی صاحب دیں گے۔ دیگر عرض یہ ہے کہ آئندہ اجلاس جہاں بھی ہو، ۷، ۸/اکتوبر میرے لیے موزوں نہیں۔ انتخابات کا ہنگامہ پنجاب میں تو ۲۲/ستمبر تک ختم ہو جائے گا، اور مقامات کا حال مجھے معلوم نہیں۔ اکثر مقامات سے لوگ بلا مقابلہ منتخب ہو گئے ہیں۔ اس واسطے میری رائے میں آئندہ اجلاس ۲۸، ۲۹/ستمبر کو ہونا چاہیے۔ ۲۸/ستمبر کو آخری ہفتہ اور ۲۹ کو اتوار ہے۔ اجلاس میں جانے والوں کے لیے سہولت ہوگی۔ یہاں کی ہائی کورٹ اکتوبر کے پہلے ہفتے میں کھل جائے گی، یعنی ۷/اکتوبر سے۔ فقط

مخلص

محمد اقبال

* اے-ایف-ایم-جلد ۱۵۴، ص ۲۰

DR. SIR MUHAMMAD IQBAL,
M.L.C.
BARRISTER-AT-LAW.

LAHORE.
.................................19

۱۵

لاہور ۱۹ ستمبر ۳۰ء

[illegible]

جناب شمس الحسن صاحب السلام علیکم

آپ کا خط ابھی ملا ہے ۔ ہر دو رسائل کہ جن کی نسبت جو خطوط کی بابت ضروری ہو وہ خلیفہ شجاع الدین کو بھیج دیں ۔ پرائیویٹ سیکرٹری سے ہو چلا ہے ۔ فارم ممبری وغیرہ ابھی ارسال فرمائیے ۔ فرمائیے اجلاس کا ۲۷ و ۲۸ اکتوبر کے لئے رکھیے ۔ دیگر ضرورت ہے کہ آئندہ اجلاس کی بابت [illegible] مشورہ فرمائیں ۔ انتخابات کا ہنگامہ پنجاب میں ۲۲ ستمبر تک ختم ہو جائے گا اور ... کا حال مجھے معلوم نہیں ۔ اگر انتخابات کے لوگ بلا مقابلہ منتخب ہو گئے ہیں تو ... اس واسطے میری رائے میں آئندہ اجلاس ۲۸ و ۲۹ ستمبر کو ہونا چاہیے ۔ ۲۸ ستمبر کو آخری ہفتہ ہے اور ۲۹ کو اتوار ہے اجلاس میں جانے والوں کے لئے سہولت ہو گی ۔ یہاں سے ہائی کورٹ اکتوبر کے پہلے ہفتہ میں کھل جائے گی پہلے ہفتہ اکتوبر سے ۔

مخلص محمد اقبال

۸- سیّد شمس الحسن کے نام علامہ اقبال کا خط، ۸ر ستمبر ۱۹۳۰ء*

Lahore

Dr. Sir Muhammad Iqbal,
M.L.C.
Barrister-at-Law.

..................19

8th Sep[tember],1930

ڈیر سید شمس الحسن صاحب

السلام علیکم

اجلاس لیگ کی تاریخ سے آپ نے اب تک کوئی اطلاع نہیں دی۔ تاریخ جلد مقرر ہونی چاہیے تاکہ اخباروں کو پروپوگنڈا کرنے کے لیے وقت مل جائے۔ مجھ کو آج بمبئی سے ابراہیم رحمت اللہ صاحب کا خط آیا تھا کہ مسلم ڈیلی گیشن کے ساتھ انگلستان جاوں، میں نے وہاں جانے سے انکار کر دیا ہے۔ من جملہ دیگر وجوہ کے ایک وجہ یہ بھی ہے [کہ] لیگ کا اجلاس قریب ہے۔ ان کا ڈیلی گیشن ۴ر اکتوبر کو بمبئی سے روانہ ہوگا۔ فقط

محمد اقبال

لاہور

---

* اے- ایف- ایم- جلد ۴ ۱۵، ص ۲۱

DR. SIR MUHAMMAD IQBAL, M.L.C.
BARRISTER-AT-LAW.

LAHORE.
..............................19

۱۷

8th جولائی ۱۹۳۰

ڈیر سید شمس الحسن صاحب السلام علیکم

اسلامی لیگ دفتر والوں سے آپ نے اب تک کوئی اطلاع نہیں دی — نتیجہ جلد مشتہر ہو جانا چاہیے تاکہ اخباروں کو پروپیگنڈا کرنے کے لیے وقت مل جائے — ممکن ہے کہ بمبئی سے [illegible] خلاف رہا تھا تمام مسلم [illegible] انگلستان جانے [illegible] انکار کر رہا ہے کیونکہ دیگر وجوہ کے علاوہ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ لیگ کا اجلاس قریب ہے — [illegible] روانہ ہوگا —

والسلام

محمد اقبال لاہور

۹- سیّد شمس الحسن کے نام علامہ اقبال کا خط، ۲۹ ر ستمبر ۱۹۳۰ء*۔

Dr.Sir Muhammad Iqbal Lahore
M.L.C.
Barrister-at-Law. 19

لاہور، ۲۹ ر ستمبر ۳۰ء

جناب من! السلام علیکم

آپ کا خط ابھی ملا ہے۔ میں کیا عرض کروں۔ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ لیگ کا اجلاس آل انڈیا مسلم کانفرنس سے پہلے ہونا چاہیے۔ یہ بہت ضروری امر ہے اور اس حقیقت کو فراموش کردینا میرے نزدیک سخت غلطی ہے**۔ باقی رہا کونسل کا اجلاس، سو میرے نزدیک جگہ اور وقت سیشن کے تعین کے لیے کونسل کا اجلاس کرنا وقت کا ضائع کرنا ہے۔ اجلاس لیگ لکھنؤ میں ہونا چاہیے اور وقت تاریخ ۱۸ ر اکتوبر۔ اگر کونسل کا اجلاس قواعد کی رو سے ضروری ہے تو بہتر ہے، جہاں آپ چاہیں کرلیں، مگر مجھے امید نہیں کہ لوگ پہلے کونسل کے اجلاس کے لیے دہلی یا لاہور میں جائیں، اس کے علاوہ آل انڈیا مسلم کانفرنس کے آئندہ اجلاس کے لیے ۶ ر اکتوبر کو لکھنؤ جائیں (راجہ سلیم پور کے خطوط اس مضمون کے جاری ہوئے ہیں) اور پھر کانفرنس اور لیگ کے اجلاسوں کے لیے لکھنؤ یا کسی اور مقام کا سفر کریں۔ علاوہ اس کے پنجاب کونسل کا اجلاس ممکن ہے ۱۲ ر اکتوبر کے قریب ہو۔ پنجاب سے لوگ کونسل لیگ کے اجلاس کے لیے نہ آسکیں گے۔ ملک فیروز خاں صاحب کی رائے بھی یہی ہے کہ کونسل لیگ کا اجلاس کرنا ضروری نہیں ہے۔ زیادہ کیا عرض کروں۔ فقط

محمد اقبال لاہور

* اے-ایف-ایم۔ جلد ۱۵۴، ص ۲۳

** تاکید منجانب علامہ اقبال

DR. SIR MUHAMMAD IQBAL, M.L.C.
BARRISTER-AT-LAW.

LAHORE.
..............................19

۱۶

لاہور ۲۹ ستمبر ۳۰ء

جناب من — تسلیم۔

آپ کا خط ابھی ملا ہے — میں یہ عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ لیگ کا اجلاس
آل انڈیا مسلم کانفرنس سے پہلے ہونا چاہیے — یہ بات ضروری امر ہے اور اس حقیقت کو
فراموش کر دینا میرے نزدیک سخت غلطی ہے — باقی رہا کونسل کا اجلاس سو میرے نزدیک جلد
اور وقت مقررہ پر کمیٹی کا ... کہ کونسل کا اجلاس کرنا وقت ضائع کرنا ہے — انتخاب کی نسبت ہی ہو
ہو جاتا ہے اور ... ۱۸ اکتوبر — اگر کونسل کا اجلاس قواعد کی رو سے ضروری ہے
تو بہتر ہے جیسا آپ چاہیں کر لیں — مگر مجھے اندیشہ ہے لوگ پہلے کونسل کا اجلاس ہونے
دہلی یا لاہور میں جائیں اس کے علاوہ آل انڈیا مسلم کانفرنس کی کونسل کا اجلاس ہونے کو ہے ۲ اکتوبر کو
لکھنؤ میں (مولانا شوکت علی اور دیگر حضرات نے اس مضمون کے خطوط جاری کیے ہیں) اور پھر کانفرنس اور لیگ کے
اجلاس ہوں گے ... اور مقام کا انتظام کریں — علاوہ اس کے ہمارے کونسل کے اجلاس میں
۱۲ اکتوبر ... سے لوگ کونسل کا اجلاس ہونے نہ دیں گے — ...
رائے یہی ہے کہ کونسل کا اجلاس ... زیادہ کیا عرض کروں —

محمد اقبال لاہور

۱۰- سیّد شمس الحسن کے نام علامہ اقبال کا پوسٹ کارڈ، ۳۰/۳ اکتوبر ۱۹۳۰ء *

جناب شمس الحسن صاحب

اگر لیگ کونسل کا اجلاس کرنے کا فیصلہ ہو چکا ہے تو مہربانی کر کے مطلع فرمائیے کہ اجلاس کہاں ہوگا اور کون سی تاریخ کو۔ آپ کی طرف سے کوئی اطلاع اخبارات میں شائع نہیں ہوئی۔ لوگ مجھ سے دریافت کر رہے ہیں۔ فقط

مخلص

محمد اقبال

۳/اکتوبر ۳۰[۱۹]

لاہور

* اے-ایف-ایم-جلد ۱۵۴، ص ۲۴

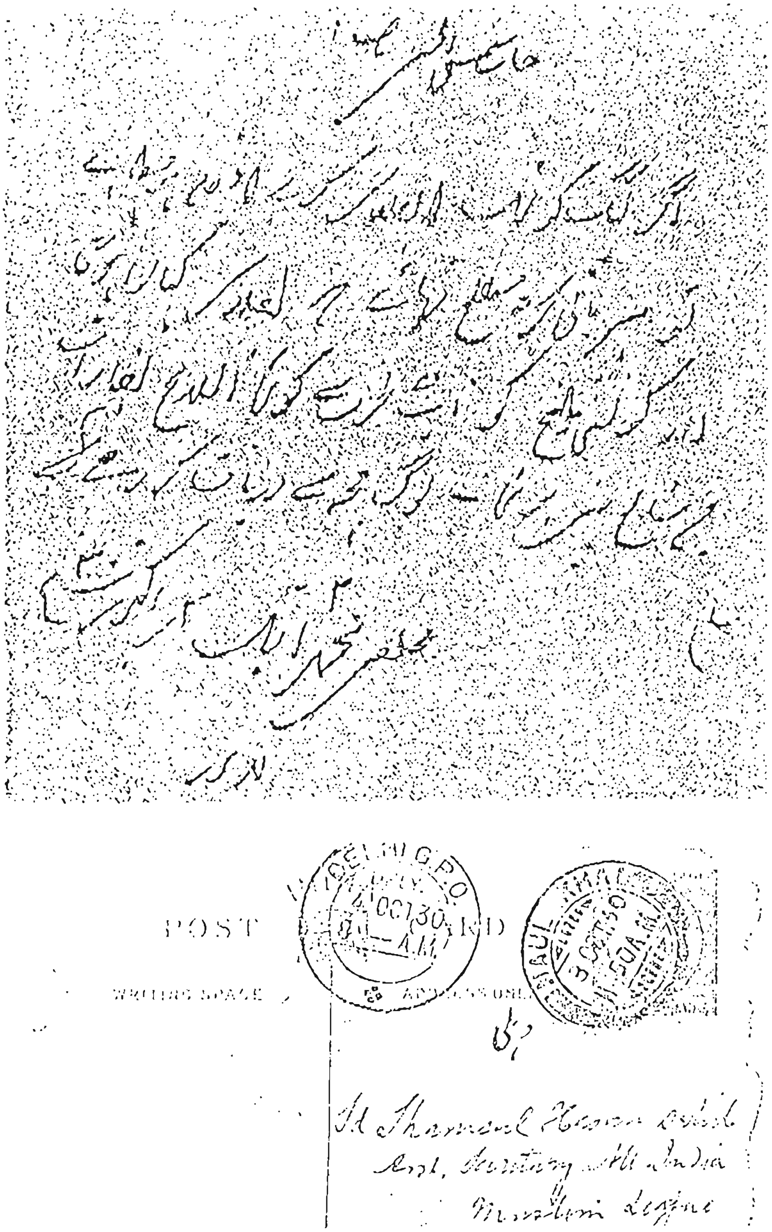
POST CARD
WRITING SPACE
ADDRESS ONLY
DELHI G.P.O.
دہلی
M. Shamsul Hasan
Asst. Secretary All India
Muslim League

۱۱۔ مولوی محمد یعقوب کے نام علامہ اقبال کا خط، ۲۴ر اکتوبر ۱۹۳۰*

Dr.Sir Muhammad Iqbal
M.L.C.
Barrister-at-Law.

Lahore
..................19

لاہور ۲۴ر اکتوبر ۳۰[۱۹]ء

جناب من- السلام علیکم

مسٹر جناح کا خط پرسوں آیا تھا کہ کونسل کی میٹنگ طلب کی جائے اور اجلاس لیگ کی تاریخ اور جگہ کا فیصلہ کیا جائے۔ میں نے ان کو جواب میں لکھا ہے کہ اجلاس کا لکھنؤ ہی میں ہونا بہتر ہے کیونکہ کسی اور مقام کے انتخاب میں دقت ہوگی اور وہاں کے لوگ اس بات کا تقاضا کریں گے کہ لیگ کے اجلاس کو کامیاب بنانے کے لیے چندہ کرنے کے واسطے مزید وقت کی ضرورت ہے۔ لکھنؤ میں اجلاس کی تیاری ہوچکی ہے، اس واسطے موزوں یہی ہے کہ اجلاس وہاں کیا جائے۔ پریزیڈنٹ [آل انڈیا مسلم لیگ] اجلاس کی تاریخ مقرر کردے۔ میرے خیال میں ۱۸ر اکتوبر (ہفتہ) موزوں تاریخ ہوگی۔ آپ مسٹر جناح سے جلد خط و کتابت کر کے تاریخ کا اعلان کریں، کیونکہ اجلاس کی کامیابی کا دارومدار اس بات پر [ہے] کہ تاریخ اجلاس کا اعلان جہاں تک ممکن ہو، جلد ہو جائے۔ مسٹر جناح ۴ر اکتوبر کو انگلستان جارہے ہیں۔

فقط

محمد اقبال

* اے-ایف-ایم-جلد ۴، ۱۵ص ۲۷

DR. SIR MUHAMMAD IQBAL, M.L.C.
BARRISTER-AT-LAW.

LAHORE.
............19

لاہور ۲۴ اکتوبر ۳۰ء

جناب من — سلام مسنون

مسٹر جناح کا خط مجھ کو آیا تھا جس کو نہایت مختصر لکھا جاتا ہے اور اجلاس کی تاریخ
اور جگہ کا فیصلہ کیا جائے — میں نے ان کو جواب دے دیا ہے کہ اجلاس کا الٰہ آباد میں ہونا
بہتر ہے کیونکہ کسی اور مقام کا انتخاب اس وقت میں دقت ہوگی اور وہاں کے لوگ اس
بات کا لحاظ کر چکے ہیں کہ گذشتہ اجلاس کی روئداد شائع کی جائے جیسا کہ ~~[illegible]~~
کا وسیلہ مہیا ہو سکے کہ ہر وقت کا فیصلہ ہو سکتا ہے — بلکہ میرے خیال میں اجلاس کی تیاری ہو چکی ہے
اور سیکرٹری کو بھی ضروری ہے کہ اجلاس کا اعلان کیا جائے — پریزیڈنٹ اجلاس کی
تاریخ مقرر کر دے — میرے خیال میں ۱۸ اکتوبر (سنیچر) موزوں تاریخ ہوگی
اب مسٹر جناح سے جلد خط و کتابت کر کے تاریخ کا اعلان کر دیں کیونکہ
اجلاس کی تیاری کا دارومدار اس بات پر ہے کہ تاریخ اجلاس کا اعلان جہاں تک
ممکن ہو جلد ہو جائے — مسٹر جناح ۱۴ اکتوبر کو انگلستان جا رہے ہیں

محمد اقبال

خطبہ الٰہ آباد کا انگریزی متن

معہ عکس اولین طباعت

All India Muslim League

Allahabad Session

December–1930

PRESIDENTIAL ADDRES

BY

DR. SIR MUHAMMAD IQBAL

Barrister-at-Law,

Lahore

ALL-INDIA MUSLIM LEAGUE

13 AUG 1971

ALLAHABAD SESSION

DECEMBER—1930.

PRESIDENTIAL ADDRESS

BY

DR. SIR MUHAMMAD IQBAL
BARRISTER-AT-LAW,
LAHORE

Gentlemen,

I am deeply grateful to you for the honour you have conferred upon me in inviting me to preside over the deliberations of the All-India Muslim League at one of the most critical moments in the history of Muslim political thought and activity in India. I have no doubt that in this great assembly there are men whose political experience is far more extensive than mine, and for whose knowledge of affairs I have the highest respect. It will, therefore, be presumptuous on my part to claim to guide an assembly of such men in the political decisions which they are called upon to make today. I lead no party; I follow no leader. I have given the best part of my life to a careful study of Islam, its law and polity, its culture, its history and its literature. This constant contact with the spirit of Islam, as it unfolds itself in time, has, I think, given me a kind of insight into its significance as a world fact. It is in the light of this insight, whatever its value, that, while assuming that the Muslims of India are determined to remain true to the spirit of Islam, I propose, not to guide you in your decisions, but to attempt the humbler task of bringing clearly to your consciousness the main principle which, in my opinion, should determine the general character of these decisions.

Islam and Nationalism

It cannot be denied that Islam, regarded as an ethical ideal plus a certain kind of polity – by which expression I mean a social structure, regulated by a legal system and animated by a specific ethical ideal – has been the chief formative factor in the life-history of the Muslims of India. It has furnished those basic emotions and loyalties which gradually unify scattered individuals and groups, and finally transform them into a well-defined people, possessing a moral consciousness of their own. Indeed it is no exaggeration to say that India is perhaps the only country in the world where Islam, as a people-building force, has worked at its best. In India, as elsewhere, the structure of Islam as a society is

GENTLEMEN,

I am deeply grateful to you for the honour you have conferred upon me in inviting me to preside over the deliberations of the All-India Muslim League at one of the most critical moments in the history of Muslim political thought and activity in India. I have no doubt that in this great assembly there are men whose political experience is far more extensive than mine, and for whose knowledge of affairs I have the highest respect. It will, therefore, be presumptuous on my part to claim to guide an assembly of such men in the political decisions which they are called upon to make to-day. I lead no party; I follow no leader. I have given the best part of my life to a careful study of Islam, its law and polity, its culture, its history and its literature. This constant contact with the spirit of Islam, as it unfolds itself in time, has, I think, given me a kind of insight into its significance as a world-fact. It is in the light of this insight, whatever its value, that, while assuming that the Muslims of India are determined to remain true to the spirit of Islam, I propose, not to guide you in your decisions, but to attempt the humbler task of bringing clearly to your consciousness the main principle which, in my opinion, should determine the general character of these decisions.

ISLAM AND NATIONALISM.

It cannot be denied that Islam, regarded as an ethical ideal plus a certain kind of polity—by which expression I mean a social structure, regulated by a legal system and animated by a specific ethical ideal—has been the chief formative factor in the life-history of the Muslims of India. It has furnished those basic emotions and loyalties which gradually unify scattered individuals and groups, and finally transform them into a well-defined people, possessing a moral consciousness of their own. Indeed it is no exaggeration to say that India is perhaps the only country in the world where Islam, as a people-building force, has worked at its best. In India, as elsewhere, the structure of Islam as a society is almost entirely due to the working of Islam as a culture inspired by a specific ethical ideal. What I mean to say is that Muslim society, with its remarkable homogeneity and inner unity, has grown to be what it is, under the pressure of the laws and institutions associated with the culture of Islam. The ideas set free by

almost entirely due to the working of Islam as a culture inspired by a specific ethical ideal. What I mean to say is that Muslim society, with its remarkable homogeneity and inner unity, has grown to be what it is, under the pressure of the laws and institutions associated with the culture of Islam. The ideas set free by European political thinking, however, are now rapidly changing the outlook of the present generation of Muslims both in India and outside India. Our younger men inspired by these ideas, are anxious to see them as living forces in their own countries, without any critical appreciation of the facts which have determined their evolution in Europe. In Europe, Christianity was understood to be a purely monastic order which gradually developed into a vast Church-organisation. The protest of Luther was directed against this Church-organisation, not against any system of polity of a secular nature, for the obvious reason that there was no such polity associated with Christianity. And Luther was perfectly justified in rising in revolt against this organisation; though, I think, he did not realize that in the peculiar conditions which obtained in Europe his revolt would eventually mean the complete displacement of universal ethics of Jesus by the growth of a plurality of national and hence narrower systems of ethics. Thus the upshot of the intellectual movement initiated by such men as Rousseau and Luther was the break-up of the one into a mutually ill-adjusted many, the transformation of a human into a national outlook, requiring a more realistic foundation, such as the notion of country, and finding expression through varying systems of polity evolved on national lines, i.e., on lines which recognize territory as the only principle of political solidarity. If you begin with the conception of religion as complete other-worldliness, then what has happened to Christianity in Europe is perfectly natural. The universal ethics of Jesus is displaced by national systems of ethics and polity. The conclusion to which Europe is consequently driven is that religion is a private affair of the individual, and has nothing to do with what is called

European political thinking, however, are now rapidly changing the outlook of the present generation of Muslims both in India and outside India. Our younger men, inspired by these ideas, are anxious to see them as living forces in their own countries, without any critical appreciation of the facts which have determined their evolution in Europe. In Europe Christianity was understood to be a purely monastic order which gradually developed into a vast church-organisation. The protest of Luther was directed against this church-organisation, not against any system of polity of a secular nature, for the obvious reason that there was no such polity associated with Christianity. And Luther was perfectly justified in rising in revolt against this organisation; though, I think, he did not realize that in the peculiar conditions which obtained in Europe his revolt would eventually mean the complete displacement of universal ethics of Jesus by the growth of a plurality of national and hence narrower systems of ethics. Thus the upshot of the intellectual movement initiated by such men as Rousseau and Luther was the break-up of the one into a mutually ill-adjusted many, the transformation of a human into a national outlook, requiring a more realistic foundation, such as the notion of country, and finding expression through varying systems of polity evolved on national lines, *i. e.* on lines which recognize territory as the only principle of political solidarity. If you begin with the conception of religion as complete other-worldiness, then what has happened to Christianity in Europe is perfectly natural. The universal ethics of Jesus is displaced by national systems of ethics and polity. The conclusion to which Europe is consequently driven is that religion is a private affair of the individual, and has nothing to do with what is called man's temporal life. Islam does not bifurcate the unity of man into an irreconcilable duality of spirit and matter. In Islam God and the universe, spirit and matter, church and state, are organic to each other. Man is not the citizen of a profane world to be ronounced in the interest of a world of spirit situated elsewhere. To Islam matter is spirit realizing itself in space and time. Europe uncritically accepted the duality of spirit and matter probably from Mannichaean thought. Her best thinkers are realizing this initial mistake to-day, but her statesmen are indirectly forcing the world to accept it as an unquestionable dogma. It is, then, this mistaken separation of spiritual and temporal which has largely influenced European religious and political thought, and has resulted practically in the total exclusion of Christianity from the life of European

man's temporal life. Islam does not bifurcate the unity of man into an irreconcilable duality of spirit and matter. In Islam God and the universe, spirit and matter, church and state, are organic to each other. Man is not the citizen of a profane world to be renounced in the interest of a world of spirit situated elsewhere. To Islam matter is spirit realizing itself in space and time. Europe uncritically accepted the duality of spirit and matter probably from Mannichaean thought. Her best thinkers are realizing this initial mistake to-day, but her statesmen are indirectly forcing the world to accept it as an unquestionable dogma. It is, then, this mistaken separation of spiritual and temporal which has largely influenced European religious and political thought, and has resulted practically in the total exclusion of Christianity from the life of European states. The result is a set of mutually ill-adjusted states dominated by interests, not human but national. And these mutually ill-adjusted states, after trampling over the moral and religious convictions of Christianity, are today feeling the need of a federated Europe, i.e. the need of a unity which the Christian Church-organisation originally gave them, but which, instead of reconstructing in the light of Christ's vision of human brotherhood, they considered it fit to destroy under the inspiration of Luther. A Luther in the world of Islam, however, is an impossible phenomenon; for here there is no Church-organisation, similar to that of Christianity in the middle ages, inviting a destroyer. In the world of Islam we have a universal polity whose fundamentals are believed to have been revealed, but whose structure, owing to our legists' want of contact with the modern world, stands today in need of renewed power by fresh adjustments. I do not know what will be the final fate of the national idea in the world of Islam, whether Islam will assimilate and transform it, as it has assimilated and transformed before many ideas expressive of a different spirit, or allow a radical transformation of its own structure by the force of this idea, is hard to predict. Professor Wensinck of Leiden (Holland) wrote to me the other day: "It seems to me that Islam is entering upon a

states. The result is a set of mutually ill-adjusted states dominated by interests, not human but national. And these mutually ill-adjusted states, after trampling over the moral and religious convictions of Christianity, are to day feeling the need of a federated Europe, *i. e.* the need of a unity which the Christian church-organisation originally gave them, but which, instead of reconstructing in the light of Christ's vision of human brotherhood, they considered it fit to destroy under the inspiration of Luther. A Luther in the world of Islam, however, is an impossible phenomenon; for here there is no Church-organisation, similar to that of Christianity in the middle ages, inviting a destroyer. In the world of Islam we have a universal polity whose fundamentals are believed to have been revealed, but whose structure, owing to our legists' want of contact with the modern world, stands to-day in need of renewed power by fresh adjustments. I do not know what will be the final fate of the national idea in the world of Islam. Whether Islam will assimilate and transform it, as it has assimilated and transformed before many ideas expressive of a different spirit, or allow a radical transformation of its own structure by the force of this idea, is hard to predict. Professor Wensinck of Leiden (Holland) wrote to me the other day: "It seems to me that Islam is entering upon a crisis through which Christianity has been passing for more than a century. The great difficulty is how to save the foundations of religion when many antiquated notions have to be given up. It seems to me scarcely possible to state what the outcome will be for Christianity, still less what it will be for Islam." At the present moment the national idea is racialising the outlook of Muslims, and thus materially counteracting the humanising work of Islam. And the growth of racial consciousness may mean the growth of standards different and even opposed to the standards of Islam. I hope you will pardon me for this apparently academic discussion. To address this session of the All-India Muslim League you have selected a man who is not despaired of Islam as a living force for freeing the outlook of man from its geogrophical limitations, who believes that religion is a power of the utmost importance in the life of individuals as well as states, and finally who believes that *Islam is itself Destiny and will not suffer a destiny!* Such a man cannot but look at matters from his own point of view. Do not think that the problem I am indicating is a purely theoretical one. It is a very living and practical problem calculated to affect the very fabric of Islam as a

crisis through which Christianity has been passing for more than a century. The great difficulty is how to save the foundations of religion when many antiquated notions have to be given up. It seems to me scarcely possible to state what the outcome will be for Christianity, still less what it will be for Islam." At the present moment the national idea is racialising the outlook of Muslims, and thus materially counteracting the humanising work of Islam. And the growth of racial consciousness may mean the growth of standards different and even opposed to the standards of Islam.

I hope you will pardon me for this apparently academic discussion. To address this session of the All-India Muslim League you have selected a man who is not despaired of Islam as a living force for freeing the outlook of man from its geographical limitations, who believes that religion is a power of the utmost importance in the life of individuals as well as states, and finally who believes that *Islam is itself Destiny and will not suffer a destiny!* Such a man cannot but look at matters from his own point of view. Do not think that the problem I am indicating is a purely theoretical one. It is a very living and practical problem calculated to affect the very fabric of Islam as a system of life and conduct. On a proper solution of it alone depends your future as a distinct cultural unit in India. Never in our history Islam has had to stand a greater trial than the one which confronts it today. It is open to a people to modify, reinterpret or reject the foundational principles of their social structure; but it is absolutely necessary for them to see clearly what they are doing before they undertake to try a fresh experiment. Nor should the way in which I am approaching this important problem lead anybody to think that I intend to quarrel with those who happen to think differently. You are a Muslim assembly and, I suppose, anxious to remain true to the spirit and ideals of Islam. My sole desire, therefore, is to tell you frankly what I honestly believe to be the truth about the present situation. In this

states. The result is a set of mutually ill-adjusted states dominated by interests, not human but national. And these mutually ill-adjusted states, after trampling over the moral and religious convictions of Christianity, are to-day feeling the need of a federated Europe, *i. e.* the need of a unity which the Christian church-organisation originally gave them, but which, instead of reconstructing in the light of Christ's vision of human brotherhood, they considered it fit to destroy under the inspiration of Luther. A Luther in the world of Islam, however, is an impossible phenomenon; for here there is no Church-organisation, similar to that of Christianity in the middle ages, inviting a destroyer. In the world of Islam we have a universal polity whose fundamentals are believed to have been revealed, but whose structure, owing to our legists' want of contact with the modern world, stands to-day in need of renewed power by fresh adjustments. I do not know what will be the final fate of the national idea in the world of Islam. Whether Islam will assimilate and transform it, as it has assimilated and transformed before many ideas expressive of a different spirit, or allow a radical transformation of its own structure by the force of this idea, is hard to predict. Professor Wensinck of Leiden (Holland) wrote to me the other day: "It seems to me that Islam is entering upon a crisis through which Christianity has been passing for more than a century. The great difficulty is how to save the foundations of religion when many antiquated notions have to be given up. It seems to me scarcely possible to state what the outcome will be for Christianity, still less what it will be for Islam." At the present moment the national idea is racialising the outlook of Muslims, and thus materially counteracting the humanising work of Islam. And the growth of racial consciousness may mean the growth of standards different and even opposed to the standards of Islam. I hope you will pardon me for this apparently academic discussion. To address this session of the All-India Muslim League you have selected a man who is not despaired of Islam as a living force for freeing the outlook of man from its geogrophical limitations, who believes that religion is a power of the utmost importance in the life of individuals as well as states, and finally who believes that *Islam is itself Destiny and will not suffer a destiny!* Such a man cannot but look at matters from his own point of view. Do not think that the problem I am indicating is a purely theoretical one. It is a very living and practical problem calculated to affect the very fabric of Islam as a

way alone it is possible for me to illuminate, according to my light, the avenues of your political action.

The Unity of an Indian Nation

What, then, is the problem and its implications? Is religion a private affair? Would you like to see Islam, as a moral and political ideal, meeting the same fate in the world of Islam as Christianity has already met in Europe? Is it possible to retain Islam as an ethical ideal and to reject it as a polity in favour of national polities in which religious attitude is not permitted to play any part? This question becomes of special importance in India where the Muslims happen to be in a minority. The proposition that religion is a private individual experience is not surprising on the lips of a European. In Europe the conception of Christianity as a monastic order, renouncing the world of matter and fixing its gaze entirely on the world of spirit, led, by a logical process of thought, to the view embodied in this proposition. The nature of the [Holy] Prophet's [P. B. U. H.] religious experience, as disclosed in the Quran, however, is wholly different. It is not mere experience in the sense of a purely biological event, happening inside the experient and necessitating no reactions on its social environment. It is individual experience creative of a social order. Its immediate outcome is the fundamentals of a polity with implicit legal concepts whose civic significance cannot be belittled merely because their origin is revelational. The religious ideal of Islam, therefore, is organically related to the social order which it has created. The rejection of the one will eventually involve the rejection of the other. Therefore, the construction of a polity on national lines, if it means a displacement of the Islamic principle of solidarity, is simply unthinkable to a Muslim. This is a matter which at the present moment directly concerns the Muslims of India. "Man," says Renan, "is enslaved neither by his race nor by his religion, nor by the course of rivers, nor by the direction of mountain ranges. A great aggregation of men, sane of mind and warm of

system of life and conduct. On a proper solution of it alone depends your future as a distinct cultural unit in India. Never in our history Islam has had to stand a greater trial than the one which confronts it to-day. It is open to a people to modify, reinterpret or reject the foundational principles of their social structure ; but it is absolutely necessary for them to see clearly what they are doing before they undertake to try a fresh experiment. Nor should the way in which I am approaching this important problem lead anybody to think that I intend to quarrel with those who happen to think differently. You are a Muslim assembly and, I suppose, anxious to remain true to the spirit and ideals of Islam. My sole desire, therefore, is to tell you frankly what I honestly believe to be the truth about the present situation. In this way alone it is possible for me to illuminate, according to my light, the avenues of your political action.

THE UNITY OF AN INDIAN NATION.

What, then, is the problem and its implications? Is religion a private affair? Would you like to see Islam, as a moral and political ideal, meeting the same fate in the world of Islam as Christianity has already met in Europe? Is it possible to retain Islam as an ethical ideal and to reject it as a polity in favour of national polities in which religious attitude is not permitted to play any part? This question becomes of special importance in India where the Muslims happen to be in a minority. The proposition that religion is a private individual experience is not surprising on the lips of a European. In Europe the conception of Christianity as a monastic order, renouncing the world of matter and fixing its gaze entirely on the world of spirit, led, by a logical process of thought, to the view embodied in this proposition. The nature of the Prophet's religious experience, as disclosed in the Quran, however, is wholly different. It is not mere experience in the sense of a purely biological event, happening inside the experient and necessitating no reactions on its social environment. It is individual experience creative of a social order. Its immediate outcome is the fundamentals of a polity with implicit legal concepts whose civic significance cannot be belittled merely because their origin is revelational. The religious ideal of Islam, therefore, is organically related to the social order which it has created. The rejection of the one will eventually involve the rejection of the other. Therefore the construction of a polity on national lines, if it means a displacement of the Islamic principle of

heart, creates a moral consciousness which is called a nation." Such a formation is quite possible, though it involves the long and arduous process of practically re-making men and furnishing them with a fresh emotional equipment. It might have been a fact in India if the teachings of Kabir and the Divine Faith of Akbar had seized the imagination of the masses of this country. Experience, however, shows that the various caste units and religious units in India have shown no inclination to sink their respective individualities in a larger whole. Each group is intensely jealous of its collective existence. The formation of the kind of moral consciousness which constitutes the essence of a nation in Renan's sense demands a price which the peoples of India are not prepared to pay. The unity of an Indian nation, therefore, must be sought, not in the negation, but in the mutual harmony and cooperation of the many. True statesmanship cannot ignore facts, however unpleasant they may be. The only practical course is not to assume the existence of a state of things which does not exist, but to recognise facts as they are, and to exploit them to our greatest advantage. And it is on the discovery of Indian unity in this direction that the fate of India as well as of Asia really depends. India is Asia in miniature. Part of her people have cultural affinities with nations in the East, and part with nations in the middle and west of Asia. If an effective principle of cooperation is discovered in India it will bring peace and mutual goodwill to this ancient land which has suffered so long, more because of her situation in historic space than because of any inherent incapacity of her people. And it will at the same time solve the entire political problem of Asia.

It is, however, painful to observe that our attempts to discover such a principle of internal harmony have so far failed. Why have they failed? Perhaps, we suspect each other's intentions, and inwardly aim at dominating each other. Perhaps, in the higher interests of mutual cooperation, we cannot afford to part with monopolies which

solidarity, is simply unthinkable to a Muslim. This is a matter which at the present moment directly concerns the Muslims of India. "Man," says Renan, "is enslaved neither by his race, nor by his religion, nor by the course of rivers, nor by the direction of mountain ranges. A great aggregation of men, sane of mind and warm of heart, creates a moral consciousness which is called a nation." Such a formation is quite possible, though it involves the long and arduous process of practically re-making men and furnishing them with a fresh emotional equipment. It might have been a fact in India if the teaching of Kabir and the Divine Faith of Akbar had seized the imagination of the masses of this country. Experience, however, shows that the various caste-units and religious units in India have shown no inclination to sink their respective individualities in a larger whole. Each group is intensely jealous of its collective existence. The formation of the kind of moral consciousness which constitutes the essence of a nation in Renan's sense demands a price which the peoples of India are not prepared to pay. The unity of an Indian nation, therefore, must be sought, not in the negation, but in the mutual harmony and co-operation of the many. True statesmanship cannot ignore facts, however unpleasant they may be. The only practical course is not to assume the existence of a state of things which does not exist, but to recognize facts as they are, and to exploit them to our greatest advantage. And it is on the discovery of Indian unity in this direction that the fate of India as well as of Asia really depends. India is Asia in miniature. Part of her people have cultural affinities with nations in the East, and part with nations in the middle and west of Asia. If an effective principle of co-operation is discovered in India it will bring peace and mutual good-will to this ancient land which has suffered so long, more because of her situation in historic space than because of any inherent incapacity of her people. And it will at the same time solve the entire political problem of Asia.

It is, however, painful to observe that our attempts to discover such a principle of internal harmony have so far failed. Why have they failed? Perhaps, we suspect each other's intentions, and inwardly aim at dominating each other. Perhaps, in the higher interests of mutual co-operation, we cannot afford to part with the monopolies which circumstances have placed in our hands, and conceal our egoism under the cloak of a nationalism, outwardly simulating a large-hearted patriotism, but inwardly as narrow-minded as a caste or a tribe. Perhaps, we are unwilling to

circumstances have placed in our hands, and conceal our egoism under the cloak of a nationalism, outwardly simulating a large-hearted patriotism, but inwardly as narrow-minded as a caste or a tribe. Perhaps, we are unwilling to recognize that each group has a right to free development according to its own cultural traditions. But whatever may be the causes of our failure, I still feel hopeful. Events seem to be tending in the direction of some sort of internal harmony. And as far as I have been able to read the Muslim mind, I have no hesitation in declaring that, if the principle that the Indian Muslim is entitled to full and free development on the lines of his own culture and tradition in his own Indian homelands is recognized as the basis of a permanent communal settlement, he will be ready to stake his all for the freedom of India. The principle that each group is entitled to free development on its own lines is not inspired by any feeling of narrow communalism. There are communalisms and communalisms. A community which is inspired by feeling of ill-will towards other communities is low and ignoble. I entertain the highest respect for the customs, laws, religious and social institutions of other communities. Nay, it is my duty, according to the teachings of the Quran, even to defend their places of worship if need be. *Yet I love the communal group which is source of my life and behaviour; and which has formed me what I am by giving me its religion, its literature, its thought, its culture, and thereby recreating its whole past, as a living operative factor, in my present consciousness.* Even the authors of the Nehru Report recognise the value of this higher aspect of communalism. While discussing the separation of Sind they say: "To say from the larger viewpoint of nationalism that no communal provices should be created is, in a way, equivalent to saying from the still wider international viewpoint that there should be no separate nations. Both these statements have a measure of truth in them. But the staunchest internationalist recognises that without the fullest national autonomy it is extraordinarily difficult to create the international state. *So also without*

recognize that each group has a right to free development according to its own cultural traditions. But whatever may be the causes of our failure, I still feel hopeful. Events seem to be tending in the direction of some sort of internal harmony. And as far as I have been able to read the Muslim mind, I have no hesitation in declaring that, if the principle that the Indian Muslim is entitled to full and free development on the lines of his own culture and tradition in his own Indian homelands is recognized as the basis of a permanent communal settlement, he will be ready to stake his all for the freedom of India. The principle that each group is entitled to free development on its own lines is not inspired by any feeling of narrow communalism. There are communalisms and communalisms. A community which is inspired by feeling of ill-will towards other communities is low and ignoble. I entertain the highest respect for the customs, laws, religious and social institutions of other communities. Nay, it is my duty, according to the teaching of the Quran, even to defend their places of worship if need be. *Yet I love the communal group which is the source of my life and behaviour; and which has formed me what I am by giving me its religion, its literature, its thought, its culture, and thereby recreating its whole past, as a living operative factor, in my present consciousness.* Even the authors of the Nehru Report recognise the value of this higher aspect of communalism. While discussing the separation of Sind they say: "To say from the larger viewpoint of nationalism that no communal provinces should be created is, in a way, equivalent to saying from the still wider international viewpoint that there should be no separate nations. Both these statements have a measure of truth in them. But the staunchest internationalist recognises that without the fullest national autonomy it is extraordinarily difficult to create the international state. *So also without the fullest cultural autonomy, and communalism in its better aspect is culture, it will be difficult to create a harmonious nation.*"

MUSLIM INDIA WITHIN INDIA.

Communalism, in its higher aspect, then, is indispensable to the formation of a harmonious whole in a country like India. The units of Indian society are not territorial as in European countries. India is a continent of human groups belonging to different races, speaking different languages and professing different religions. Their behaviour is not at all determined by a common race-consciousness. Even the Hindus

the fullest cultural autonomy, and communalism in its better aspect is culture, it will be difficult to create a harmonious nation."

Muslim India within India

Communalism, in its higher aspect, then, is indispensable to the formation of a harmonious whole in a country like India. The units of Indian society are not territorial as in European countries. India is a continent of human groups belonging to different races, speaking different languages and professing different religions. Their behaviour is not at all determined by a common race consciousness. Even the Hindus do not form a homogeneous group. The principle of European democracy cannot be applied to India without recognising the fact of communal groups. The Muslim demand for the creation of a Muslim India within India is, therefore, perfectly justified. The resolution of the All Parties Muslim Conference at Delhi is, to my mind, wholly inspired by this noble ideal of a harmonious whole which, instead of stiffling the respective individualities of its component wholes, affords them chances of fully working out the possibilities that may be latent in them. And I have no doubt that this house will emphatically endorse the Muslim demands embodied in this resolution. Personally I would go further than the demands embodied in it. *I would like to see the Punjab, North-West Frontier Province, Sind and Baluchistan amalgamated into a single state. Self-Government within the British Empire, or without the British Empire, the formation of a consolidated North-West Indian Muslim state appears to me to be the final destiny of the Muslims at least of the North-West India.* The proposal was put forward before the Nehru Committee. They rejected it on the ground that, if carried into effect, it would give a very unwieldy state. This is true in so far as the area is concerned; in point of population the state contemplated by the proposal would be much less than some of the present Indian provinces. The exclusion of Ambala Division and perhaps of some districts where non-Muslims pre-dominate, will make it less extensive and more Muslim in population – so that

do not form a homogeneous group. The principle of European democracy cannot be applied to India without recognising the fact of communal groups. The Muslim demand for the creation of a Muslim India within India is, therefore, perfectly justified. The resolution of the All-Parties Muslim Conference at Delhi is, to my mind, wholly inspired by this noble ideal of a harmonious whole which, instead of stifling the respective individualities of its component wholes, affords them chances of fully working out the possibilities that may be latent in them. And I have no doubt that this house will emphatically endorse the Muslim demands embodied in this resolution. Personally I would go further than the demands embodied in it. *I would like to see the Punjab, North-West Frontier Province, Sind and Baluchistan amalgamated into a single state. Self-Government within the British Empire, or without the British Empire, the formation of a consolidated North-West Indian Muslim state appears to me to be the final destiny of the Muslims at least of North-West India.* The proposal was put forward before the Nehru Committee. They rejected it on the ground that, if carried into effect, it would give a very unwieldy state. This is true in so far as the area is concerned; in point of population the state contemplated by the proposal would be much less than some of the present Indian provinces. The exclusion of Ambala Division and perhaps of some districts where non-Muslims predominate, will make it less extensive and more Muslim in population—so that the exclusion suggested will enable this consolidated state to give a more effective protection to non-Muslim minorities within its area. The idea need not alarm the Hindus or the British. India is the greatest Muslim country in the world. The life of Islam as a cultural force in this country very largely depends on its centralisation in a specified territory. This centralisation of the most living portion of the Muslims of India whose military and police service has, notwithstanding unfair treatment from the British, made the British rule possible in this country, will eventually solve the problem of India as well as of Asia. It will intensify their sense of responsibility and deepen their patriotic feeling. Thus, possessing full opportunity of development within the body-politic of India, the North-West Indian Muslims will prove the best defenders of India against a foreign invasion, be that invasion the one of ideas or of bayonets. The Punjab with fifty six per cent Muslim population supplies fifty four per cent of the total combatant troops in the Indian army, and if the nineteen thousand Gurkhas recruited from the independent state of Nepal are

the exclusion suggested will enable this consolidated state to give a more effective protection to non-Muslim minorities within its area. The idea need not alarm the Hindus or the British. India is the greatest Muslim country in the world. The life of Islam as a cultural force in this country very largely depends on its centralisation in a specified territory. This centralisation of the most living portion of the Muslims of India, whose military and police service has, notwithstanding unfair treatment from the British, made the British rule possible in this country, will eventually solve the problem of India as well as of Asia. It will intensify their sense of responsibility and deepen their patriotic feelings. Thus, possessing full opportunity of development within the body-politic of India, the North-West Indian Muslims will prove the best defenders of India against a foreign invasion, be that invasion the one of ideas or of bayonets. The Punjab with fifty-six per cent Muslim population supplies fifty-four per cent of the total combatant troops in the Indian Army, and if the nineteen thousand Gurkhas recruited from the independent state of Nepal are excluded, the Punjab contingent amounts to sixty two per cent of the whole Indian Army. This percentage does not take into account nearly six thousand combatants supplied to the Indian Army by the North-West Frontier Province and Baluchistan. From this you can easily calculate the possibilities of the North-West Indian Muslims in regard to the defence of India against foreign aggression. The Right Hon'ble Mr. Srinivasa Sastri thinks that the Muslim demand for the creation of autonomous Muslim states along with North-West border is actuated by a desire "to acquire means of exerting pressure in emergencies on the Government of India." I may frankly tell him that the Muslim demand is not actuated by the kind of motive he imputes to us; it is actuated by a genuine desire for *free development* which is practically impossible under the type of unitary government contemplated by the nationalist Hindu politicians with a view to secure permanent communal dominance in the whole of India.

excluded, the Punjab contingent amounts to sixty two per cent of the whole Indian Army. This percentage does not take into account nearly six thousand combatants supplied to the Indian Army by the North-West Frontier Province and Baluchistan. From this you can easily calculate the possibilities of North-West Indian Muslims in regard to the defence of India against foreign aggression. The Right Hon'ble Mr. Srinivasa Sastri thinks that the Muslim demand for the creation of autonomous Muslim states along the North-West border is actuated by a desire "to acquire means of exerting pressure in emergencies on the Government of India." I may frankly tell him that the Muslim demand is not actuated by the kind of motive he imputes to us; it is actuated by a genuine desire for free development which is practically impossible under the type of unitary government contemplated by the nationalist Hindu politicians with a view to secure permanent communal dominance in the whole of India.

Nor should the Hindus fear that the creation of autonomous Muslim states will mean the introduction of a kind of religious rule in such states. I have already indicated to you the meaning of the word religion, as applied to Islam. The truth is that Islam is not a church. It is state, conceived as a contractual organism long before Rousseau ever thought of such a thing, and animated by an ethical ideal which regards man not as an earth-rooted creature, defined by this or that portion of the earth, but as a spiritual being understood in terms of a social mechanism, and possessing rights and duties as a living factor in that mechanism. The character of a Muslim state can be judged from what the *Times of India* pointed out sometime ago in a leader on the Indian Banking Inquiry Committee. " In ancient India." the paper points out, "the state framed laws regulating the rates of interest; but in Muslim times, although Islam clearly forbids the realization of interest on money loaned, Indian Muslim states imposed no restrictions on such rates." I therefore demand the formation of a consolidated Muslim state in the best interests of India and Islam. For India it means security and peace resulting from an internal balance of power; for Islam an opportunity to rid itself of the stamp that Arabian Imperialism was forced to give it, to mobilize its law, its education, its culture, and to bring them into closer contact with its own original spirit and with the spirit of modern times.

Nor should the Hindus fear that the creation of autonomous Muslim states will mean the introduction of a kind of religious rule in such states. I have already indicated to you the meaning of the word religion, as applied to Islam. The truth is that Islam is not a church. It is state, conceived as a contractual organism long before Rousseau ever thought of such a thing, and animated by an ethical ideal which regards man not as an earth-rooted creature, defined by this or that portion of the earth, but as a spiritual being understood in terms of a social mechanism, and possessing rights and duties as a living factor in that mechanism. The character of a Muslim state can be judged from what the *Times of India* pointed out sometime ago in a leader on the Indian Banking Inquiry Committee. "In ancient India," the paper points out, "the state framed laws regulating the rates of interest; but in Muslim times, although Islam clearly forbids the realization of interest on money loaned, Indian Muslim states imposed no restrictions on such rates." I therefore demand the formation of a consolidated Muslim state in the best interests of India and Islam. For India it means security and peace resulting from the internal balance of power; for Islam an opportunity to rid itself of the stamp that Arabian Imperialism was forced to give it, to mobilize its law, its education, its culture, and to bring them into closer contact with its own original spirit and with the spirit of modern times.

Federal States

Thus it is clear that in view of India's infinite variety in climates, races, languages, creeds and social systems, the creation of autonomous states, based on the unity of language, race, history, religion and identity of economic interests, is the only possible way to secure a stable constitutional structure in India. The conception of federation underlying the Simon Report necessitates the abolition of the Central Legislative Assembly as a popular assembly, and makes it an assembly of the representatives

FEDERAL STATES.

Thus it is clear that in view of India's infinite variety in climates, races, languages, creeds and social systems, the creation of autonomous states, based on the unity of language, race, history, religion and identity of economic interest, is the only possible way to secure a stable constitutional structure in India. The conception of federation underlying the Simon Report necessitates the abolition of the Central Legislative Assembly as a popular assembly, and makes it an assembly of the representatives of federal states. It further demands a redistribution of territory on the lines which I have indicated. And the Report does recommend both. I give my whole-hearted support to this view of the matter, and venture to suggest that the redistribution recommended in the Simon Report must fulfil two conditions. It must precede the introduction of the new constitution, and must be so devised as to finally solve the communal problem. Proper redistribution will make the question of joint and separate electorates automatically disappear from the constitutional controversy of India. It is the present structure of the provinces that is largely responsible for this controversy. The Hindu thinks that separate electorates are contrary to the spirit of true nationalism, because he understands the word nation to mean a kind of universal amalgamation in which no communal entity ought to retain its private individuality. Such a state of things, however, does not exist. Nor is it desirable that it should exist. India is a land of racial and religious variety. Add to this the general economic inferiority of the Muslims, their enormous debt, especially in the Punjab, and their insufficient majorities in some of the provinces as at present constituted, and you will begin to see clearly the meaning of our anxiety to retain separate electorates. In such a country and in such circumstances territorial electorates cannot secure adequate representation of all interests, and must inevitably lead to the creation of an oligarchy. The Muslims of India can have no objection to purely territorial electorates if provinces are demarcated so as to secure comparatively homogeneous communities possessing linguistic, racial, cultural and religious unity.

FEDERATION AS UNDERSTOOD IN THE SIMON REPORT

But in so far as the question of the powers of the Central Federal State is concerned, there is a subtle difference of motive

of federal states. It further demands a redistribution of territory on the lines which I have indicated. And the Report does recommend both. I give my whole-hearted support to this view of the matter, and venture to suggest that the redistribution recommended in the Simon Report must fulfil two conditions. It must precede the introduction of the new constitution, and must be so devised as to finally solve the communal problem. Proper redistribution will make the question of joint and separate electorates automatically disappear from the constitutional controversy of India. It is the present structure of the provinces that is largely responsible for this controversy. The Hindu thinks that separate electorates are contrary to the spirit of true nationalism, because he understands the word nation to mean a kind of universal amalgamation in which no communal entity ought to retain its private individuality. Such a state of things however does not exist. Nor is it desirable that it should exist. India is the land of racial and religious variety. And to this, the general economic inferiority of the Muslims, their enormous debt, especially in the Punjab, and their insufficient majorities in some of the provinces as at present constituted, and you will begin to see clearly the meaning of our anxiety to retain separate electorates. In such a country and in such circumstances, territorial electorates cannot secure adequate representation of all interests, and must inevitably lead to the creation of an oligarchy. The Muslims of India can have no objection to purely territorial electorates if provinces are demarcated so as to secure comparatively homogeneous communities possessing linguistic, racial, cultural and religious unity.

Federation as understood in the Simon Report

But in so far as the question of the powers of the Central Federal States is concerned, there is a subtle difference of motive in the constitutions proposed by the Pandits of India and the Pandits of England. The Pandits of India do not disturb the central authority as it stands at present. All

in the constitutions proposed by the Pandits of India and the Pandits of England. The Pandits of India do not disturb the central authority as it stands at present. All that they desire is that this authority should become fully responsible to the Central Legislature which they maintain intact, and where their majority will become further reinforced on the nominated element ceasing to exist. The Pandits of England, on the other hand, realizing that democracy in the centre tends to work contrary to their interests, and is likely to absorb the whole power now in their hands, in case a further advance is made towards responsible government, have shifted the experiment of democracy from the centre to the provinces. No doubt, they introduce the principle of federation and appear to have made a beginning by making certain proposals, yet their evaluation of this principle is determined by considerations wholly different to those which determine its value in the eyes of Muslim India. The Muslims demand federation because it is pre-eminently a solution of India's most difficult problem *i. e.* the communal problem. The Royal Commissioners' view of federation, though sound in principle, does not seem to aim at responsible government for federal states. Indeed it does not go beyond providing means of escape from the situation which the introduction of democracy in India has created for the British, and wholly disregards the communal problem by leaving it where it was.

Thus it is clear that, in so far as real federation is concerned, the Simon Report virtually negatives the principle of federation in its true significance. The Nehru Report realizing Hindu majority in the Central Assembly reaches a unitary form of government because such an institution secures Hindu dominance throughout India ; the Simon Report retains the present British dominance behind the thin veneer of an unreal federation, partly because the British are naturally unwilling to part with the power they have so long wielded, and partly because it is possible for them, in the absence of an intercommunal understanding in India, to make out a plausible case for the retention of that power in their own hands. To my mind a unitary form of government is simply unthinkable in a self-governing India. What is called 'residuary powers' must be left entirely to self-governing states, the Central Federal State exercising only those powers which are expressly vested in it by the free consent of federal states. I would never advise the Muslims of India to agree to a system, whether of British or of Indian origin, which virtually nega-

that they desire is that this authority should become fully responsible to the Central Legislature which they maintain intact, and where their majority will become further reinforced on the nominated element ceasing to exist. The Pandits of England, on the other hand, realizing that democracy in the centre tends to work contrary to their interests, and is likely to absorb the whole power now in their hands, in case a further advance is made towards responsible government, have shifted the experiment of democracy from the centre to the provinces. No doubt, they introduce the principle of federation and appear to have made a beginning by making certain proposals, yet their evaluation of this principle is determined by considerations wholly different to those which determine its value in the eyes of Muslim India. The Muslims demand federation because it is pre-eminently a solution of India's most difficult problem i.e. the communal problem. The Royal Commissioners' view of federation, though sound in principle, does not seem to aim at responsible government for federal states. Indeed it does not go beyond providing means of escape from the situation which the introduction of democracy in India has created for the British, and wholly disregards the communal problem by leaving it where it was.

Thus it is clear that, in so far as real federation is concerned, the Simon Report virtually negatives the principle of federation in its true significance. The Nehru Report realizing Hindu majority in the Central Assembly reaches a unitary form of government because such an institution secures Hindu dominance throughout India; the Simon Report retains the present British dominance behind the thin veneer of an unreal federation, partly because the British are naturally unwilling to part with the power they have so long wielded, and partly because it is possible for them, in the absence of an inter-communal understanding in India, to make out a plausible case for the retention of that power in their own hands. To my mind a unitary form of

tives the principle of true federation, or fails to recognize them as a distinct political entity.

FEDERAL SCHEME AS DISCUSSED IN THE ROUND TABLE CONFERENCE.

The necessity for a structural change in the Central Government was seen probably long before the British discovered the most effective means for introducing this change. That is why at rather a late stage it was announced that the participation of the Indian Princes in the Round Table Conference was essential. It was a kind of surprise to the people of India, particularly the minorities, to see the Indian Princes dramatically expressing their willingness at the Round Table Conference to join an All-India Federation, and, as a result of their declaration, Hindu delegates—uncompromising advocates of a unitary form of government—quietly agreeing to the evolution of a federal scheme. Even Mr. Sastri who, only a few days before, had severely criticised Sir John Simon for recommending a federal scheme for India, suddenly became a convert and admitted his Conversion in the plenary session of the Conference—thus offering the Prime Minister of England an occasion for one of his wittiest observations in his concluding speech. All this has a meaning both for the British who have sought the participation of the Indian Princes, and the Hindus who have unhesitatingly accepted the evolution of an All-India Federation. The truth is that the participation of the Indian Princes—among whom only a few are Muslims—in a federation scheme serves a double purpose. On the one hand it serves as an all-important factor in maintaining the British power in India practically as it is, on the other hand it gives overwhelming majority to the Hindus in an All-India Federal Assembly. It appears to me that the Hindu-Muslim differences regarding the ultimate form of the Central Government are being cleverly exploited by British politicians through the agency of the Princes who see in the scheme prospects of better security for their despotic rule. If the Muslims silently agree to any such scheme it will simply hasten their end as a political entity in India. The policy of the Indian Federation, thus created, will be practically controlled by Hindu Princes forming the largest group in the Central Federal Assembly. They will always lend their support to the Crown in matters of Imperial concern; and in so far as internal administration of the country is concerned they will

Government is simply unthinkable in a self-governing India. What is called 'residuary powers' must be left entirely to self-governing states, the Central Federal State exercising only those powers which are expressly vested in it by the free consent of federal states. I would never advise the Muslims of India to agree to a system, whether of British or of Indian origin, which virtually negatives the principle of true federation, or fails to recognize them as a distinct political entity.

Federal Scheme as discussed in the Round Table Conference

The necessity for a structural change in the Central Government was seen probably long before the British discovered the most effective means for introducing this change. That is why at a rather late stage it was announced that the participation of the Indian Princes in the Round Table Conference was essential. It was a kind of surprise to the people of India, particularly the minorities, to see the Indian Princes dramatically expressing their willingness at the Round Table Conference to join an All-India Federation and, as a result of their declaration, Hindu delegates - uncompromising advocates of a unitary form of government – quietly agreeing to the evolution of a federal scheme. Even Mr. Sastri who, only a few days before, had severely criticised Sir John Simon for recommending a federal scheme for India, suddenly became a convert and admitted his conversion in the plenary session of the Conference – thus offering the Prime Minister of England an occasion for one of his wittiest observations in his concluding speech. All this has a meaning both for the British who have sought the participation of the Indian Princes, and the Hindus who have unhesitatingly accepted the evolution of an All-India Federation. The truth *is that the participation* of the Indian Princes – among whom only a few are Muslims – in a federation scheme serves a double purpose. On the one hand it serves as an all important factor in maintaining the British power in India practically

help in maintaining and strengthening the supremacy of the Hindus. In other words the scheme appears to be aiming at a kind of understanding between Hindu India and British Imerialism—you perpetuate me in India, and I in return give you a Hindu oligarchy to keep all other Indian communities in perpetual subjection. If therefore the British Indian provinces are not transformed into really autonomous states, the Princes' participation in a scheme of Indian federation will be interpreted only as a dexterous move on the part of British politicians to satisfy, without parting with any real power, all parties concerned—Muslims with the *word* federation, Hindus with a majority in the centre, and British Imperialists—whether Tory or Labourite—with the *substance* of real power.

The number of Hindu states in India is far greater than Muslim states; and it remains to be seen how the Muslim demand for 33 per cent seats in the Central Federal Assembly is to be met with in a House or Houses constituted of representatives taken from British India as well as Indian states. I hope the Muslim delegates are fully aware of the implications of the federal scheme as discussed in the Round Table Conference. The question of Muslim representation in the proposed All-India Federation has not yet been discussed. "The interim report, says Reuter's summary, "contemplates two chambers in the Federal Legislature—each containing representatives both of British India and States, the proportion of which will be a matter of subsequent consideration under the heads which have not yet been referred to the Sub-Committee." In my opinion the question of proportion is of the utmost importance, and ought to have been considered simultaneously with the main question of the structure of the Assembly.

The best course, I think, would have been to start with a British Indian Federation only. A federal scheme born of an unloly union between democracy and despotism cannot but keep British India in the same vicious circle of a unitary Central Government. Such a unitary form may be of the greatest advantage to the British, to the majority community in British India and to the Indian Princes; it can be of no advantage to the Muslims unless they get majority rights in five out of eleven Indian Provinces with full residuary powers, and one-third share of seats in the total house of the Federal Assembly. In so far as the attainment of sovereign powers by the British Indian Provinces is concerned the position of H. H. the Ruler of Bhopal, Sir Akbar Hydari and Mr. Jinnah is unassailable. In view, however, of the parti-

as it is, on the other hand it gives overwhelming majority to the Hindus in an All-India Federal Assembly. It appears to me that the Hindu-Muslim differences regarding the ultimate form of the Central Government are being cleverly exploited by British politicians through the agency of the Princes who see in the scheme prospects of better security for their despotic rule. If the Muslims silently agree to any such scheme it will simply hasten their end as a political entity in India. The policy of the Indian Federation, thus created, will be practically controlled by Hindu Princes forming the largest group in the Central Federal Assembly. They will always lend their support to the Crown in matters of Imperial concern; and in so far as internal administration of the country is concerned they will help in maintaining and strengthening the supremacy of the Hindus. In other words the scheme appears to be aiming at a kind of understanding between Hindu India and British Imperialism – you perpetuate me in India, and I in return give you a Hindu oligarchy to keep all other Indian communities in perpetual subjection. If therefore the British Indian provinces are not transformed into really autonomous states, the Princes' participation in a scheme of Indian federation will be interpreted only as a dexterous move on the part of British politicians to satisfy, without parting with any real power, all parties concerned – Muslims with the word federation, Hindus with a majority in the centre, and British Imperialists – whether Tory or Labourite – with the substance of real power.

The number of Hindu States in India is far greater than Muslim states; and it remains to be seen how the Muslim demand for 33 per cent seats in the Central Federal Assembly is to be met within a House or Houses constituted of representatives taken from British India as well as Indian states. I hope the Muslim delegates are fully aware of the implications of the federal scheme as discussed in the Round Table Conference. The question of Muslim representation in the proposed All-India Federation has not yet been

cipation of the Princes in the Indian Federation we must now see our demand for representation in the British Indian Assembly in a new light. The question is not one of Muslim share in a British Indian Assembly, but one which relates to representation of British Indian Muslims in an All-India Federal Assembly. Our demand for 33 per cent must now be taken as a demand for the same proportion in the All-India Federal Assembly exclusive of the share allotted to the Muslim states entering the Federation.

THE PROBLEM OF DEFENCE.

The other difficult problem which confronts the successful working of a federal system in India is the problem of India's defence. In their discussion of this problem the Royal Commissioners have marshalled all the deficiencies of India in order to make out a case for Imperial administration of the army. "India and Britain," say the Commissioners, "are so related that India's defence cannot *now or in any future which is within sight,* be regarded as a matter of purely Indian concern. The control and direction of such an army must rest in the hands of agents of the Imperial Government. Now, does it necessarily follow from this that further progress towards the realization of responsible Government in British India is barred until the work of defence can be adequately discharged without the help of British officers and British troops? *As things are, there is a block on the line of constitutional advance.* All hopes of evolution in the Central Government towards the ultimate goal described in the declaration of 20th August 1917 are in danger of being indefinitely frustrated if the attitude illustrated by the Nehru Report is maintained that any future change involves the putting of the administration of the army under the authority of an elected Indian Legislature." Further to fortify their argument they emphasize the fact of competing religions and rival races of widely different capacity, and try to make the problem look insoluble by remarking that "the obvious fact, that India is not, in the ordinary and natural sense, a single nation is nowhere made more plain than in considering the difference between the martial races of India and the rest." These features of the question have been emphasized in order to demonstrate that the British are not only keeping India secure from foreign menace but are also the "neutral guardians" of internal security. However, in federated India, as I understand federation, the problem will have

discussed. "The interim report," says Reuter's summary, "contemplates two chambers in the Federal Legislature – each containing representatives both of British India and States, the proportion of which will be a matter of subsequent consideration under the heads which have not yet been referred to the Sub-Committee." In my opinion the question of proportion is of the utmost importance, and ought to have been considered simultaneously with the main question of the structure of the Assembly.

The best course, I think, would have been to start with a British Indian Federation only. A federal scheme born of an unholy union between democracy and despotism cannot but keep British India in the same vicious circle of a unitary Central Government. Such a unitary form may be of the greatest advantage to the British, to the majority community in British India and to the Indian Princes; it can be of no advantage to the Muslims unless they get majority rights in five out of eleven Indian Provinces with full residuary powers, and one-third share of seats in the total House of the Federal Assembly. In so far as the attainment of sovereign powers by the British Indian Provinces is concerned the position of H. H. the Ruler of Bhopal, Sir Akbar Hydari and Mr. Jinnah is unassailable. In view, however, of the participation of the Princes in the Indian Federation we must now see our demand for representation in the British Indian Assembly in a new light. The question is not one of Muslim share in a British Indian Assembly, but one which relates to representation of British Indian Muslims in an All-India Federal Assembly. Our demand for 33 per cent must now be taken as a demand for the same proportion in the All-India Federal Assembly exclusive of the share allotted to the Muslim states entering the Federation.

The Problem of Defence

The other difficult problem which confronts the successful working of a federal system in India is the problem of India's defence. In their discussion of this problem

only one aspect, *i. e.* external defence. Apart from provincial armies necessary for maintaining internal peace, the Indian Federal Congress can maintain, on the North-West Frontier, a strong Indian Frontier Army, composed of units recruited from all provinces and officered by efficient and experienced military men taken from all communities. I know that India is not in possession of efficient military officers, and this fact is exploited by the Royal Commissioners in the interest of an argument for Imperial administration. On this point I cannot but quote another passage from the Report which, to my mind, furnishes the best argument against the position taken up by the Commissioners. "At the present moment," says the Report, "no Indian holding the King's Commission is of higher army rank than a captain. There are, we believe, 39 captains of whom 25 are in ordinary regimental employ. Some of them are of an age which would prevent their attaining much higher rank, even if they passed the necessary examination before retirement. Most of these have not been through Sandhurst, but got their Commissions during the Great War. Now, however genuine may be the desire, and however earnest the endeavour to work for this transformation the overriding conditions so forcibly expressed by the Skeen Committee (whose members, apart from the Chairman and the Army Secretary, were Indian gentlemen) in the words, "Progress . . . must be contingent upon success being secured at each stage and upon military efficiency being maintained through must in any case render such development measured and slow. A higher command cannot be evolved at short notice out of existing cadres of Indian officers, all of junior rank and limited experience. Not until the slender trickle of suitable Indian recruits for the officer class—and we earnestly desire an increase in their numbers—flows in much greater volume, not until sufficient Indians have attained the experience and training requisite to provide all the officers for, at any rate, some Indian regiments, not until such units have stood the only test which can possibly determine their efficiency, and not until Indian officers have qualified by a successful army career for high command, will it be possible to develope the policy of Indianisation to a point which will bring a completely Indianised army within sight. Even then years must elapse before the process could be completed."

Now I venture to ask who is responsible for the present state of things? Is it due to some inherent incapacity of our martial races, or to the slowness of the process of military

the Royal Commissioners have marshalled all the deficiencies of India in order to make out a case for Imperial administration of the army. "India and Britain," say the Commissioners, "are so related that India's defence cannot *now or in any future which is within sight,* be regarded as a matter of purely Indian concern. The control and direction of such an army must rest in the hands of agents of the Imperial Government. Now, does it necessarily follow from this that further progress towards the realization of responsible Government in British India is barred until the work of defence can be adequately discharged without the help of British officers and British troops? *As things are, there is a block on the line of constitutional advance.* All hopes of evolution in the Central Government towards the ultimate goal described in the declaration of 20th August 1917 are in danger of being indefinitely frustrated if the attitude illustrated by the Nehru Report is maintained that any future change involves the putting of the administration of the army under the authority of an elected Indian Legislature." Further to fortify their argument they emphasise the fact of competing religions and rival races of widely different capacity, and try to make the problem look insoluble by remarking that "the obvious fact, that India is not, in the ordinary and natural sense, a single nation is nowhere made more plain than in considering the difference between the martial races of India and the rest." These features of the question have been emphasised in order to demonstrate that the British are not only keeping India secure from foreign menace but are also the "neutral guardians of internal security." However, in federated India, as I understand federation, the problem will have only one aspect, i.e. external defence. Apart from provincial armies necessary for maintaining internal peace, the Indian Federal Congress can maintain, on the North-West Frontier, a strong Indian Frontier Army, composed of units recruited from all provinces and officered by efficient and experienced military men taken from all communities. I know that India is not in possession of efficient military officers, and this fact

training ; The military capacity of our martial races is undeniable. The process of military training may be slow as compared to other processes of human training. I am no military expert to judge this matter. But as a layman I feel that the argument, as stated, assumes the process to be practically endless. This means perpetual bondage for India, and makes it all the more necessary that the Frontier Army, as suggested by the Nehru Report, be entrusted to the charge of a committee of defence the personnel of which may be settled by mutual understanding.

Again it is significant that the Simon Report has given extraordinary importance to the question of India's land frontier, but has made only passing references to its naval position. India has doubtless had to face invasions from her land frontier ; but it is obvious that her present masters took possession of her on account of her defenceless sea coast. A self-governing and free India, will, in these days, have to take greater care of her sea coast than land frontiers.

I have no doubt that if a Federal Government is established, Muslim federal states will willingly agree, for purposes of India's defence, to the creation of neutral Indian military and naval forces. Such a neutral military force for the defence of India was a reality in the days of Mughal Rule. Indeed in the time of Akbar the Indian frontier was, on the whole, defended by armies officered by Hindu generals. I am perfectly sure that the scheme of a neutral Indian army, based on a federated India, will intensify Muslim patriotic feeling, and finally set at rest the suspicion, if any, of Indian Muslims joining Muslims from beyond the frontier in the event of an invasion.

THE ALTERNATIVE.

I have thus tried briefly to indicate the way in which the Muslims of India ought, in my opinion, to look at the two most important constitutional problems of India. A redistribution of British India, calculated to secure a permanent solution of the communal problem, is the main demand of the Muslims of India. If, however, the Muslim demand of a territorial solution of the communal problem is ignored, then I support, as emphatically as possible, the Muslim demands repeatedly urged by the All-India Muslim League and the All-India Muslim Conference. The Muslims of India cannot agree to any constitutional changes which affect their majority rights, to be secured by

is exploited by the Royal Commissioners in the interest of an argument for Imperial administration. On this point I cannot but quote another passage from the Report which, to my mind, furnishes the best argument against the position taken up by the Commissioners. "At the present moment," says the Report, "no Indian holding the King's Commission is of higher army rank than a captain. There are, we believe, 39 captains of whom 25 are in ordinary regimental employ. Some of them are of an age which would prevent their attaining much higher rank, even if they passed the necessary examination before retirement. Most of these have not been through Sandhurst, but got their Commissions during the Great War. Now, however genuine may be the desire, and however earnest the endeavour to work for this transformation the overriding conditions so forcibly expressed by the Skeen Committee (whose members, apart from the Chairman and the Army Secretary, were Indian gentlemen) in the words, "Progress... must be contingent upon success being 'secured at each stage and upon military efficiency being maintained throughout must in any case render such development measured and slow. A higher command cannot be evolved at short notice out of existing cadres of Indian officers, all of junior ranks and limited experience. Not until the slender trickle of suitable Indian recruits for the officer class – and we earnestly desire an increase in their numbers – flows in much greater volume, not until sufficient Indians have attained the experience and training requisite to provide all the officers for, at any rate, some Indian regiments, not until such units have stood the only test which can possibly determine their efficiency, and not until Indian officers have qualified by a successful army career for high command, will it be possible to develop the policy of Indianisation to a point which will bring a completely Indianised army within sight. Even then years must elapse before the process could be completed."

separate electorates, in the Punjab and Bengal, or fail to guarantee them 33 percent representation in any Central Legislature. There were two pitfalls into which Muslim political leaders fell. The first was the repudiated Lucknow Pact which originated in a false view of Indian nationalism, and deprived the Muslims of India from chances of acquiring any political power in India. The second is the narrow-visioned sacrifice of Islamic solidarity in the interests of what may be called Punjab Ruralism resulting in a proposal which virtually reduces the Punjab Muslims to a position of minority. It is the duty of the League to condemn both the Pact and the proposal.

The Simon Report does great injustice to the Muslims in not recommending a statutory majority for the Punjab and Bengal. It would either make the Muslims stick to the Lucknow Pact or agree to a scheme of joint electorates. The despatch of the Government of India on the Simon Report admits that since the publication of that document the Muslim community has not expressed its willingness to accept any of the alternatives proposed by the Report. The despatch recognizes that it may be a legitimate grievance to deprive the Muslims in the Punjab and Bengal of representation in the councils in proportion to their population merely because of weightage allowed to Muslim minorities elsewhere. But the despatch of the Government of India fails to correct the injustice of the Simon Report. In so far as the Punjab is concerned—and this is the most crucial point—it endorses the so-called 'carefully balanced scheme' worked out by the official members of the Punjab Government which gives the Punjab Muslims a majority of two over Hindus and Sikhs combined, and a proportion of 49 per cent of the House as a whole. It is obvious that the Punjab Muslims cannot be satisfied with less than a clear majority in the total House. However, Lord Irwin and his Government do recognize that the justification for communal electorates for majority communities would not cease unless and until by the extension of franchise their voting strength more correctly reflects their population; and further unless a two-third majority of the Muslim members in a provincial council unanimously agree to surrender the right of separate representation. I cannot, however, understand why the Government of India, having recognized the legitimacy of the Muslim grievance, have not had the courage to recommend a statutory majority for the Muslims in the Punjab and Bengal.

Now I venture to ask who is responsible for the present state of things ? Is it due to some inherent incapacity of our martial races or to the slowness of the process of military training? The military capacity of our martial races is undeniable. The process of military training may be slow as compared to other processes of human training. I am no military expert to judge this matter. But as a layman I feel that the argument, as stated, assumes the process to be practically endless. This means perpetual bondage for India, and makes it all the more necessary that the Frontier Army, as suggested by the Nehru Report, be entrusted to the charge of a committee of defence the personnel of which may be settled by mutual understanding.

Again it is significant that the Simon Report has given extraordinary importance to the question of India's land frontier, but has made only passing references to its naval position. India has doubtless had to face invasions from her land frontier; but it is obvious that her present masters took possession of her on account of her defenceless sea coast. A self-governing and free India, will, in these days have to take greater care of her sea coast than her land frontiers.

I have no doubt that if a Federal Government is established, Muslim federal states will willingly agree, for purposes of India's defence, to the creation of neutral Indian military and naval forces. Such a neutral military force for the defence of India was a reality in the days of Mughal Rule. Indeed in the time of Akbar the Indian frontier was, on the whole, defended by armies officered by Hindu generals. I am perfectly sure that the scheme of a neutral Indian army, based on a federated India, will intensify Muslim patriotic feeling, and finally set at rest the suspicion, if any, of Indian Muslims joining Muslims from beyond the frontier in the event of any invasion.

Nor can the Muslims of India agree to any such changes which fail to create at least Sind as a separate province, and treat the North-West Frontier Province as a province of inferior political status. I see no reason why Sind should not be united with Baluchistan and turned into a separate province. It has nothing in common with the Bombay Presidency. In point of life and civilization the Royal Commissioners find it more akin to Mesopotamia and Arabia than India. The Muslim geographer Mas'udi noticed this kinship long ago when he said—"Sind is a country *nearer* to the dominions of Islam." The first Omayyad ruler is reported to have said of Egypt—"Egypt has her back towards Africa and face towards Arabia." With necessary alterations the same remark describes the exact situation of Sind. She has her back towards India and face towards Central Asia. Considering further the nature of her agricultural problems which can invoke no sympathy from the Bombay Government, and her infinite commercial possibilities, dependent on the inevitable growth of Karachi into a second metropolis of India, it is unwise to keep her attached to a Presidency which, though friendly to-day, is likely to become a rival at no distant period. Financial difficulties, we are told, stand in the way of separation. I do not know of any definite authoritative pronouncement on the matter. But assuming there are any such difficulties, I see no reason why the Government of India should not give temporary financial help to a promising province in her struggle for independent progress.

As to the North-West Frontier Province it is painful to note that the Royal Commissioners have practically denied that the people of this province have any right to reform. They fall far short of the Bray Committee, and the council recommended by them is merely a screen to hide the autocracy of the Chief Commissioner. The inherent right of the Afghan to light a cigarette is curtailed merely because he happens to be living in a powder house. The Royal Commissioners epigrammatic argument is pleasant enough, but far from convincing. Political reform is light, not fire; and to light every human being is entitled whether he happens to live in a powder house or a coal mine. Brave, shrewd and determined to suffer for his legitimate aspirations, the Afghan is sure to resent any attempt to deprive him of opportunities of full self-development. To keep such a people contented is in the best interest of both England and India. What has recently happened in that unfortunate province is the result of a step-motherly treatment shown to the people since the introduction of the

The Alternative

I have thus tried briefly to indicate the way in which the Muslims of India ought, in my opinion, to look at the two most important constitutional problems of India. A redistribution of British India, calculated to secure a permanent solution of the communal problem, is the main demand of the Muslims of India. If, however, the Muslim demand of a territorial solution of the communal problem is ignored, then I support, as emphatically as possible, the Muslim demands repeatedly urged by the All India Muslim League and the All India Muslim Conference. The Muslims of India cannot agree to any constitutional changes which affect their majority rights, to be secured by separate electorates, in the Punjab and Bengal, or fail to guarantee them 33 per cent representation in any Central Legislature. There were two pitfalls into which Muslim political leaders fell. The first was the repudiated Lucknow Pact which originated in a false view of Indian nationalism, and deprived the Muslims of India from chances of acquiring any political power in India. The second is the narrow-visioned sacrifice of Islamic solidarity in the interest of what may be called Punjab Ruralism resulting in a proposal which virtually reduces the Punjab Muslims to a position of minority. It is the duty of the League to condemn both the Pact and the proposal.

The Simon Report does great injustice to the Muslims in not recommending a statutory majority for the Punjab and Bengal. It would either make the Muslims stick to the Lucknow Pact or agree to a scheme of joint electorates. Despatch of the Government of India on the Simon Report admits that since the publication of that document the Muslim community has not expressed its willingness to accept any of the alternatives proposed by the Report. The despatch recognizes that it may be a legitimate grievance to deprive the Muslims in the Punjab and Bengal of representation in the councils in proportion to their population merely because of weightage allowed to

principle of Self-government in the rest of India. I only hope that British statesmanship will not obscure its view of the situation by hoodwinking itself into the belief that the present unrest in the province is due to any extraneous causes.

The recommendation for the introduction of a measure of reform in the N.W.F.P. made in the Government of India's despatch is also unsatisfactory. No doubt the despatch goes further than the Simon Report in recommending a sort of representative Council and a semi-representative cabinet, but it fails to treat this important Muslim province on equal footing with other Indian Provinces. Indeed the Afghan is, by instinct, more fitted for democratic institutions than any other people in India.

ROUND TABLE CONFERENCE.

I think I am now called upon to make a few observations on the Round Table Conference. Personally, I do not feel optimistic as to the results of this Conference. It was hoped that away from the actual scene of communal strife, and in a changed atmosphere better counsels would prevail, and a genuine settlement of the differences between the two major communities of India would bring India's freedom within sight. Actual events, however, tell a different tale. Indeed the discussion of the communal question in London has demonstrated more clearly than ever the essential disparity between the two great cultural units of India. Yet the Prime Minister of England apparently refuses to see that the problem of India is international and not national. He is reported to have said that "his Government would find it difficult to submit to Parliament proposals for the maintenance of separate electorates, since joint electorates were much more in accordance with British democratic sentiments." Obviously he does not see that the model of British democracy cannot be of any use in a land of many nations; and that a system of separate electorates is only a poor substitute for a territorial solution of the problem. Nor is the Minorities Sub-Committee likely to reach a satisfactory settlement The whole question will have to go before the British Parliament; and we can only hope that the keen-sighted representatives of the British nation, unlike most of our Indian politicians, will be able to pierce through the surface of things and see clearly the true fundamentals of peace and security in a country like India. To base a con-

Muslim minorities elsewhere. But the despatch of the Government of India fails to correct the injustice of the Simon Report. In so far as the Punjab is concerned – and this is the most crucial point – it endorses the so-called 'carefully balanced scheme' worked out by the official members of the Punjab Government which gives the Punjab Muslims a majority of two over the Hindus and Sikhs combined, and a proportion of 49 per cent of the Houses as a whole. It is obvious that the Punjab Muslims cannot be satisfied with less than a clear majority in the total House. However, Lord Irwin and his Government do recognize that the justification for communal electorates for majority communities would not cease unless a two-third majority of the Muslim members in a provincial council unanimously agree to surrender the right of separate representation. I cannot however understand why the Government of India, having recognized the legitimacy of Muslim grievance, have not had the courage to recommend a statutory majority for the Muslims in the Punjab and Bengal.

Nor can the Muslims of India agree to any such changes which fail to create at least Sind as a separate province and treat the North-West Frontier Province as a province of inferior political status. I see no reason why Sind should not be united with Baluchistan and turned into a separate province. It has nothing in common with the Bombay Presidency. In point and civilization the Royal Commissioners find it more akin to Mesopotamia and Arabia than India. The Muslim geographer Mas'udi noticed this kinship long ago when he said, "Sind is a country nearer to the dominions of Islam." The first Omayyad ruler is reported to have said of Egypt:

"Egypt has her back towards Africa and face towards Arabia." With necessary alterations the same remark describes the exact situation of Sind. She has her back towards India and face towards Central Asia. Considering further the nature of her agricultural problems which can invoke no sympathy from the Bombay Government, and her infinite

stitution on the concept of a homogeneous India, or to apply to India principles dictated by British democratic sentiments, is unwittingly to prepare her for a civil war. As far as I can see, there will be no peace in the country until the various peoples that constitute India are given opportunities of free self-development on modern lines without abruptly breaking with their past.

I am glad to be able to say that our Muslim delegates fully realize the importance of a proper solution of what I call Indian international problem. They are perfectly justified in pressing for a solution of the communal question before the question of responsibility in the Central Government is finally settled. No Muslim politician should be sensitive to the taunt embodied in that propaganda word—communalism—expressly devised to exploit what the Prime Minister calls British democratic sentiments, and to mislead England into assuming a state of things which does not really exist in India. Great interests are at stake. We are seventy millions, and far more homogeneous than any other people in India. Indeed the Muslims of India are the only Indian people who can fitly be described as a nation in the modern sense of the word. The Hindus, though ahead of us in almost all respects, have not yet been able to achieve the kind of homogeneity which is necessary for a nation, and which Islam has given you as a free gift. No doubt they are anxious to become a nation but the process of becoming a nation is a kind of travail, and in the case of Hindu India, involves a complete overhauling of her social structure. Nor should the Muslim leaders and politicians allow themselves to be carried away by the subtle but fallacious argument that Turkey and Persia and other Muslim countries are progressing on national, *i. e.* territorial lines. The Muslims of India are differently situated. The countries of Islam outside India are practically wholly Muslim in population. The minorities there belong, in the language of the Quran, to the 'people of the Book.' There are no social barriers between Muslims and the 'people of the Book.' A Jew or a Christian or a Zoroastrian does not pollute the food of a Muslim by touching it, and the Law of Islam allows intermarriage with the 'people of the Book. Indeed the first practical step that Islam took towards the realization of a final combination of humanity was to call upon peoples possessing practically the same ethical ideal to come forward and combine. The Quran declares, "O people of the Book ! Come let us join together on the 'word' *(Unity of God), that is common* to us all." The wars of

commercial possibilities, dependent on the inevitable growth of Karachi into a second metropolis of India, it is unwise to keep her attached to a Presidency which, though friendly today, is likely to become a rival at no distant period. Financial difficulties, we are told, stand in the way of separation. I do not know of any definite authoritative pronouncement on the matter. But, assuming there are any such difficulties, I see no reason why the Government of India should not give temporary financial help to a promising province in her struggle for independent progress.

As to the North-West Frontier Province, it is painful to note that the Royal Commissioners have practically denied that the people of this province have any right to. Reform. They fall far short of the Bray Committee, and the council recommended by them is merely a screen to hide the autocracy of the Chief Commissioner. The inherent right of the Afghan to light a cigarette is curtailed merely because he happens to be living, in a powder house. The Royal Commissioners' epigrammatic argument is pleasant enough, but far from convincing. Political reform is light, not fire; and to light every human being is entitled whether he happens to live in a powder house or a coal mine. Brave, shrewd and determined to suffer for his legitimate aspirations, the Afghan is sure to resent any attempt to deprive him of opportunities of full self-development. To keep such a people contented is in the best interest of both England and India. What has recently happened in that unfortunate province is the result of a step-motherly treatment shown to the people since the introduction of the principle of self-government in the rest of India. I only hope that the British statesmanship will not obscure its view of the situation by hoodwinking itself into the belief that the present unrest in the province is due to any extraneous causes.

The recommendation for the introduction of a measure of reform in the N.W.F.P. made in the Government of India's despatch is also unsatisfactory. No doubt the

How shall we, then, remedy these two evils? The remedy of the first evil is not in our hands. As to the second evil I think it is possible to discover a remedy. I have got definite views on the subject; but I think it is proper to postpone their expression till the apprehended situation actually arises. In case it does arise leading Muslims of all shades of opinion will have to meet together, not to pass resolutions, but finally to determine the Muslim attitude and to show the path to tangible achievement. In this address I mention this alternative only because I wish that you may keep it in mind, and give some serious thought to it in the meantime.

THE CONCLUSION.

Gentlemen, I have finished. In concluson I cannot but impress upon you that the present crisis in the history of India demands complete organisation and unity of will and purpose in the Muslim community, both in your own interest as a community, and in the interest of India as a whole. The political bondage of India has been and is a source of infinite misery to the whole of Asia. It has suppressed the spirit of the East, and wholly deprived her of that joy of self-expression which once made her the creator of a great and glorious culture. We have a duty towards India where we are destined to live and die. We have a duty towards Asia, especially Muslim Asia. And since seventy millions of Muslims in a single country constitute a far more valuable asset to Islam than all the countries of Muslim Asia put together, we must look at the Indian problem not only from the Muslim point of view but also from the standpoint of the Indian Muslim as such. Our duty towards Asia and India cannot be loyally performed without an organised will fixed on a definite purpose. In your own interest, as a political entity among other political entities of India, such an equipment is an absolute necessity. Our disorganised condition has already confused political issues vital to the life of the community. I am not hopeless of an intercommunal understanding, but I cannot conceal from you the feeling that in the near future our community may be called upon to adopt an independent line of action to cope with the present crisis. And an independent line of political action, in such a crisis, is possible only to a determined people, possessing a will focalised by a single purpose. Is it possible for you to achieve the organic wholeness of a unified will? Yes, it is. Rise above sectional

despatch goes further than the Simon Report in recommending a sort of representative Council and a semi-representative cabinet, but it fails to treat this important Muslim province on an equal footing with the other Indian Provinces. Indeed the Afghan is, by instinct, more fitted for democratic institutions than any other people in India.

Round Table Conference

I think I am now called upon to make a few observations on the Round Table Conference. Personally, I do not feel optimistic as to the results of this conference. It was hoped that away from the actual scene of the communal strife, and in a changed atmosphere, better councils would prevail; and a genuine settlement of the differences between the two major communities of India would bring India's freedom within sight. Actual events, however, tell a different tale. Indeed the discussion of the communal question in London has demonstrated, more clearly than ever, the essential disparity between the two great cultural units of India. Yet the Prime Minister of England apparently refuses to see that the problem of India is international and not national. He is reported to have said that "his Government would find it difficult to submit to Parliament proposals for the maintenance of separate electorates, since joint electorate were much more in accordance with British democratic sentiments." Obviously he did not see that the model of British democracy cannot be of any use in a land of many nations; and that a system of separate electorates is only a poor substitute for a territorial solution of the problem. Nor is the Minorities Sub-Committee likely to reach a satisfactory settlement. The whole question will have to go before the British Parliament; and we can only hope that the keen sighted representatives of the British nation, unlike most of our Indian politicians will be able to pierce through the surface of things and see clearly the true fundamentals of peace and security in a country like India. To base a constitution on the concept of a homogenous India, or

How shall we, then, remedy these two evils? The remedy of the first evil is not in our hands. As to the second evil I think it is possible to discover a remedy. I have got definite views on the subject ; but I think it is proper to postpone their expression till the apprehended situation actually arises. In case it does arise leading Muslims of all shades of opinion will have to meet together, not to pass resolutions, but finally to determine the Muslim attitude and to show the path to tangible achievement. In this address I mention this alternative only because I wish that you may keep it in mind, and give some serious thought to it in the meantime.

THE CONCLUSION.

Gentlemen, I have finished. In concluson I cannot but impress upon you that the present crisis in the history of India demands complete organisation and unity of will and purpose in the Muslim community, both in your own interest as a community, and in the interest of India as a whole. The political bondage of India has been and is a source of infinite misery to the whole of Asia. It has suppressed the spirit of the East, and wholly deprived her of that joy of self-expression which once made her the creator of a great and glorious culture. We have a duty towards India where we are destined to live and die. We have a duty towards Asia, especially Muslim Asia. And since seventy millions of Muslims in a single country constitute a far more valuable asset to Islam than all the countries of Muslim Asia put together, we must look at the Indian problem not only from the Muslim point of view but also from the standpoint of the Indian Muslim as such. Our duty towards Asia and India cannot be loyally performed without an organised will fixed on a definite purpose. In your own interest, as a political entity among other political entities of India, such an equipment is an absolute necessity. Our disorganised condition has already confused political issues vital to the life of the community. I am not hopeless of an intercommunal understanding, but I cannot conceal from you the feeling that in the near future our community may be called upon to adopt an independent line of action to cope with the present crisis. And an independent line of political action, in such a crisis, is possible only to a determined people, possessing a will focalised by a single purpose. Is it possible for you to achieve the organic wholeness of a unified will ? Yes, it is. Rise above sectional

to apply to India principles dictated by British democratic sentiments, is unwittingly to prepare her for a civil war. As far as I can see, there will be no peace in the country until the various people that constitute India are given opportunities of free self-development on modern lines without abruptly breaking with their past.

I am glad to be able to say that our Muslim delegates fully realize the importance of a proper solution of what I call India's international problem. They are perfectly justified in pressing for a solution of the communal question before the question of responsibility in the Central Government is finally settled. No Muslim politician should be sensitive to the taunt embodied in that propaganda word – communalism – expressively devised to exploit what the Prime Minister calls the British democratic sentiment, and to mislead England into assuming a state of things which does not really exist in India. Great interests are at stake. We are seventy million, and far more homogenous that any other people in India. Indeed, the Muslims of India are the only Indian people who can fitly be described as a nation in the modern sense of the word. The Hindus, though ahead of us in almost all respects, have not yet been able to achieve the kind of homogeneity which is necessary for a nation and which Islam has given you as a free gift. No doubt they are anxious to become a nation but the process of becoming a nation is a kind of travail, and in the case of Hindu India, involves a complete overhauling of her social structure. Nor should the Muslim leaders and politicians allow themselves to be carried away by the subtle but fallacious argument that Turkey and Persia and other Muslim countries are progressing on national i.e. lines. The Muslims of India are differently situated. The countries of Islam outside India are practically wholly Muslim in population. The minorities there belong, in the language of the Quran, to the 'people of the Book. There are no social barriers between Muslims and the 'people of the Book.' A Jew or Christian or a Zoroastrian does not pollute the food

interests and private ambitions, and learn to determine the value of your individual and collective action, however directed on material ends, in the light of the ideal which you are supposed to represent. Pass from matter to spirit. Matter is diversity ; spirit is light, life and unity. One lesson I have learnt from the history of Muslims. At critical moments in their history it is Islam that has saved Muslims and not *vice versa*. If to to-day you focus your vision on Islam and seek inspiration from the ever-vitalising idea embodied in it, you will be only reassembling your scattered forces, regaining your lost integrity, and thereby saving yourself from total destruction. One of the profoundest verses in the Holy Quran teaches us that the birth and rebirth of the whole of humanity is like the birth and rebirth of a single individual. Why cannot you who, as a people, can well claim to be the first practical exponents of this superb conception of humanity, live and move and have your being as a single individual? I do not wish to mystify anybody when I say that things in India are not what they appears to be. The meaning of this, however, will dawn upon you only when you have achieved a real collective ego to look at them. In the words of the Quran, "Hold fast to yourself ; no one who erreth can hurt you, provided you are well-guided." (5 : 104).

———

Printed by Guran Ditta Kapur
at the Kapur Art Printing Works, Lahore.

of a Muslim by touching it, and the Law of Islam allows intermarriage with the 'people of the Book.' Indeed the first practical step that Islam took towards the realization of a final combination of humanity was to call upon peoples possessing practically the same ethical ideal to come forward and combine. The Quran declares, "O people of the Book! Come let us join together on the 'word' (Unity of God), that is common to us all." The wars of Islam and Christianity, and, later, European aggression in its various forms, could not allow the infinite meaning of this verse to work itself out in the world of Islam. Today it is being gradually being realized in the countries of Islam in the shape of what is called Muslim Nationalism.

It is hardly necessary for me to add that the soul test of the success of our delegates is the extent to which they are able to get the non-Muslim delegates of the Conference to agree to our demands as embodied in the Delhi Resolution. If these demands are not agreed to, then a question of a very great and far-reaching importance will arise for the community. Then will arrive the moment for an independent and concerted political action by the Muslims of India. If you are at all serious about your ideals and aspirations you must be ready for such an action. Our leading men have done a good deal of political thinking, and their thought has certainly made us, more or less, sensitive to the forces which are now shaping the destinies of peoples in India and outside India. But I ask, has this thinking prepared us for the kind of action demanded by the situation which may arise in the near future? Let me tell you frankly that, at the present moment, the Muslims of India are suffering from two evils. The first is the want of personalities. Sir Malcolm Hailey and Lord Irvin were perfectly correct in their diagnosis when they told the Aligarh University that the community had failed to produce leaders. By leaders I mean men who, by Divine gift or experience, possess a keen perception of the spirit and destiny of Islam, along with an equally keen perception of the trend of modern

history. Such men are really the driving forces of a people, but they are God's gift and cannot be made to order. The second evil from which the Muslims of India are suffering is that the community is fast losing what is called the herdinstinct. This makes it possible for individuals and groups to start independent careers without contributing to the general thought and activity of the community. We are doing today in the domain of politics what we have been doing for centuries in the domain of religion. But sectional bickerings in religion do not much harm to our solidarity. They at least indicate an interest in what makes the sole principle of our structure as a people. Moreover, this principle is so broadly conceived that it is almost impossible for a group to become rebellious to the extent of wholly detaching itself from the general body of Islam. But diversity in political action, at a moment when concerted action is needed in the best interest of the very life of our people, may prove fatal. How shall we, then, remedy these two evils? The remedy of the first evil is not in our hands. As to the second evil I think it is possible to discover a remedy. I have got definite views on the subject; but I think it is proper to postpone their expression till the apprehended situation actually arises. In case it does arise leading Muslims of all shades of opinion will have to meet together, not to pass resolutions, but finally to determine the Muslim attitude and to show the path to tangible achievement. In this address I mentioned this alternative only because I wish that you may keep it in mind, and give some serious thought to it in the meantime.

The Conclusion

Gentlemen, I have finished. In conclusion I cannot but impress upon you that the present crisis in the history of India demands complete organisation and unity of will and purpose in the Muslim community, both in your own interest as a community, and in the interest of India as a whole. The political bondage of India has been and is a source of infinite

misery to the whole of Asia. It has suppressed the spirit of the East, and wholly deprived her of that joy of self-expression which once made her the creator of a great and glorious culture. We have a duty towards India where we are destined to live and die. We have a duty towards Asia, especially Muslim Asia. And since 70 millions of Muslims in a single country constitute a far more valuable asset to Islam than all the countries of Muslim Asia put together, we must look at the Indian problem not only from the Muslim point of view but also from the standpoint of the Indian Muslim as such. Our duty towards Asia and India cannot be loyally performed without an organised will fixed on a definite purpose. In your own interest, as a political entity among other political entities of India, such an equipment is an absolute necessity. Our disorganized condition has already confused political issues vital to the life of the community. I am not hopeless of an intercommunal understanding but I cannot conceal from you the feeling that in the near future our community may be called upon to adopt an independent line of action to cope with the present crisis and an independent line of political action, in such a crisis, is possible only to a determined people, possessing a will focalised by a single purpose. Is it possible for you to achieve the organic wholeness of a unified will? Yes, it is. Rise above sectional interests and private ambitions, and learn to determine the value of your individual and collective action, however directed on material ends, in the light of the ideal which you are supposed to represent. Pass from matter to spirit. Matter is diversity; sprit is light, life and unity. One lesson I have learnt from the history of Muslims. At critical moments in their history it is Islam that has saved Muslims and not vice versa. If today you focus your vision on Islam and seek inspiration from the ever-vitalising idea embodied in it, you will be only reassembling your scattered forces, regaining your lost integrity, and thereby saving yourself from total destruction. One of the profoundest verses in the Holy Quran teaches us that the birth and rebirth of the whole of

humanity is like the birth and rebirth of a single individual. Why cannot you who, as a people, can well claim to be the first practical exponent of this superb conception of humanity, live and move and have your being as a single individual? I do not mystify anybody when I say that things in India are not what they appear to be. The meaning of this, however, will dawn upon you only when you have achieved a real collective ego to look at them. In the words of the Quran, "Hold fast to yourself; no one who erreth can hurt you, provided you are well-guided." (5:104)

آل انڈیا مسلم لیگ

کے اکیسویں سالانہ اجلاس میں منظور

ہونے والی قرار دادیں

انگریزی متن بمعہ عکس و اُردو ترجمہ

Text of Resolutions
Passed at the 21st Annual Session
of the
All India Muslim League
On the 29th and 30th Deember 1930
at Allahabad with
Dr. Sir Muhammad Iqbal Bar-at-Law
in the Chair.

Resolution No. 1-

"That the All India Muslim League places on record its deep sense of sorrow and loss on the sad deaths of Moulvi Mazharul Haq, Sahebzada Aftab Ahmad Khan, Mirza Ali Mohammad Khan, Sir Ibrahim Haroon Jafar and Syed Jalib, old and prominent members of the League and conveys its condolence to the members of the bereaved families".

(From Chair)

Resolution No. 2-

"That the All India Muslim League while appreciating the united efforts of the Muslim Members to the Round Table Conference in giving faithful expression to Muslim opinion, strongly supports the resolution passed by the All India Muslim Conference at Delhi on the 1st January 1929 under the Presidentship of H. H. Sir Agha Khan and hopes that the Muslim members will confine to abide by that resolution".

Proposed by:—Syed Habib Shah Saheb of Lahore

Seconded by:—Sh. Zahur Ahmad Saheb of Allahabad

Supported by:—Dr. Mufti Mohammad Sadiq of Qadian.

TEXT OF RESOLUTIONS

Passed at the 21st Annual Session

OF THE

All-India Muslim League

On the 29th and 30th December 1930

AT ALLAHABAD.

With Dr. Sir Mohamad Iqbal Bar-at-Law in the Chair.

Resolution No. 1.—

"That the All India Muslim League places on record its deep sense of sorrow and loss on the sad deaths of Moulvi Mazharul Haq, Sahebzada Aftab Ahmad Khan, Mirza Ali Mohammad Khan, Sir Ibrahim Haroon Jafar and Syed Jalib, old and prominent members of the League and conveys its condolence to the members of the bereaved families".

(FROM CHAIR)

Resolution No. 2.—

"That the All India Muslim League while appreciating the united efforts of the Muslim Members to the Round Table Conference in giving faithful expression to Muslim opinion, strongly supports the resolution passed by the All India Muslim Conference at Delhi on the 1st January 1929 under the Presidentship of H.H. Sir Agha Khan and hopes that the Muslim members will confine to abide by that resolution".

Proposed by:—Syed Habib Shah Saheb of Lahore
Seconded by:—Sh. Zahur Ahmad Saheb of Allahabad.
Supported by:—Dr. Mufti Mohammad Sadiq of Qadian.

Resolution No. 3.—

"Resolved that as the Government of India's despatch, on proposals for the Constitutional Reforms, fails to lead the country towards responsible Government the recommendations contained in the Despatch would not satisfy Indian aspiration in general and Muslim demands in particular".

Proposed by: -Hon. Syed Husain Imam Saheb of Gaya
Seconded by:—M. U. S. Jung Saheb of Allahabad.

Resolution No. 4.—

Resolved that the All India Muslim League, while fully realizing the particular conditions of the N. W. F. Province and recognising the necessity of taking special measures for the safeguarding of the Frontier, is strongly of opinion that the continued political dissatisfaction in the province can not be removed nor can the local aspirations be satisfied with any scheme of administration which gives an inferior place to the province in comparasion with other provinces in the country".

Proposed by:—Moulvi Mohammad Yakub Saheb M. L. A.
Seconded by:—Maulana Abdul Majid Saheb of Badaun.

Resolution No. 5.—

"Resolved that the All India Muslim League considers it essential and imperative that Statutory provisions should be made for the adequate representation of Mussalmans in the Cabinets as well as in the Public Services of the country".

Proposed by:—Hon. Syed Husain Imam of Gaya
Seconded by:—M. Md. Azim Saheb of Ghazipore
Supported by:—Syed Habib Shah Saheb of Lahore

Resolution No. 3.—

"Resolved that as the Government of India's despatch, on proposals for the Constitutional Reforms, fails to lead the country towards responsible Government the recommendations contained in the Dispatch would not satisfy Indian aspiration in general and Muslim demands in particular"

Proposed by: — Hon. -Syed Husain Imam Saheb of Gaya

Seconded by:—M. U. S, Jung Saheb of Allahabad.

Resolution No. 4.—

"Resolved that the All India Muslim League, while fully realizing the particular conditions of the N. W. F. Province and recognizing the necessity of taking special measures for the safeguarding of the Frontier, is strongly of opinion that the continued political dissatisfaction in the province can not be removed nor can the local aspirations be satisfied with any scheme of administration which gives an inferior place to the province in comparison with other provinces in the country".

Proposed by:—Moulvi Mohammad Yakub Saheh M. L. A.
Seconded by:—Maulana Abdul Majid Saheb of Badaun.

Resolution No. 5.—

"Resolved that the All India Muslim League considers it essential and imperative that Statutory provisions should be made for the adequate representation of Mussalmans in the Cabinets as well as in the Public Services of the country".

Proposed by:—Hon. Syed Husain Imam of Gaya

Seconded by:—M. M[uhamma]d Azim Saheb of Ghazipore

Supported by:—Syed Habib Shah Saheb of Lahore

Resolution No: 6. —

"That the All India Muslim League is emphatically of opinion that the Mussalmans of India will not be satisfied with any constitution that does not gaurantee (*a*) Full Muslim representation on Population basis in the Legislatures of the Punjab and Bengal. (*b*) Constitution of Sind into a separate Province forthwith and without any condition (*c*) Conferment of full powers on the N.W.F. Province and Baluchistan.

This League declares that the Muslim insistance of the adoption of the Federal Constitution of India is contingent upon the clear understanding that above mentinoned units shall in the matter of provincial autonomy, be treated on the same footing as the other components of the Federation."

Proposed by:—Moulvi Abdul Majid Saheb of Sind
Seconded by:—Moulvi Abdul Qadir Saheb of Kasur

Resolution No. 7.—

"Resolved that a committee of the following members be appointed to revise and amend the Constitution of the All India Muslim League to be placed before the next Session of the League. 1. Nawab Mohammad Ismail Khan Saheb of Meerut, 2. Kazi Masud Hasan Saheb of Meerut, 3. Moulvi Mohammad Yakub Saheb".

*Proposed by:*Syed Zakir Ali Saheb
Seconded by:—Sh. Zahur Ahmad Saheb of Allahabad

MOHAMMAD YAKUB,
M. L. A.
Honorary Secretary.

Resolution No: 6.-

"That the All India Muslim League is emphatically of opinion that the Mussalmans of India will not be satisfied with any constitution that does not guarantee *(a)* Full Muslim representation on -Population basis in the Legislatures of the Punjab and Bengal. *(b)* Constitution of Sind into a separate Province forthwith and without any condition *(c)* Conferment of full powers on the N.W.F. Province and Baluchistan.

This League declares that the Muslim insistence of the adoption of- the Federal Constitution of India is contingent upon the clear understanding that above mentioned units shall in the matter of provincial autonomy, be treated on the same footing as the other components of the Federation."

Proposed by:—Moulvi Abdul Majid Saheb of Sind

Seconded by:—Moulvi Abdul Qa.dir Saheb of Kasur

Resolution No. 7.—

"Resolved that a committee of the following members be appointed to revise and amend the Constitution of the All India Muslim League to be placed before the next Session of the League. 1. Nawab Mohammad Ismail Khan Saheb of Meerut, 2. Kazi Masud Hasan Saheb of Meerut, 3. Moulvi Mohammad Yakub Saheb".

Proposed by:—Syed Zakir Ali Saheb

Seconded by:—Sh. Zahur Ahmad Saheb of Allahabad

Muhammad Yakub,
M. L. A.
Honorary Secretary
[All India Muslim League].

آل انڈیا مسلم لیگ کے اکیسویں سالانہ اجلاس منعقدہ ۲۹-۳۰ دسمبر، ۱۹۳۰ء میں منظور ہونے والی قراردادوں کا متن*۔

آل انڈیا مسلم لیگ کے
اکیسویں سالانہ اجلاس میں منظور ہونے والی
قراردادوں کا متن

مورخہ: ۲۹ر اور ۳۰ر دسمبر ۱۹۳۰

بمقام: الہٰ آباد

صدارت: ڈاکٹر سر محمد اقبال، بار ایٹ لا

قرارداد نمبر ۱۔

آل انڈیا مسلم لیگ اپنے قدیم و ممتاز ارکان مولوی مظہر الحق، صاحبزادہ آفتاب احمد خان، مرزا محمد علی خان، سر ابراہیم ہارون جعفر اور سید جالب کے انتقال پر گہرے دکھ اور احساس محرومی کا اظہار کرتے ہوئے مرحومین کے پسماندگان سے تعزیت کرتی ہے۔

(صاحبِ صدر کی طرف سے)

قرارداد نمبر ۲۔

آل انڈیا مسلم لیگ گول میز کانفرنس کے مسلم نمائندوں کی طرف سے مسلمانوں کے جذبات کی صحیح ترجمانی کی متفقہ کوششوں کو سراہتے ہوئے یکم جنوری، ۱۹۲۹ء کو سر آغا خان کے زیرِ صدارت دہلی میں آل انڈیا مسلم کانفرنس کے اجلاس میں منظور ہونے والی قرارداد کی مکمل حمایت کرتی ہے اور امید کرتی ہے کہ مسلمان ممبران اس قرارداد پر عمل درآمد کے

پابند رہیں گے۔

تجویز کندہ: سید حبیب علی شاہ، لاہور

تائید کندہ: شیخ ظہور احمد، الہ آباد

تائید مزید: ڈاکٹر مفتی محمد صادق، قادیان

قرارداد نمبر ۳۔

طے پایا کہ چونکہ حکومتِ ہند کا مراسلہ برائے آئینی اصلاحات ملک کے لیے با اختیار حکومت کی تشکیل کرنے میں ناکام رہا ہے اس لیے اس کی سفارشات اہل ہند کی خواہشات کو بالعموم اور مسلم مطالبات کو بالخصوص پورا نہیں کر سکیں گی۔

تجویز کندہ: سید حسین امام، گیا

تائید کندہ: ایم یو ایس جنگ، الہ آباد

قرارداد نمبر ۴۔

طے پایا کہ آل انڈیا مسلم لیگ شمال مغربی سرحدی صوبے کے مخصوص حالات کا مکمل ادراک رکھتے ہوئے اور اس کے دفاع کے لیے خصوصی اقدامات کی ضرورت کو تسلیم کرنے کے باصف اس خیال کی پُر زور حامی ہے کہ صوبے میں جاری مسلسل سیاسی بے چینی دور نہیں کی جا سکتی اور نہ ہی مقامی رائے عامہ ایسے انتظامی منصوبے سے مطمئن ہو سکتی ہے جو ملک کے دوسرے صوبوں کے مقابلے میں صوبہ سرحد کو کم ترحیثیت دیتا ہو۔

تجویز کندہ: مولوی محمد یعقوب، ایم ایل اے۔

تائید کنزرہ: مولانا عبدالماجد، بدایون

قرارداد نمبر ۵۔

طے پایا کہ آل انڈیا مسلم لیگ اس امر کو ضروری اور لازم خیال کرتی ہے کہ سرکاری ملازمتوں اور کابینہ میں مسلمانوں کی معقول نمائندگی کے لیے آئینی تحفظات فراہم کیے جائیں۔

تجویز کنندہ: سید حسین امام، گیا

تائید کنندہ: ایم محمد عظیم، گرداسپور

تائید مزید: سید حبیب علی شاہ، لاہور

قرارداد نمبر ۶۔

طے پایا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کی رائے میں ہندوستان کے مسلمان ایسے کسی آئین سے مطمئن نہیں ہوں گے جس میں یہ ضمانتیں موجود نہ ہو کہ (الف) پنجاب اور بنگال کی مجالس قانون ساز میں آبادی کی بنیاد پر مکمل مسلم نمائندگی ہو (ب) سندھ کو فوراً اور غیر مشروط طور پر علیحدہ صوبے کی حیثیت دی جائے اور (ج) صوبہ سرحد اور برطانوی بلوچستان کو مکمل اختیارات عطا کیے جائیں۔

یہ لیگ اس امر کا اعلان کرتی ہے کہ مسلمان ہندوستان کے لیے صرف اس وفاقی آئین کو قبول کریں گے جس میں وفاق کے مذکورہ بالا صوبوں کو بھی صوبائی خود مختاری کے لحاظ سے وفاق کے دوسرے اجزا کے مساوی رکھا جائے گا۔

تجویز کنندہ: مولانا عبدالماجد، سندھ

تائید کنندہ: مولوی عبدالقادر، قصور

قرار داد نمبر ۷۔

طے پایا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کے دستور کی نظرِ ثانی اور ترامیم کے لیے درج ذیل ممبران پر مشتمل مجلس قائم کی جائے جو اسے لیگ کے آئندہ اگلے اجلاس میں پیش کرے گی۔
۱۔ نواب محمد اسمٰعیل خان، میرٹھ، ۲۔ قاضی مسعود حسین، میرٹھ، ۳۔ مولوی محمد یعقوب۔

تجویز کنندہ: سید ذاکر علی
تائید کنندہ: شیخ ظہور احمد، الٰہ آباد

محمد یعقوب،
ایم، ایل، اے۔
اعزازی معتمد
آل انڈیا مسلم لیگ

کتابیات

کتابیات (اُردو)

۱- احمد، سید نور، مارشل لاء سے مارشل لاء تک، اپریل ۱۹۱۹ء تا اکتوبر ۱۹۵۸ء، لاہور، ۱۹۶۶ء۔

۲- اقبال، جاوید، زندہ رود، جلد سوم، لاہور، ۱۹۸۹ء۔

۳- الحسن، خالد شمس، قائد اعظم کا اُدھورا خواب، کراچی، ۱۹۹۱ء۔

۴- برنی، سید مظفر حسین، مرتبہ، کلیات مکاتیب اقبال، جلد سوم، دہلی، ۱۹۹۳ء۔

۵- جعفری، رئیس احمد، مرتبہ، علی برادران، لاہور، ۱۹۶۳ء۔

۶- حالی، الطاف حسین، حیات جاوید، لاہور، ۱۹۵۱ء۔

۷- خورشید، عبدالسلام، سرگزشت اقبال، لاہور، ۱۹۷۷ء۔

۸- ڈار، بشیر احمد، خطبہ اِلٰہ آباد کے متعلق اقبال کے چند نادر خطوط، صحیفہ اقبال، مرتبہ یونس جاوید، لاہور، ۱۹۸۶ء۔

۹- رزاقی، شاہد حسین، سر سید اور اصلاح معاشرہ، لاہور، ۱۹۸۳ء۔

۱۰- زمن، مختار، دوازدہ منزل سے منزل پاکستان تک، نقوش، اقبال نمبر، شمارہ ۱۲۱، ستمبر ۱۹۷۷ء۔

۱۱- سرور، محمد، مرتبہ، مضامین محمد علی جوہر، لاہور، ۱۹۳۸ء۔

۱۲- ....، محمد علی، لاہور، ۱۹۶۲ء۔

۱۳- شاہ، سید دربار علی، مرتبہ، ہجرت افغانستان، لاہور، ۱۹۷۹ء۔

۱۴- شاہد، محمد حنیف، اقبال کا خطبہ اِلٰہ آباد سہ ماہی، فکر و نظر، اسلام آباد، جلد ۱۴، نمبر ۱۱-۱۰ مئی، اپریل، ۱۹۷۷ء۔

۱۵- شاہین، رحیم بخش، اقبال کا خطبہ اِلٰہ آباد۔ منظر و پس منظر مجلّہ اقبال ریویو، لاہور، جنوری ۱۹۷۷ء۔

۱۶- عالم، محمد جہانگیر، تحریک پاکستان، فیصل آباد، ۱۹۷۷ء۔

۱۷- ....، علامہ اقبال کا خطبہ اِلٰہ آباد، مجلّہ اقبال، لاہور، جولائی ۱۹۸۴ء۔

۱۸- عبدالحمید، اقبال بحیثیت مفکر پاکستان، لاہور، ۱۹۸۸ء۔

۱۹- عروج، عبدالرؤف، رجال اقبال، کراچی، ۱۹۸۸ء۔
۲۰- فتح پوری، فرمان، اُردو ہندی تنازعہ، اسلام آباد، ۱۹۷۷ء۔
۲۱- گیانی، عباداللہ، سکھ عہد اسلامی میں، لاہور، ۱۹۲۴ء۔
۲۲- مارہروی، احمدالدین، جلسہ الٰہ آباد کا آنکھوں دیکھا حال، اُردو ڈائجسٹ، اپریل ۱۹۶۷ء، لاہور۔
۲۳- محمود، راجہ رشید، تحریک ہجرت (۱۹۲۰) ایک تاریخ جائزہ، لاہور، ۱۹۸۶ء۔
۲۴- ملک، عبداللہ، بنگالی مسلمانوں کی صد سالہ جدوجہد آزادی، ۱۷۵۷ء تا ۱۸۵۷ء، لاہور، ۱۹۶۷ء۔
۲۵- منگلوری، سید طفیل احمد، مسلمانوں کا روشن مستقبل، دہلی، ۱۹۴۵ء۔
۲۶- مہر، غلام رسول، جماعت مجاہدین، لاہور، ۱۹۵۵ء۔
۲۷- ....، ۱۸۵۷ء۔ پاک و ہند کی پہلی جنگ آزادی، لاہور، ۱۹۵۷ء۔
۲۸- ....، ۱۸۵۷ء کے مجاہد، لاہور، ۱۹۶۹ء۔
۲۹- ....، سرگزشت مجاہدین، لاہور، ۱۹۵۶ء۔
۳۰- ندوی، سید ابوظفر، تاریخ سندھ، اعظم گڑھ، ۱۹۴۷ء۔
۳۱- ندوی، سید سلیمان، عرب و ہند کے تعلقات، الٰہ آباد، ۱۹۲۳ء۔
۳۲- نظامی، خلیق احمد، سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، دہلی، ۱۹۵۸ء۔
۳۳- نورالرحمان، حیات سر سید، علی گڑھ، ۱۹۵۰ء۔
۳۴- نیازی، سید نذیر، مرتبہ، مکتوبات اقبال، کراچی، ۱۹۵۷ء، ص ۶۷۔
۳۵- ہندی، کنہیالال، تاریخ پنجاب، لاہور، ۱۹۵۸ء۔

BIBLIOGRAPHY

Primary Sources

Achieves of Freedom Movement: The All India Muslim League Documents, 1906-1947, Vol. 153-154, National Achieves of Pakistan, Islamabad.

Secondary Sources

Official Documents

Indian Round Table Conference (First Session), London, 1931, Comd. 3778.

Report of the Indian Statutory Commission (The Simon Commission), 1930, 2 Vols., I *Survey*, II, *Recommendations*, London, 1930.

(Rowlett) Sedition Committee Report, Calcutta, 1973.

Books

Abbasi, Muhammad Yusuf, *Muslim Politics and Leadership in South Asia, 1876-92*, Islamabad, 1981.

Agarwala, Ratish Mohan, *The Hindu Muslim Riots: Their Causes and Cures,* Lucknow, 1943.

Ahmad, Aziz, *Studies in Islamic Culture in the Indian Environment,* Oxford, 1964.

____________, *Islamic Modernism in India and Pakistan, 1857-1965,* London, 1969.

Ahmad, Fazal, *Sultan Tipu,* Lahore, 1958.

Ahmad, Jamil-ud-Din, *Muslim Political Movement: Early Phase,* Karachi, 1963.

____________, ed., *Speeches and Writings of Mr. Jinnah,* 2 Vols., Karachi, 1960-64.

____________, *Historic Documents of the Muslim Freedom Movement,* Lahore, 1969.

Ahmad, Khawaja Jamil, *Britain and Muslims: A Historical Review,* Karachi, 1971.

Ahmad, Muhammad Salim, *The All-India Muslim League From the Late Nineteenth Century to 1919,* Bahawalpur, 1988.

Ahmad, Muhammad Aziz, *Political and Historical Institutions of the Early Turkish Empire of Delhi,* Lahore, 1949.

Ahmad, Nur, *Mian Fazal-i-Hussain: A Review of His Life and Work,* Lahore, 1936.

Ahmad, Q., *The Wahabi Movement in India,* Patna, 1966.

Ahmad, Saluddin, *Social Policy and Social Change in Bengal, 1818-1835,* Leiden, 1965.

Aitchison, C.U. comp., *A Collection of Treaties, Engagements and Sunuds Relating to India and the Neighbouring Countries,* 14 Vols., Calcutta, 1929-31.

Akber, Muhemmed, *The Punjab Under the Mughals,* Lahore, 1948.

Ali, B. Sheikh, *Tipu Sultan,* New Delhi, 1972.

Ali, Chaudhri Muhammad, *The Emergence of Pakistan,* Lahore, 1988.

Ali Mohsin, *The Bengali Muslim,* Karachi, 1971.

All Parties Conference, *Report of the Committee Appointed by the Conference to Determine the Principles for the Constitution of India,* Allahabad, 1928.

____________, *Supplementary Report of the Committee,* Allahabad, 1928.

Allana, G., ed., *Pakistan Movement: Historic Documents,* Lahore, 1977.

Ambedher, B.R., *Pakistan or the Partition of India,* Bombay, 1946.

Andrews, C.F., *Mahatama Gandhi's Ideas Including Selections from His Writings,* London, 1930.

____________, *India and the Simon Report,* London, 1930.

____________ and Girja Mukerji, *The Rise and Growth of the Congress in India,* London, 1938.

Aziz, K.K., *The Historical Background of Pakistan, 1857-1947, An Annotated Digest of Source Material,* Karachi, 1970.

____________, *Britain and Muslim India,* London, 1963.

____________, *The Making of Pakistan,* London, 1967.

____________, *The Indian Khilafat Movement, 1915-1923, Documentary Records,* Karachi, 1972.

Bahadur, Lal, *The Muslim League: His History, Activities & Achievements,* Lahore, 1979.

Bakshi, S.R., *Simon Commission and Indian Nationalism,* New Delhi, 1977.

Baljon, J.S.M., *The Reforms and Religious Ideas of Sir Sayyid Ahmad Khan,* Leiden, 1949.

Bunerjee, Anil Chandra, *Constitutional History of India,* 3 Vols., New Delhi, 1977-78.

Bance-Junes, Mark, *Clive of India,* London, 1974.

Banerjee, A.C., *Constitutional History of India,* 3 Vols., New Delhi, 1977-8.

____________, *Indian Constitutional Documents,* 3 Vols., Calcutta, 1961.

Banerjee, Anil Chandra, *Constitutional History of India,* 3 Vols., New Delhi, 1978.

Barstow, A.E., *Sikhs,* Delhi, 1940.

Besant, Annie, *How India Fought for Freedom: The Story of National Congress From Official Records,* Madras, 1950.

Bhatnagar, S.K., *History of the MAO College,* Aligarh, 1971.

Bhide, A.S., ed., *Vee Savarkar's Whirlwind Propaganda,* Bombay, 1941.

Birla, G.D., *In the Shadow of Mahatama,* Bombay, 1953.

Bolitho, Hector, *Jinnah: Creator of Pakistan,* Lahore, 1964.

Boquet, A.C., *Hindustan,* London, 1941.

Bress, P. Paul, *Language, Religion and Politics in North India,* Cambridge, 1974.

Broomfield, J.M., "The Partition of Bengal: A Problem in British Administration 1830-1912" in *Indian Congress Proceedings,* 2 Parts, Aligarh, 1960, Calcutta, 1961.

____________, *Elite Conflict in a Plural Society: Twentieth Century Bengal,* Berkeley, 1968.

Brown, Judith M., *Gandhi's Rise of Power in Indian Politics, 1915-1922,* Cambridge, 1974.

Bamfred, B.C., *Histories of the Non Cooperation and Khilafat Movements,* Delhi, 1925.

Carthill, Al, *The Last Dominion,* London, 1924.

Chatterjee, N.C., *The Message of the Mahasabha: Collection of Speeches And Addresses,* Calcutta, 1944.

Chablani, S.P., ed., *Motilal Nehru: Essays and Reflections on His Life and Times,* New Delhi, 1961.

Chakrabarty and Bhattacharya, *Congress in Evolution,* Part I & II, Calcutta, 1935.

Chakravarty, P.C., "Genesis of the Partition of Bengal, 1905", in *Indian History Congress Proceedings,* Trivandrum, 1958, Bombay, 1959.

Chaltopadhyaya, H., *The Sepoy Mutiny, 1857: A Social Study and Analysis,* Calcutta, 1957.

Chand, Tara, *History of the Freedom Movement in India,* 4 Vols., New Delhi, 1961-72.

____________, *Society and State in the Mughul Period,* Lahore, 1979.

Chaudhuri, Narid, *Clive of India,* London, 1975.

Chandhra, Bipin, *The Rise and Growth of Economic Nationalism in India,* New Delhi, 1966.

Chandra, Satish, *Parties and Politics at the Mughul Court: 1707-1740,* Aligarh, 1959.

Chatterji, Tapanmohan, *The Road to Plassey,* Bombay, 1960.

Choudhary, Sukhbir, *Indian Peoples Fight for National Liberation: Non-Cooperation, Khilafat and Revivalist Movements,* New Delhi, 1972.

Chaudhari, S.B., *Theories of the Indian Mutiny (1857-59): A Study of the Views of Eminent Historians on the Subject,* Calcutta, 1965.

Chaudhry, Nazir Ahmad, *The Great Rising of 1857 and the Separation of Muslims,* Lahore, 1970.

Cleghorn Bruce E., "Religion and Politics: the Leadership of the All-India Hindu Mahasabha", in B.N. Pandey, ed., *Leadership in South Asia,* New Delhi, 1977.

Clive, John and Thomas Pinney, ed., *Thomas Babington Macaulay, Selected Writings,* Chicago, 1979.

____________, *Thomas Babington Macaulay: The Shaping of the Historian,* London, 1973.

Coatman, John, *Years of Destiny, 1926-1932,* London, 1932.

Collier, Richard, *The Great Indian Mutiny,* New York, 1964.
Colvin, Ian, *The Life of General Dyer,* London, 1929.
Coupland, Reginald, *The Constitutional Problem in India,* 3 Parts, Oxford, 1944.
Crustwell, C.R.M.F., *A History of the Great War, 1914-18,* London, 1934.
Cunnigham, J.D., *A History of the Sikhs,* London, 1918.
Cunring John, ed., *Political India: 1832-1932,* London, 1932.
Curran, N.A.J., *Militant Hinduism in Indian Politics: A Story of the R.S.S.,* New York, 1951.
Curtis, Lionl, *Dyarchy: Papers Relating to the Application of the Principle of Dyarchy to the Government of India,* Oxford, 1920.
Damle, N.V., ed., *Hindu Sanghaten: Its Ideology and Immediate Programme,* Bombay, 1940.
Dai, Ahmad Hasan, ed. *World Scholars on Quaid-i-Azam Muhammad ali Jinnah,* Islamabad, 1979.
Daries, A. Mervyn, *Clive of Plassey: A Biography,* London, 1939.
Das, Gupta Jyotyinda, *Language Conflict and National Development: Group Politics and National Language Policy in India,* Berkeley, 1970.
Das, Manmatha Nath, *India Under Morley and Minto: Politics Behind Revolution, Repression and Reforms,* London, 1964.
Datta, V.N., *Jallianwala Bagh,* Ludhiana, 1968.
De Mello, F.M., *The Indian National Congress,* London, 1938.
Deol, Gurdev Singh, *Banda Bahadur,* Jullandar, 1972.
Desai, Mahadev H., *Day to Day with Gandhi: Secretary's Diary, Nov. 1917 to March 1919,* Rajghat, 1968.
Dhawan, G.M., *The Political Philosophy of Mahatama Gandhi,* Bombay, n.d.
Dobbin Christine, *Basic Documents in the Development of ed.,Modern India and Pakistan, 1835-1947,* London, 1969.
Dodwell, H.H., *Duplix and Clive,* London, 1938.
Dwarkadas, Karji, *Gandhiji Through My Diary Leaves, 1915-1948,* Bombay, 1950.
Draper, Alfred, *Amritsar: The Massacre That Ended the Raj,* London, 1971.
Edwards, Michael, *Battles of the Indian Mutiny,* London, 1963.

___________, *Red Year–The Indian Rebellion of 1857,* London, 1973.

___________, *The Battle of Plassy and Conquest of Bengal,* New York, 1979.

___________, *The Founding of An Empire,* London, 1969.

Embree, A.T., *1857 in India,* Boston, 1963.

Embree, Ainslie T., ed., *Encyclopedia of Asian History,* New York, 1988.

Erikson, Erik, H., *Gandhi's Truth On the Origin of Militant Non-Violence,* New York, 1969.

Farquhar, J.N., *Modern Religious Movements in India,* Delhi, 1969.

Fitzgerald, Valeire, *Zamindar,* London, 1981.

Forrest, Derys, *Tiger of Mysore,* Bombay, 1970.

Furber, Holden, *John Company at Work,* New York, 1948.

Furneaux, Rupert, *Massacre at Amritsar,* London, 1963.

Gandhi, M.K., *An Autobiography or the Story of My Experiments with Truth,* 2 Vols., Ahmadabad, 1929-9.

Godon, Leonard A., *Bengal: The Nationalist Movement, 1876-1940,* Delhi, 1974.

Goetz, Philip, W. and others, ed., *The New Encylopaedia Britanica,* Chicago, 1993.

Goodnow, Henry Frank, *The Civil Service of Pakistan: Bureaucracy in a New Nation,* Karachi, 1969.

Gopal, Ram, *Indian Muslims: A Political History, 1858-1947,* Bombay, 1964.

___________, *How the British Occupied Bengal,* Bombay, 1963.

Graham, G.F.I., *The Life and Work of Sayyid Ahmad Khan, C.S.I.,* London, 1909.

Griffiths, Percival, *Modern India,* London, 1962.

Greival, J.S., *Muslim Rule in India: The Assessment of British Historians,* London, 1970.

Gupta, Hari Ram, *History of the Sikhs,* 8 Vols., New Delhi, 1978.

Gupta, Pratual Chandra, *Baji Rau II and the East India Company, 1796-1818,* New Delhi, 1964.

Hamid, Abdul, *Muslim Separation in India,* Lahore, 1971.

Haq, Mushir-ul-, *Muslim Politics in Modern India, 1857-1947,* Meerut, 1970.
Haq, S., Moinul, "Syed Ahmad Khan" in *A History of Freedom Movement,* Pt. II, Karachi, 1961.
____________, ed., *Muhemmed Ali In Indian Politics: Selected Writings,* Delhi, 1982.
Hibbert, Christopher, *The Great Mutiny in India, 1857,* London, 1980.
Hunter, W.W., *The Indian Musalmans,* Calcutta, 1945.
Hussain, Azim, *Fazal-i-Husain: A Political Biography,* Bombay, 1946.
Hussain, Yusaf, *The First Nizam: The Life and Times of Nizam-ul-Mulk Asif Jah I,* Bombay, 1963.
Hussaini, S.A.Q., *Administration Under the Mughals,* New York, 1965.
Ikram, S.M., *Modern Muslim India and the Birth of Pakistan (1858-1951),* Lahore, 1965.
Iqbal, Afzal, *Life and Times of Muhemmed Ali: An Analysis of the Hopes, Fears and Aspirations of Muslim India, From 1878 to 1931,* Delhi, 1978.
____________, *My Life–A fragment: An Autobiographical Sketch of Maulana Muhemmed Ali,* Lahore, 1942.
____________, *Selected Writings and Speeches of Maulana Muhemmed Ali,* 2 Vols., Lahore, 1944.
Isphani, M.A.H., *Quaid-i-Azam Jinnah: As I Knew Him,* Karachi, 1976.
Jaffar, S.M., *Some Cultural Aspects of Muslim Rule in India,* Delhi, 1963.
Jafri, Rais Ahmad, comp., *Rare Documents,* Lahore, 1967.
____________, ed., *Selections from Maulana Muhemmed Ali's Comrade,* Lahore, 1965.
Jain, M.S., *The Aligarh Movement: Its Origin and Development, 1858-1906,* Agra, 1965.
Jhon, Manoranjan, *Role of Central Legislature in the Freedom Struggle,* New Delhi, 1972.
Joshi, P.C., ed., *Rebellion 1857: A Symposium,* New Delhi, 1957.

Kabir, M., *A Short History of Pakistan: Muslim Rule Under the Sultans,* Karachi, 1969.
Kanshib, P.D., *The Congress: Ideology and Programme, 1920-1947,* New Delhi, 1964.
Keen, Dharanjay, *Mahatma Gandhi: Political Saint and Unarmed Prophet,* Bombay, 1973.
Keith, A.B., *A Constitutional History of India,* Oxford, 1936.
Kennedy, Charles H., *Bureaucracy in Pakistan,* Karachi, 1978.
Ker, J.C., *Political Trouble in India, 1907-1917,* Calcutta, 1917.
Khan, Agha, *The Memories of Agha Khan,* London, 1954.
Khan, Ahmad Muin-ud-Din, *Muslum Struggle for Freedom in Bengal, 1751 to 1854,* Karachi, 1973.
Khan Shafique Ali, *Two Nation Theory: As a Concept, Strategy and Ideology,* Hyderabad, 1973.
___________, *Iqbal's Concept of Separate North-West Muslim State (A Critique of His Allahabad Address of 1930),* Karachi, 1987.
Khan, Syed Sirdar Ali, *The Life of Lord Morley,* London, 1923.
Khosla, G.D., *The Last Moghul,* Delhi, 1969.
Kripalaw, J.B., *Gandhi: His Life and thought,* New Delhi, 1970.
Krishna, Gopal, "The Development of the Indian National Congress as a Mass Organization, 1918-1923" in Thomas R. Metcalfed, ed., *Modern India,* London, 1971.
Kumar, R., ed., *Essays on Gandhian Politics: The Rowlett Satya Garha of 1919,* Oxford, 1971.
Kumar, Ravider and D.N. Panigrahi, ed., *Selected Works of Motilal Nehru,* I, New Delhi, 1987.
Lateef, S. Abdul, *The Great Leader,* Lahore, 1946.
Layel, Alfred, *The Rise and Expansion of the British Dominion in India,* London, 1913.
Lees, W.H., *Indian Musalmans,* London, 1871.
Lelyved, David, *Aligarh's First Generation,* Princeton, 1977.
Lewis, Bernard, *The Emergence of Modern Turkey,* London, 1961.
Lutfullah, Syed, *Azimullah Khan Yusufzai: The Man Behind the War of Independence, 1857,* Karachi, 1970.
Mac farlane, Irish, *The Black Hole or the Making of a Legend,* London, 1975.

Maclance, John R., *Indian Nationalism and the Early Congress,* Princeton, 1977.
Macmillan, Harold, *The Past Masters: Politics and Politicians, 1906-39,* London, 1975.
Mahajan, V.D., *The Sultanate of Delhi,* Delhi, 1963.
__________, *The Mughal Rule in India,* Delhi, 1963.
Majumdar, Biman Behari and Bhanat Prasad Mazumdar, *Congress and Congressmen in the Pre-Gandian Era, 1885-1917,* Calcutta, 1967.
Majumdar, R.C., *History of the Freedom Movement of India,* Vol. III, Calcutta, 1963.
Malik, Hafeez, *Muslim Nationalism in India and Pakistan,* Lahore, 1979.
Mand, Mubarak, *On the Brink of War,* Lahore, 1947.
Mehra, Parshotem, *A Dictionary of Modern Indian History, 1707-1947,* Delhi, 1987.
Mehrotra, S.R., "The Organisation of the Indian National Congress, 1885-1920" and "The Objectives and Methods of the Indian National Congress, 1885-1920" in *Towards India's Freedom and Partition,* New Delhi, 1979.
__________, *The Emergence of Indian National Congress,* Delhi, 1974.
__________,"The Morley-Minto Reforms" in *Towards Indian's Freedom and Partition,* New Delhi, 1979.
Mehta, Ved, *Gandhi and His Apostles,* New York, 1978.
Minto, Countess of, *India: Minto and Morley, 1905-1910,* London, 1934.
Minto, Lord, *Speeches, 1905-1910,* Calcutta, 1911.
Misra, Bankey Bihari, *The Administrative History of India, 1834-1947,* New Delhi, 1970.
__________, *The Indian Political Parties: A Historical Analysis of Political Behaviour up to 1947,* Delhi, 1978.
Mitra, Nripendra Nath, ed., *The Indian Annual Register,* Vol. II. (July-Dec. 1930), Calcutta, 1931.
Morgon, J.N., *Viscount John Morley,* London, 1924.
Morley, Viscount John, *Indian Speeches, 1907-1909,* London, 1909.

____________, *Recollections,* Two Vols, London, 1924.

Moon, Panderel, *Gandhi and Modern India,* New York, 1962.

____________, *The British Conquest and the Dominion of India,* London, London, 1989.

Muhammad, Shan, *Freedom Movement in India: The Role of Ali Brothers,* New Delhi, 1979.

____________, ed., *The Aligarh Movement Basic Documents, 1869-1968,* 3 Vols., 1978.

____________, *Sir Syed Ahmad Khan: A Political Biography,* Meerut, 1969.

____________, *Writings and Speeches of Sir Syed Ahmad Khan,* Bombay, 1971.

Majumdar, S;K., *Jinnah and Gandhi,* Lahore, 1976.

Mujamdar, *History of India Social and Political Ideas from Ram Mohan to Dayannad,* Calcutta, 1967.

____________, "The Marhata Supremacy", in *History and Culture of the Indian People,* Vol. VII, Delhi, 1979. Majumdar, R.D., *The Sepoy Mutiny and the Revolt of 1857,* Calcutta, 1957.

Mukerjee, Haridas and Uma, *The Growth of Nationalism in India, 1857-1905,* Calcutta, 1957.

____________, *India's Flight for Freedom or the Swedeshi Movement, 1905-1906,* Calcutta, 1957.

____________, *Bande Matram and Indian Nationalism, 1906,* Calcutta, 1908.

Mukerjee, Ramkrishna, *The Rise and Fall of the East India Company,* Berlin, 1955.

Munir, Ramsay, ed., *The Making of British India, 1756-1858,* London, 1969.

Nanda, B.R., *Mahatama Gandhi,* London, 1948.

____________, *The Nehrus: Motilal and Jawaharlal Nehru,* London, 1962.

Natesan, G.A., ed., *Eminent Musalmans,* Madras, 1926.

Nazim, Muhemmed, *Life and Times of Sultan Mahmood of Ghazna,* Cambridge, 1930.

Nazmi, K.A., *Sayyid Ahmad Khan,* New Delhi, 1974.

Neil, Stephen, *Colonialism and Christian Missions,* New York, 1966.

Noman, Muhemmed, *Muslim India: The Rise and Growth of the All-India Muslim League,* Allahabad, 1942.
Nurullah, S. and J.P. Naik, *A History of Education in India During the British Period,* Bombay, 1951.
Oasmi, Jaffar, ed., *The Impact of Iran on Our Culture and Spiritual Heritage,* Lahore, 1971.
O'Dwyer, Sir Michael, *India As I Knew it, 1885-1925,* London, 1925.
O'Malley, L.S.S., *Indian Civil Service, 1601-1930,* London, 1931.
Pakistan Publications, *Struggle for Freedom, 1857,* Karachi, 1957.
Palmer, U. A. B., *The Mutiny Outbreak at Meerut in 1857,* Cambridge, 1966.
Palmer, Norman D., "India", in George Meturnan Kahin, ed., *Major Governments of Asia,* Ithaca, 1967.
Panhawar, M.H., ed., *Source Material on Sind,* Jamshoro, 1977.
Pannikar, K.M. and A. Parshad, *The Voice of Freedom: Selected Speeches of Pandit Motilal Nehru,* Bombay, 1961.
Partington, Norman, *Master of Bengal,* London, 1974.
Peyarelal, *Mahatama Gandhi: The Last Phase,* Two Vols., Ahmadabad, 1958-60.
Philips, C.H., ed., *The Correspondence of Lord William Cavendish Bentinck, Governor General of India, 182835,* Oxford, 1977.
____________, *The East India Company, 1784-1834,* Bombay, 1961.
Pirzada, Syed Sharifuddin, *Evolution of Pakistan,* Karachi, 1969.
____________, *Foundations of Pakistan: All India Muslim League Documents, 1906-1947,* Vol. I & II, Karachi, 1969-1970.
____________, *Quaid-i-Azam Jinnah's Correspondence,* Karachi, 1966.
Potts, E.D., *British Baptist Missionaries in India, 1993-1837: The History of Serampore and its Missions,* Cambridge, 1967.
Prabodh, Satyapal and Chandra, *60 Years of Congress: India Lost: India Regained,* Lahore, 1946.
Prakasha, Indra, *Hindu Mahasabha: Its Contribution in India's Politics,* New Delhi, 1966.
Praxy, Ferrandes, *Storm Over Seringapatam,* Bombay, 1969.

Pylee, M.V., *Constitutional History of India, 1600-1950,* Bombay, 1972.

Qureshi, I.H., *The Struggle for Pakistan,* Karachi, 1974.

____________, *Ulema in Politics,* Karachi, 1974.

____________, *The Muslim Community of the Indo-Pakistan Sub-Continent,* The Hague, 1962.

____________, *Education in Pakistan: An Inquiry into Objectives and Achievements,* Karachi, 1975.

____________, *The Administration of the Sultanate of Delhi,* Karachi, 1958.

____________, *The Administration of the Mughal Empire,* Karachi, 1967.

Qureshi, M.M. Saleem, *Jinnah and The Making of Nation,* Karachi, 1960.

R. Craddock, *The Dilemma in India,* London, 1929.

Rajput, A.B., *Muslim League: Yesterday & Today,* Lahore, 1948.

Ram Raja, *The Jallianwala Bagh Massacre: A Premeditated Plan,* Chandigarh, 1969.

Ranade, M.G., *The Rise of the Marhata Power,* Bombay, 1900.

Rao, B. Shiva, *India's Freedom Movement, Some Notable Figures,* Bombay, 1972.

Rashid, Sh. Abdur, *History of the Muslims of the Indo-Pakistan Sub-Continent, 1707-1806*, Lahore, 1980.

Renan, Louis, *Religions of Ancient India,* London, 1953.

Report of the Commissioners Appointed by the Punjab Sub-Committee of the Indian National Congress, Reprint, Delhi, 1976.

Robb, P.G., *The Government of India and Reform Policies Towards Politics and the Constitution,* Oxford, 1976.

Robinson, Francis, *Separation Among Indian Muslims: The Politics of the United Provinces, 1860-1923,* London, 1974.

Rosseli, John, *Lord William Bentinck: The Making of a Liberal Imperialist, 1774-1839,* Delhi, 1974.

Rumbold, Algernon, *Watershed in India, 1914-1922,* London, 1979.

Saiyid, M.H., *Muhemmed Ali Jinnah: A Political Study,* Karachi, 1970.

Sardesai, G.S., *A New History of the Marhatas,* 3 Vols., Bombay, 1958.
Sarkar Suit, *The Swadeshi Movement in Bengal (1903-1908),* Calcutta, 1973.
Sarkar, Jadunath, *Mughal Administration,* Calcutta, 1935.
Savarkar, V.D., *Hindu Sanghaten,* Bombay, 1940.
__________, *The Indian War of Independence (National Rising of 1857),* Bombay, 1960.
Sayeed, K.B., *Pakistan: The Formative Phase,* Karachi, 1960.
__________, "The Personality of Jinnah and His Political Strategy" in C.F. Philips and M.D. Wainwrigh, ed., *The Partition of India: Policies and Perspective, 1935-1947,* London, 1970.
Sen, K.M., *Hinduism,* London, 1959.
Sen, Surendranath, *Eighteen Fifty Seven,* New Delhi, 1957.
Shahnawaz, Jahn Ara, *Father and Daughter: A Political Autobiography,* London, 1971.
Shakir Moin, *Khilafat to Partition: A Survey of Major Political Trends Among Indian, Muslims During 1919-1947,* New Delhi, 1970.
Shamsul Hasan, Syed, *Plain Mr. Jinnah,* Karachi, 1976.
Sharma Ram, *The Religious Policy of Mughal Emperors,* Bombay, 1938.
Sharma, Sir Pam, *A Constitutional History of India, 1765-1954,* Bombay, 1954.
Sherwani, H.K., *The Aligarh Movement, Sir Sayed Memorial Lectures, 1969,* Aligarh, 1969.
Siddiqi, Abdul Gafoor, *Titoo Meer Saheed,* Karachi, n.d.
Singh, Durlab, *Famous Letters and Ultimatums to the British Government,* Lahore, 1945.
Singh, Ganda, *A Life of Banda Singh Bahadur,* Amritsar, 1935.
Singh, G.S., *Marhata Geopolitics and the Indian Nation,* Bombay, 1966.
Singh, Hirlal, *Problems and Policies of British India, 1815-1898,* Bombay, 1963.
Singh, Pardaman, *Lord Minto and Indian Nationalism, 1905-10,* Allahabad, 1976.

Sitaramayya, Pittabhi, *History of the Indian National Congress,* Two Vols., Delhi, 1969.

Smith, Donald E., *India as a Secular State,* Princeton, 1963.

Smith, Vincent, *The Oxford History of India,* Oxford, 1958.

Spear, Percival, *Twilight of the Mughals: Studies in the Late Mughul Delhi,* Karachi, 1973.

Spear, T.G.P., *Master of Bengal: Clive and His India,* London, 1975.

Srivastava, A.L., *The Mughul Empire (1526-1803),* Delhi, 1959.

Stephan, Ian, *The Pakistanis,* Glasgow, 1968.

Strang, Lord, *Britain in World Affairs: A Survey of the Fluctuation in British Power and Influence: Henry VIII to Elizabeth II,* London, 1961.

Sutherland, Lucy S., *The East India Company in 18th Century Politics,* London, 1952.

Swinson, Arthur, *Six Minutes to Sunset: The Story of General Dyer & the Amritsar Affair,* London, 1964.

Symonds, Richards, *The Making of Pakistan,* London, 1949.

Taunk, B.M., *Non-Cooperation Movement in Indian Politics, 1919-1924, A Historical Study,* Delhi, 1978.

Tendulkar, D.G., *Mahatma,* 8 Vols., Bombay, 1960-3.

Tomlinson, B.R., *The Indian National Congress and the Raj, 1929-1942*, London, 1976.

Toosy, M.S., *The Muslim League and Pakistan Movement,* Karachi, 1978.

Trevelyan, G.O., *The Life and Letters of Lord Macaulay,* London, 1909.

Tripathi, R.P., *Some Aspects of Muslim Administration,* Allahabad, 1959.

____________, *Rise and Fall of the Mughal Empire,* Allahabad, 1960.

Verma, D.C., *Plassey to Buxur: A Military Study,* New Delhi, 1976.

Wasti, Syed Razi, *Lord Minto and the Indian Nationalist Movement, 1905 to 1910,* Oxford, 1964.

____________, *The Political Triangle in India, 1858-1924,* Lahore, 1976.

______________, *Biographical Dictionary of South Asia,* Lahore, 1987.

Who's Who, Governor's, Indian Princes and Ruling Chief, 1942-1943, Delhi, 1944.

Wilber, Donald N., *Pakistan, Yesterday and Today,* New York, 1964.

Wilcox, Wayne Ayres, *Pakistan: The Consolidation of a Nation,* New York, 1963.

Wood, Evelyn, *The Revolt in Hindustan in 1857-59,* London, 1908.

Yajnik, Indo Lal, *Gandhi as I Knew Him,* Delhi, 1943.

Yasin, Muhemmed, *A Social History of Muslim India, 1605-1748,* Allahabad, 1958.

Yengar, S. Srinivas, *Swaraj Constitution,* Madras, 1927.

Young, G.M. ed., *Speeches of Lord Macaulay and His Minute on Indian Education,* Oxford, 1935.

Yusufi, Allah Baksh, *Life of Maulana Muhemmed Ali Jauhar,* Karachi, 1970.

Zekria, Rafiq, *Rise of Muslims in Indian Politics: An Analysis of Developments from 1885 to 1906,* Bombay, 1970.

Zaman, Waheed-uz-, *Towards Pakistan,* Lahore, 1985.

Zeehner, R.C., *Hinduism,* Oxford, 1962.

Ziring, Lawrence, *Pakistan: The Enigma of Political Development,* Kent, 1980.

Articles

Adas, Michael, "Twentieth Century Approaches to the Indian Mutiny of 1857-58", *Journal of Asian History,* Wiesbaden, Vol. 3, No. 1, 1971.

Ali, M. Mohsin, "Impact of East India Company's Rule upon the Muslims of Bengal", *The Dacca University Studies,* Part A, 15 (June, 1967).

Bakshi, S.R., "Simon Commission–A Case Study of His Appointment", *Journal of Indian History,* Trivandrum, Vol. 50, No. 2, 1972.

Choudhry, A.M. Faiz Ahmad, "Linguist Affinity Between Iran and Pakistan", *The Dacca University Studies,* 16 (June, 1968).

Datta, K.K., "Sirajud-Daula and the English Before 1756", *Indian Historical Quarterly,* Vol. XXII, No. 1, March, 1946.

Desai, Ambalal Saharlal, 'Economic Swedeshism–An Analyses, *Modern Review,* 1, 2, February, 1907.

Hamid, Abdul, "Iqbal's Allahabad Address", *Journal of the Punjab University Historical Society,* Vol. XIX, No. 1, January-April, 1966.

___________, "The Allahabad Address: What It Really Meant," *Journal of the Research Society of Pakistan,* Vol. XVI, No. 2, April, 1979.

Hasan, Mushirul, "Communalism in Indian Politics: A Study of the Nehru Report", *Indian Historical Review,* Vol. 4, No. 2, January, 1978.

___________, "All Parties Committee Report and the Nehru Supplementary Report", *Indian Review,* Vol. XXX, No. 9, September 1928, and *ibid.* Vol. XXX, No. 12, December 1928.

Hayat, Sikandar, "Allama Muhammad Iqbal and the Idea of a Separate Muslim State in India", *Pakistan Journal of Social Sciences,* Vol. IX, No. 1 & 2, Jan-July-Dec, 1983.

Hussain, Ahmad, "Political Sasacity of Dr Sir Muhemmed Iqbal", *The Journal of the Political Science,* Vol. VI, No. 1-2, 1983.

Khurshid, Abdul Salam, "Genesis of Iqbal's Concept of Muslim Nationhood", *Journal of Research (Humanities),* Vol. XII & XIII, No. 2 & 1, July 1977 & January, 1978.

Malik, Nadeem Shafiq, "Indianization of the ICS and Muslim Representation in Public Services", *Journal of the Research Society of Pakistan,* Vol. XXXI, No. 2 & 3 (April/July, 1994).

Mohsin, K.M., "East India Company's Relations with the Nawabs of Bengal", *The Dacca University Studies,* 15 (June, 1967).

Navian Prem, "Political Views of Syed Ahmad Khan: Evolution and Impact", *Journal of Indian History,* Vol. LIII, No. 1, April 1975.

Qureshi, M. Naeem, The Ulema of British India and the Hijrat of 1920", *Modern Asian Studies,* Vol. 13, Part 1, February, 1979.

____________, "The Indian Khilafat Movement, 1918-1924", *Journal of Asian History,* Vol. XII, No. 2, Spring 1978.

Sultana, Kishwar, "The Politics of Iqbal 1926-1938", *Pakistan Journal of History & Culture,* Vol. XV, No. 2, Jan-June, 1993.

Unpublished Thesis

Becuer, Mary L., "The All-India Muslim League 1906-1947", Unpublished Ph.D. Thesis, Red Cliffe College, 1957.

Qureshi, M. Naeem, "The Khilafat Movement in India, 1919-1924", Unpublished Ph.D. Thesis, University of London, 1973.

"The Ideology of the Khilafat Movement: Some Observations", Unpublished Research Article, Nehru, Memorial Museum and Library, New Delhi.

Zaidi, Z.H., "The Partition of Bengal and Its Annulment: A Survey of the Schemes of Territorial Redistribution of Bengal, 1902-1911", Unpublished Ph.D. Thesis, University of London, 1964.

اشاریہ

ا

ابراہیم رحمت اللہ .... ۶۷، ۱۶۶
ابراہیم ہارون جعفر .... ۴۸، ۸۶، ۲۳۶
ابوالکلام آزاد .... ۳۰، ۱۰۸
ابوطاہر محمد احمد ۸۵
ابولقاسم فضل الحق ۴۹
اٹلی .... ۲۳، ۲۴، ۱۰۲
احتشام علی .... ۵۱، ۵۳، ۱۶۰
احمد الدین مارہروی.......... ۷۳، ۷۴، ۸۰، ۸۱
احمد شاہ ابدالی ۷
احمد سعید چھتاری.......................... ۴۲
ادب .... ۶، ۹۳، ۱۰۷
اُردو ... ۱۲، ۱۸، ۵۰، ۵۳، ۶۰، ۶۶، ۶۸، ۷۳، ۷۵، ۷۸، ۸۳، ۹۱، ۹۳، ۱۲۸، ۲۳۰
اردن .... ۱۱۶، ۱۲۲، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۴۵
اسد رضا ۵۲
اسلام .. ۲، ۴، ۵، ۱۸، ۴۵، ۸۴، ۹۱، ۹۳، ۹۴، ۹۷، ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۴، ۱۱۲، ۱۱۴، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۴، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۴۸
اظہر علی .... ۵۳، ۶۴، ۶۷، ۸۰
اعجاز علی ۵۰
آفتاب احمد خان ۸۶
افریقہ................................ ۱۱۳، ۱۴۰
افغانستان .... ۲۴، ۳۳
اکبر الٰہ آبادی .... ۷۴، ۹۰
اکبر حیدری .... ۱۱۹، ۱۲۶، ۱۲۸
الٰہ آباد ... ۴، ۴۲، ۴۶، ۵۸، ۵۹، ۷۲، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۷۷، ۷۸، ۷۹، ۸۰، ۸۶، ۸۷، ۹۰، ۹۱، ۹۲
امرتسر ۲۹
امیر حسن خان.......................... ۷۶، ۸۴
انبالہ ۱۱۲
انجیل .... ۹۴، ۹۵
انگریزی ۱، ۹، ۱۳، ۱۴، ۱۶، ۲۰، ۳۲، ۵۰، ۵۳، ۶۰، ۶۶، ۷۵، ۷۹، ۸۱، ۸۳، ۱۳۰، ۱۷۵، ۲۳۰
انگلستان ... ۱۵، ۱۷، ۲۴، ۳۰، ۶۷، ۶۹، ۱۱۷، ۱۲۲، ۱۲۴، ۱۲۸، ۱۳۵، ۱۳۸، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۶۶، ۱۷۲
اورنگزیب عالم گیر ۶
اے خان ۸۵
اے۔آر بخاری ۸۵
ایران .... ۲۴، ۲۵، ۹۷، ۱۳۹، ۱۴۴
ایس ایم عبداللہ ۴۶
ایشیا .... ۲۴، ۶۹، ۱۰۲، ۱۰۶، ۱۱۲، ۱۴۰، ۱۴۷
ایم اے او .... ۱۳، ۲۵، ۱۲۷
ایم یو ایس جنگ .... ۸۰، ۸۶، ۸۷، ۲۳۷

آ

آغا خان .... ۲۱، ۴۲، ۱۱۰، ۱۱۹
آنند بھون ۷۳

ب

باب الاسلام .... ۴، ۱۰۹
بابا خلیل احمد ۷۰
بدایوں ۸۰
برصغیر... ۱، ۴، ۵، ۱۰، ۱۳، ۱۹، ۳۵، ۴۵، ۸۲، ۱۰۹،
۱۱۰، ۱۲۲، ۱۳۹
برطانوی اقتدار .... ۹، ۱۰، ۱۶، ۱۱۸، ۱۲۳
برطانیہ ۲۳، ۲۴، ۲۶، ۴۱، ۶۱، ۹۶، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۸، ۱۱۹،
۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۳۰، ۱۳۱،
۱۳۲، ۱۴۵
برکت اللہ ۸۰
برکن ہیڈ ۳۸
برما .... ۵۰، ۵۹
برہمن .... ۱۸، ۱۰۷، ۱۱۱
بشیر احمد .... ۵۲، ۹۱
بغداد .... ۵، ۱۳۹
بلقان ۲۴
بلوچستان ۳۷، ۸۵، ۸۹، ۹۷، ۱۰۳، ۱۱۱، ۱۱۳، ۱۳۶،
۱۳۸، ۲۳۸
بمبئی ۳۷، ۴۱، ۴۸، ۵۳، ۶۰، ۶۶، ۷۴، ۸۵، ۱۰۷،
۱۰۹، ۱۱۱، ۱۲۸، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۸، ۱۴۰، ۱۶۶
بنارس ۱۸، ۴۶، ۶۹، ۷۰، ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۷۵، ۱۰۵
بنگال ... ۷، ۸، ۹، ۱۹، ۲۳، ۳۷، ۴۰، ۴۹، ۶۰، ۶۱،
۸۹، ۱۰۳، ۱۰۸، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸،
۲۳۸
بہار ۸۰، ۱۳۶
بھوپال .... ۱۱۹، ۱۲۶، ۱۲۷
بی۔آر۔امبیدکر ۴۰

پ

پٹ دی ینگر ۱۲۴
پریاگ ۷۳
پشاور .... ۸۵، ۱۴۱
پنجاب ۵، ۷، ۸، ۳۶، ۳۷، ۴۰، ۵۵، ۵۶، ۶۰، ۶۱،
۶۳، ۶۵، ۶۶، ۶۸، ۷۶، ۷۷، ۸۹، ۱۰۸، ۱۱۱،
۱۱۳، ۱۱۷، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۴۱، ۱۴۵،
۱۵۲، ۱۵۸، ۱۶۴، ۱۶۸، ۲۳۸
پونہ .... ۴۸، ۵۲

ت

ترکی ۲۶، ۲۹، ۳۰، ۳۳، ۳۴، ۱۴۴
تعلیم .. ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۶، ۱۷، ۲۰، ۲۵، ۶۱، ۸۰، ۸۲،
۹۵، ۹۶، ۱۰۲، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۱۴، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۷،
۱۲۸، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۷، ۱۴۵
تعمیرات .... ۶، ۳۶
تغلق ۵
تلک ۸۵

ٹ

ٹائمز آف انڈیا ۱۱۴

ٹوری پارٹی............................۱۲۳، ۱۲۴

ث

ثقافت ...... ۴، ۶، ۹۳، ۹۴، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۱۴، ۱۴۵

ج

جارج سوم ۱۲۴

جالب............................ ۸۶، ۲۳۶

جلیانوالہ ۲۹

جمنا ۷۳

جنگ پلاسی ۷

جنگ عظیم ۲۶، ۲۸، ۲۹، ۳۱، ۱۲۱، ۱۲۴، ۱۳۰، ۱۳۱،

۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۵

جہانگیر عالم.............................. ۹۱، ۹۲

جے پور.................................. ۸۴

چ

چودھری مجید ۸۵

ح

حبیب الرحمٰن خان شیروانی ۵۲

حبیب شاہ......................۸۵، ۸۶، ۸۸، ۸۹

حسرت موہانی..............................۳۰

حسین امام.......................۸۰، ۸۹، ۲۳۸

حفیظ الرحمان ۸۰

حکیم محمد شریف........................... ۵۲

حیدر آباد .... ۸۰، ۱۱۹، ۱۲۶، ۱۲۸

خ

خلافت .. ۴، ۵، ۲۴، ۲۶، ۲۹، ۳۰، ۳۱، ۳۲، ۳۳،

۳۴، ۳۵، ۴۵، ۵۳، ۶۹، ۹۷، ۱۰۷، ۱۳۹، ۱۴۰

خلجی ۵

خلیفہ شجاع الدین ....۵۶، ۱۵۶، ۱۶۴

خلیق الزمان................................۸۳

خلیل قاضی............................... ۵۲

د

دکن................................۶، ۱۰۳، ۱۰۴

دمشق ....۵، ۱۳۹

دہلی ۵، ۶، ۷، ۱۰، ۱۵، ۳۷، ۳۸، ۴۰، ۴۵، ۴۷،

۵۳، ۵۵، ۶۸، ۷۰، ۷۶، ۸۶، ۸۷، ۱۰۷،

۱۰۸، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۴۵، ۱۵۲، ۱۶۸، ۲۳۶

دوازدہ منزل ....۷۳، ۷۸، ۷۹

دین الٰہی .... ۱۰۳، ۱۰۴

دیوناگری ۱۸

ڈ

ڈھاکہ ۲۱

ذ

ذاکر علی .... ۸۰،۲۳۹

ر

رابرٹ کلایو........................۹

رائٹر................................ ۱۲۵،۱۲۶

رحم علی الہاشمی .... ۷۴،۸۰

رحیم بخش.................... ۲،۷۸،۸۰،۹۱

روزنامہ انقلاب .۵۰، ۵۳، ۵۴، ۶۰، ۶۱، ۶۴، ۶۵،
۷۰، ۷۳، ۹۱

روزنامہ سیاست ۶۸

روس .... ۲۴،۳۳

روسو..........................۹۶، ۱۱۴

رولٹ ایکٹ .... ۲۸،۱۲۹

ریاض اِلہٰ آبادی ۹۰

ریڈنان ....۱۰۲،۱۰۵

ز

زمن ....۷۳، ۷۸، ۷۹، ۸۰، ۸۳، ۹۰، ۹۲

ژ

ژاں ژاک روسو..............................۹۶

س

سائنس...۳۸، ۳۹، ۴۵، ۴۸، ۴۹، ۵۱، ۸۸، ۱۰۷،
۱۰۸، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۲۱، ۱۳۴، ۱۳۷،
۱۳۸، ۱۴۱، ۱۴۲

سرسید .... ۱۲، ۱۵، ۱۶، ۱۸، ۲۵

سر محمد اقبال ۱، ۲، ۴۲، ۴۸، ۴۹، ۵۰، ۵۲، ۵۳،
۵۵، ۵۶، ۵۸، ۵۹، ۶۰، ۶۲، ۶۴، ۶۵، ۶۶،
۶۷، ۶۸، ۶۹، ۷۰، ۷۲، ۷۳، ۷۶، ۷۷، ۷۸،
۷۹، ۸۱، ۸۲، ۸۳، ۸۴، ۸۶، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۲،
۹۵، ۹۶، ۹۸، ۹۹، ۱۰۲، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۸، ۱۰۹،
۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۶، ۱۱۸، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۴،
۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۱، ۱۳۳، ۱۳۶،
۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۵، ۱۴۸، ۱۵۱،
۱۵۲، ۱۵۴، ۱۵۶، ۱۵۸، ۱۶۰، ۱۶۲، ۱۶۴، ۱۶۶،
۱۶۸، ۱۷۰، ۱۷۲، ۲۳۶

سرسوتی.................................. ۷۳

سکھ ....۷، ۱۰۷، ۱۱۱، ۱۳۷

سلطان محمود غزنوی ۵

سندھ ۴، ۸، ۳۷، ۸۰، ۸۵، ۸۹، ۱۰۳، ۱۰۸، ۱۰۹،
۱۱۱، ۱۱۹، ۱۲۸، ۱۳۶، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۰، ۲۳۸

سنسکرت.................................۱۸

سنگھٹن ۳۶

سوراج بھون ۷۳

سوری ....۵، ۷۸، ۱۰۳

سول نافرمانی .... ۳۲، ۷۰، ۱۳۸

سید ۴، ۵، ۱۲، ۱۵، ۱۹، ۲۴، ۲۹، ۳، ۴۶، ۴۷، ۴، ۵۲، ۵۵، ۶۲، ۶۳، ۶۵، ۷۰، ۷۲، ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۸۰، ۸۱، ۸۶، ۸۸، ۸۹، ۹۱، ۱۶۲، ۱۶۴، ۱۶۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹

سید شمس الحسن ۴۶، ۴۷، ۴۹، ۵۱، ۵۳، ۵۴، ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۵۹، ۶۰، ۶۱، ۶۲، ۶۳، ۶۴، ۶۵، ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۷۰، ۷۱، ۷۴، ۷۵، ۱۵۴، ۱۶۰، ۱۶۲، ۱۶۴، ۱۶۶، ۱۶۸، ۱۷۰

سید مرتضیٰ ۶۳

سیف الدین کچلو .... ۴۶، ۴۷

سیلف گورنمنٹ .... ۱۸، ۶۱

سیورے ۳۰

ش

شاستری .... ۱۱۳، ۱۱۹، ۱۲۱

شاہنواز ۴۲

شدھی .... ۳۵، ۳۶

شفاعت احمد خان .... ۵۸، ۵۹، ۷۴

شمس الدین التمش ۵

شملہ ۲۱

شوکت علی .... ۲۶، ۳۰

ص

صوبہ سرحد ... ۳۷، ۵۱، ۸۵، ۸۸، ۱۰۸، ۱۱۹، ۱۴۱، ۱۴۲، ۲۳۷، ۲۳۸

ط

طرابلس .... ۲۳، ۲۴، ۸۴، ۱۳۹

طفیل احمد .... ۱۵، ۵۲، ۷۱، ۸۵

طیب علی ۸۰

ظ

ظفر علی خان ۳۰

ظہور احمد .... ۸۰، ۹۰، ۲۳۷، ۲۳۹

ع

عبدالحلیم عبدالحسین غزنوی ۴۹

عبدالحیٔ .... ۷۹، ۸۰، ۹۰

عبدالخیر ۸۰

عبدالصمد ۸۰

عبدالغنی ۵۲

عبدالقادر قصوری .... ۸۰، ۱۰۸

عبدالقیوم ۴۹

عبدالکافی ۸۰

عبداللہ ہارون .... ۷۶، ۷۷، ۸۰، ۸۷

عبدالماجد بدایونی ۸۰

عبدالمجید سالک ۵۰

عبدالمجید سندھی ۸۰

عرب .... ۴، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۰

عربی .... ۱۲، ۱۸، ۹۹، ۱۱۴

عزیز الدین احمد قاضی ۵۲

علاؤ الدین ۸۰
علی گڑھ . ۱۲، ۱۳، ۲۵، ۴۷، ۵۳، ۱۲۷، ۱۴۵، ۱۴۶
علی محمد خان ۸۶
عیسائی .... ۱۳، ۲۴، ۹۵، ۹۹، ۱۴۴
عیسیٰ .... ۹۶، ۹۷، ۹۹

غ

غازی پور ۸۰
غزنی ۵
غضنفر اللہ ۷۴
غلام رسول مہر .... ۱۰، ۱۱، ۵۰، ۶۱، ۹۱
غیاث الدین بلبن ۵

ف

فارسی .... ۹، ۱۰، ۱۲، ۱۸، ۹۰، ۹۷
فتح پور .... ۱۸، ۷۶، ۸۴
فخر الاسلام .... ۷۹، ۸۳، ۹۰
فرانس .... ۸۴، ۹۶، ۱۰۲، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۳۷
فرخ آباد ۳۳
فرودی ہند ۷۶
فریڈرک چمسفورڈ ۲۹
فضل الٰہی ۵۲
فنون لطیفہ ۶

ق

قانون حکومت ہند ۲۸
قرآن .... ۱۰۶، ۱۴۴، ۱۴۸
قصاب برادری ۷۷
قطب الدین ایبک ۵
قنوج ۵

ک

کالا ڈنڈا ۹۰
کالنجر ۵
کانپور .... ۱۰، ۲۵، ۸۰
کانگریس ۱۴، ۱۵، ۱۶، ۲۰، ۲۷، ۳۰، ۳۱، ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۴۲، ۵۵، ۵۶، ۵۷، ۷۰، ۷۳، ۹۰، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۱۱، ۱۱۵، ۱۱۹، ۱۲۲، ۱۲۴، ۱۲۹، ۱۳۲، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۸
کبیر .... ۸۱، ۱۰۵
کراچی ۱۹، ۳۲، ۴۵، ۴۷، ۴۸، ۵۹، ۷۶، ۸۰، ۸۳، ۸۴، ۹۱، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۴۰
کلکتہ .... ۳۰، ۴۵، ۴۸، ۵۳، ۷۹، ۱۰۸، ۱۲۹، ۱۳۵
کمبھ ۷۳ ....
کوہاٹ .... ۳۶، ۱۴۱
کے۔ایم اسلم ۸۵

گ

گاندھی.. ۳۰، ۳۱، ۳۳، ۳۴، ۳۹، ۴۲، ۷۴، ۱۲۰، ۱۲۲، ۱۲۹، ۱۳۵، ۱۳۸
گجرات .... ۵، ۱۰۳
گنگا ۵۳ .... ، ۷۳

گنگا پرشاد میموریل ہال ۵۳

گول میز کانفرنس ۴۱، ۴۲، ۵۱، ۵۵، ۵۶، ۶۶، ۶۷،
۶۸، ۶۹، ۷۴، ۸۱، ۸۴، ۸۶، ۸۷، ۱۰۸، ۱۱۹،
۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹،
۱۴۳، ۲۳۶

ل

لکھنؤ ۱، ۲۶، ۲۷، ۴۰، ۴۶، ۴۹، ۵۰، ۵۱، ۵۲، ۵۳،
۵۴، ۵۵، ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۵۹، ۶۰، ۶۱، ۶۲،
۶۳، ۶۴، ۶۵، ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۷۵، ۸۰،
۱۰۷، ۱۰۸، ۱۱۲، ۱۲۹، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۵۲، ۱۵۶،
۱۶۰، ۱۶۸، ۱۷۲

لندن ۲۵، ۴۱، ۵۶، ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۷۴، ۷۵،
۸۷، ۱۱۹، ۱۲۴، ۱۲۹، ۱۳۲، ۱۳۶، ۱۴۳، ۱۵۴

لوتھر .... ۹۴، ۹۵، ۹۶، ۹۹

لودھی ۵

لیبر پارٹی .... ۴۱، ۱۱۹، ۱۲۲، ۱۲۴، ۱۲۵

لیڈن ۹۹

م

مالدہ ۵۲

محتاط و متوازن سکیم ۱۳۷

محسن الملک ۱۸

محمد اسمٰعیل خان .... ۸۰، ۸۹، ۲۳۹

محمد ایوب ۶۰

محمد بن قاسم ۴

محمد حسین ۵۲، ۷۲، ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۸۰، ۸۱، ۸۸

محمد شوکت علی ۵۲

محمد عظیم .... ۸۰، ۲۳۸

محمد علی جناح ۳۷، ۳۸، ۴۰، ۴۱، ۴۲، ۴۶، ۴۷،
۴۸، ۴۹، ۵۰، ۵۳، ۵۸، ۵۹، ۶۲، ۶۳، ۶۴،
۶۵، ۶۶، ۶۷، ۸۷، ۱۰۸، ۱۱۵، ۱۱۹، ۱۲۶، ۱۲۸،
۱۲۹، ۱۳۵، ۱۷۲

محمد علی جوہر ۲۴، ۲۶، ۲۹، ۳۰، ۳۲، ۱۰۸، ۱۱۹، ۱۲۲

محمد وسیم بیرسٹر .... ۵۶، ۱۵۶

مختار احمد انصاری .... ۲۴، ۲۹

مدراس .... ۵۰، ۱۰۷، ۱۱۳، ۱۲۸، ۱۳۶

مراد آباد .... ۴۷، ۶۷، ۶۹، ۷۴، ۸۰

مسعود حسین .... ۸۹، ۲۳۹

مسعودی .... ۴، ۱۳۹

مسلم ایجوکیشنل کانفرنس .... ۲۱، ۶۹، ۷۰، ۷۲

مسلم لیگ ۱، ۲، ۲۱، ۲۲، ۲۶، ۲۷، ۳۸، ۴۵، ۴۶،
۴۷، ۴۸، ۴۹، ۵۰، ۵۱، ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۵،
۵۶، ۵۷، ۵۸، ۵۹، ۶۰، ۶۱، ۶۲، ۶۳، ۶۴،
۶۵، ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۷۰، ۷۱، ۷۲، ۷۳،
۷۴، ۷۶، ۷۷، ۷۸، ۷۹، ۸۰، ۸۳، ۸۴،
۸۵، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۳، ۱۰۰، ۱۰۸،
۱۱۵، ۱۲۹، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۵۱، ۱۵۶، ۱۷۲،
۲۳۰، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹

مشنری ۱۳

مصر .... ۶۳، ۱۳۹، ۱۴۰

مظفر حسین .... ۵۵، ۸۵

مظہر الحق .... ۸۶، ۲۳۶

مغل........................ ۶، ۷، ۸، ۸۱، ۱۰۳، ۱۰۴

مغلیہ دور ۶

ملتان .... ۴، ۳۶، ۱۳۹

ملک فیروز خان نون ۵۰، ۵۵، ۵۷، ۵۸، ۵۹، ۶۱، ۶۲، ۶۳، ۶۵، ۶۸

منٹو ....۲۱، ۲۲، ۲۳، ۱۳۰

منڈی بہاؤالدین........................ ۹۱

مولوی محمد یعقوب .. ۴۷، ۴۸، ۴۹، ۵۰، ۵۱، ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۵، ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۶۰، ۶۱، ۶۲، ۶۳، ۶۴، ۶۵، ۶۷، ۶۹، ۷۰، ۷۱، ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۷۷، ۸۰، ۸۳، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۱۵۲، ۱۵۴، ۱۵۶، ۱۵۸، ۱۷۲، ۲۳۷، ۲۳۹

میاں فضل حسین .... ۳۶، ۳۷

میاں محمد شفیع........................۳۸، ۴۲

میرٹھ ....۸۰، ۲۳۹

میسور........................۷، ۱۱۹، ۱۳۹

میکالے ۱۳

میکڈونلڈ .... ۴۱، ۸۴، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۴

میلکم ہیلی ۱۴۵

ن

نادر شاہ........................ ۷

نذیر حسین ۸۰

نذیر نیازی .... ۶۵، ۷۰، ۷۲، ۹۱

نقوش .... ۶، ۷۳، ۹۲

نہرو .. ۳۹، ۴۰، ۴۱، ۷۳، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۶، ۱۱۸، ۱۳۰، ۱۳۴

نیپال ۱۱۳

ہ

ہالینڈ ۹۹

ہرش ۷۳

ہندو . ۴، ۵، ۱۴، ۱۶، ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۸، ۲۹، ۳۱، ۳۲، ۳۵، ۳۶، ۳۷، ۳۸، ۴۰، ۴۱، ۴۲، ۶۰، ۶۹، ۷۳، ۸۰، ۸۱، ۸۴، ۸۵، ۹۰، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۳، ۱۲۵، ۱۲۷، ۱۲۹، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۷، ۱۴۴

ہندوستان ۴، ۵، ۶، ۷، ۸، ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۲، ۲۶، ۲۹، ۳۰، ۳۳، ۳۷، ۴۱، ۴۲، ۴۵، ۵۳، ۵۷، ۵۹، ۶۱، ۶۳، ۶۶، ۶۹، ۷۳، ۸۱، ۸۵، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۳، ۹۴، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۵۲، ۲۳۸

و

ولیم پینٹنگ ۹

وی۔ ڈی۔ ساورکر ۳۵

وینسنک ۹۹

ی

یو پی .. ۳۳، ۴۸، ۵۸، ۶۰، ۷۹، ۱۳۳، ۱۳۶، ۱۴۵

یورپ .. ۲۴، ۲۹، ۳۰، ۹۴، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۹۸، ۱۰۱، ۱۱۰، ۱۴۴

یوسف .... ۵۷، ۵۸، ۵۹، ۷۷، ۷۸، ۷۹، ۹۱

یونینسٹ پارٹی ۳۶

وینسنک ۹۹

ی

یوپی .. ۳۳، ۴۸، ۵۸، ۶۰، ۷۹، ۱۳۳، ۱۳۶، ۱۴۵
یورپ .. ۲۴، ۲۹، ۳۰، ۹۴، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۹۸، ۱۰۱، ۱۱۰، ۱۴۴
یوسف......... ۵۷، ۵۸، ۵۹، ۷۷، ۷۸، ۷۹، ۹۱
یونینسٹ پارٹی ۳۶